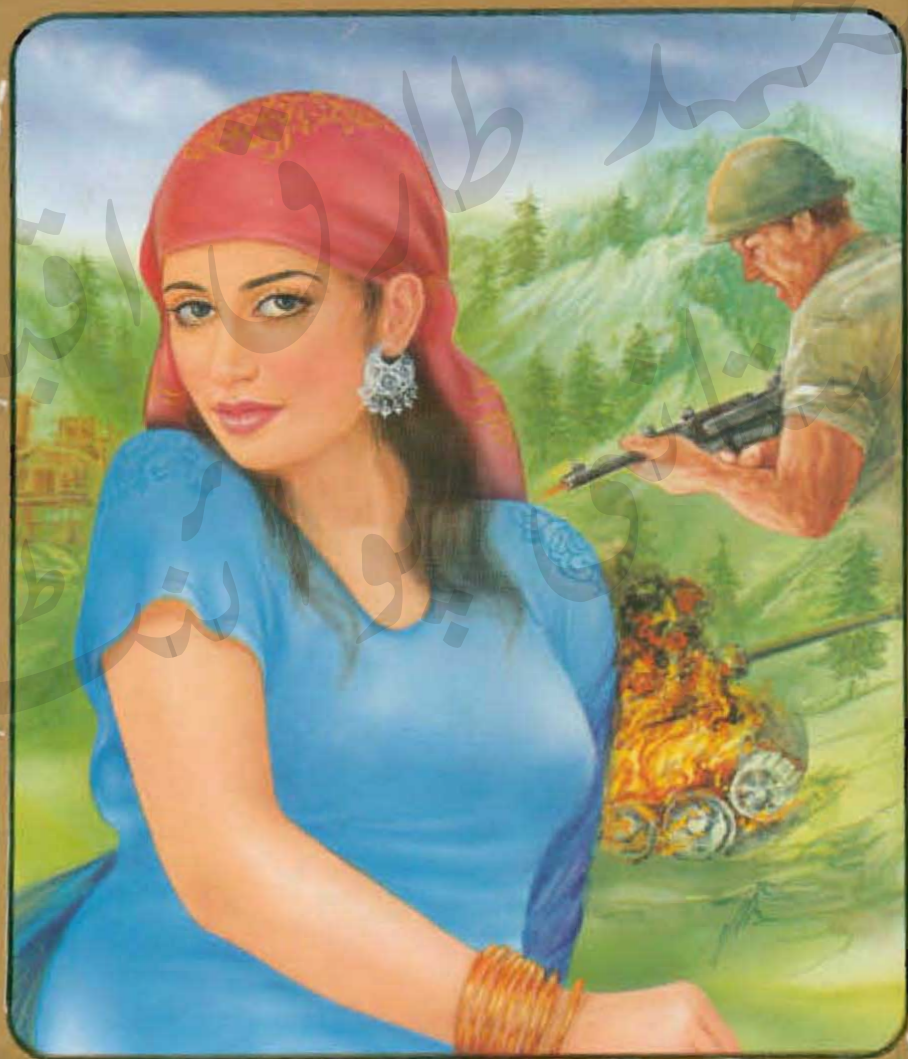


سرسنگری کے شیر دل کمانڈر



اے حمید



سرمخبر کے شیر دل کمانڈر

ایہ حمید



راولپنڈی ہاؤس
الکریم مارکیٹ لاہور
اردو بازار

مخلص، محب وطن اور فرض شناس پولیس آفیسر
ڈی ایس پی اصغر سعید پال مانڈو کے نام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
ناشر: ————— نوید اے شیخ

ادارہ: ————— رابعہ بک ہاؤس، لاہور

طابع: ————— ندیم یونس پرنٹرز لاہور

کیوزنگ: ————— عاصم کیوزر 215843

قیمت 225 روپے



گورکھا فوجی دروازہ توڑ کر بیٹھک میں داخل ہو گئے۔

انہوں نے اندر آتے ہی ہمیں قہقہہ کر لیا اور کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ چٹائی کے نیچے ہمارے دونوں آٹومٹک پستول اور کمانڈو چاقو برآمد ہو گئے۔ ہمارے کمانڈو ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ گورکھا فوجی ہمیں لائیں اور گھونے مارتے باہر لے آئے اور فوجی ٹرک میں ڈال کر ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ فوجی دستے کا کمانڈر ہاتھ میں پستول لیے چیخ چیخ کر آؤر دے رہا تھا۔ ٹرک میں جو فوجی ہمیں دبوچ کر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے ہمارے سر نیچے دبا دیے ہوئے تھے۔ میں، کمانڈو خالد اور شیر خان اس وقت ایسی حالت میں تھے کہ سوائے مار کھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ٹرک کو کسی نامعلوم فوجی کیپ کی طرف چل پڑا۔ خدا جانے کسی نے مجھری کر دی تھی یا فوج کو کسی وجہ سے شک پڑ گیا تھا کہ کمانڈو اسی مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ بہر حال ہم پر مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ ہم پھنس گئے تھے اور خدا کی ذات ہی ہمیں اس مشکل سے نکل سکتی تھی۔ ٹرک دوار کا کی نیم پہاڑی اونچی نیچی سڑکوں پر اچھلتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔ ہمارے سر نیچے تھے ہمیں سر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

فوجی ٹرک ایک طرف گھوما اور پھر آہستہ ہوتے ہوئے رک گیا۔ ہم تینوں کو یعنی مجھے، کمانڈو خالد اور شیر خان کو گورکھا فوجیوں نے گھسیٹ کر ٹرک سے باہر نکالا۔ میں نے نظر بچا کر دیکھا یہ کوئی فوجی کیپ نہیں لگتا تھا۔ ایک دو منزلہ پرانی عمارت تھی جس

کی دیواریں بارشوں کی وجہ سے کلی ہو رہی تھیں۔ کپڑوں کی ڈھلوان چھت پر صرف ایک ڈنڈا لگا تھا۔ کوئی جھنڈا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ چار گورکھے ہمیں گھسیٹتے ہوئے عمارت کی دوسری منزل میں لے آئے۔ لمبی راہ داری تھی جس میں ساتھ ساتھ کوٹھڑیوں کے دروازے تھے۔ گورکھے ایک ایک کوٹھڑی کھول کر ہم میں سے ایک کو اندر دھکیلتے جاتے تھے۔ ایک گورکھا کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا دیتا تھا۔ مجھے بھی ایک کوٹھڑی میں زور سے دھکا دیا گیا۔ میں فرش پر گر پڑا۔ میری کوٹھڑی کے باہر بھی تالا لگا دیا گیا۔ میں اٹھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے بندھے تھے۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کل کوٹھڑی لگتی تھی۔ فرش کی اینٹیں اکٹری ہوئی تھیں۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک روشندان تھا جس میں سے ابر آلود دن کی پھمکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش مجھ پر دورہ پڑ جائے اور انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر کے روشندان میں سے باہر نکل جاؤں۔

میں روشندان کو غور سے دیکھنے لگا۔

عجیب بات تھی۔ روشندان کا آواہ شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کی سلاخیں نہیں لگی تھیں۔ میری ساتھ والی کوٹھڑی میں کمانڈو خالد تھا۔ اسے میں نے کوٹھڑی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلی کوٹھڑی میں شیر خان بند تھا۔ روشندان نے میری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔ یہ مستطیل روشندان تھا۔ روشندان کا لکڑی کا چوکھا ایک طرف سے جھکا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اتنی ضرور تھی کہ ایک آدمی اس میں سے نکل سکتا تھا لیکن روشندان فرش سے دس گیارہ فٹ بلند تھا اور اس تک پہنچنے کا وہاں کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میرا یہاں کیا حشر ہونے والا تھا بلکہ ہم تینوں کا کیا حشر ہونے والا تھا اور ہمارے ساتھ جو وحیانہ سلوک ہونے والا تھا اس کا مجھے پورا احساس تھا۔ پستول اور چاقو فوج نے برآمد کر لیے تھے۔ ہم لاکھ اپنی بے گناہی کے بیان دیتے کسی نے ان پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ باہر فوجی بوٹوں کی ٹھک ٹھک

سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک فوجی افسر دو گورکھا سپاہیوں کے ہمراہ اندر آیا اور میرے سر پر کھڑا ہو کر انگریزی میں اس نے مجھے گلی دی۔ پھر زور سے مجھے ٹھڈ مارا اور کہا۔
”تمہارے باقی ساتھی دوار کا میں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟“
میں نے کہا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں کاشیاواڑ میں پرانی کتابوں کا دھندا کرتا ہوں۔ دوار کا میں اپنے واقف بھائی بند کے ہاں کاروباری سلسلے میں آیا ہوا تھا۔“
”کیا تم ہندو ہو؟“

میرا مسلمان ہونا ایک سیکنڈ میں ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہہ دیا۔
”ہاں میں مسلمان ہوں مگر میں بھارتی شہری ہوں۔ آپ لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔“

یہ بھارتی فوجی افسر کیپٹن ریک کا تھا۔ اس کے کندھے پر تین تین پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ انڈین آرمی کی کمانڈو فورس کی وردی میں تھا۔ ان لوگوں سے میرا زندہ بچ نکلنا ناممکن لگتا تھا۔ اب مجھے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا تھا۔ بھارتی کیپٹن نے مجھے ایک اور ٹھڈا مارا اور گلی دے کر پوچھا۔

”پاکستان سے تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ آئے تھے؟“

میں نے کہا۔

”جناب! میں بے گناہ ہوں۔ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں بھارتی ناگرک ہوں۔“
فوجی کیپٹن نے گورکھوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے برین گنوں کے بوز سے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ میں کہاں تک برداشت کرتا۔ درد کی شدت سے بلبلا اٹھا اور مجھ پر جب غش کی حالت طاری ہونے لگی تو فوجی کیپٹن بچوں کے بل میرے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور میرے سر کے بالوں کو پکڑ کر میرے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ گالیاں دیں اور کہا۔

”دیکھو۔ ہمیں تم لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی

معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ چار اور پاکستانی دہشت گرد تھے۔ اگر تم ہمیں ان کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

میں نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ مجھے کچھ معلوم نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔ ان گورکھوں نے مجھے اس قدر زد و کوب کیا کہ واقعی میں نیم بے ہوش ہو کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ بھارتی کیپٹن اپنے سپاہیوں کے ساتھ کوٹھڑی سے چلا گیا۔ مجھے کوٹھڑی کے دروازے پر باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ درد کی شدت سے میرا پورا جسم اس طرح دکھ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے روٹی کی طرح دھنک ڈالا ہو۔ میں اسی طرح فرش پر ایک طرف کو پڑا رہا۔ میرے ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ نہ جانے میں کب تک نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔

جب ذرا ہوش آیا اور بدن کا درد ذرا کم ہونے لگا تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میری نظریں سیدھی روشندان پر پڑیں۔ میری نجلت کا صرف یہی ایک ذریعہ نظر آ رہا تھا مگر میرے اور روشندان کے درمیان ناممکنات کی ایک گہری خلیج حائل تھی۔ میری پسلیاں سخت درد کر رہی تھیں اور ان میں سے ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ ایک بار اتنی شدید ٹیس اٹھی کہ میرے منہ سے بے اختیار یا اللہ نکل گیا اور میں نے اپنے گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگا دیے۔ شدید درد کی دوسری ٹیس اٹھی تو میں واقعی بے ہوش ہو گیا۔ مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ان گورکھے فوجیوں نے مجھے بڑی بے دردی سے مٹا تھا۔ یہ ابھی ابتدا تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کے قصائی آگے چل کر میرا کیا حال کرنے والے ہیں۔ میں بڑی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھے روشندان دکھائی نہ دیا۔ کوٹھڑی میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور روشندان میں بھی اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر رات پڑ چکی تھی۔ میری پسلیاں اب اتنی درد نہیں کر رہی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے باہر کی طرف کان لگا دیے۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دیواریں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سامنے والی دیوار کے اوپر روشندان کے چوکھٹے کی پھیکی سی روشنی ابھرتی

نظر آئی۔ میں ٹکلی باندھے روشندان کو دیکھ رہا تھا۔

باہر فوجی بوٹوں کی آواز گونجی۔ پھر دروازہ کھلا۔ کسی نے دیوار پر گئے، من کو دیا دیا۔ کوٹھڑی میں بلب کی روشنی پھیل گئی۔ دو گورکھے فوجی نظر آئے۔ ایک برین گن لیے دروازے میں ہی کھڑا ہو گیا۔ دوسرے فوجی نے آگے بڑھ کر میرے آگے ایک مگ رکھا اور میرے ہاتھوں کی رسیاں کھول دیں۔ اس کے بعد دونوں چلے گئے۔ ہاتھوں کی رسیاں کھل جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے مگ کو اٹھا کر دیکھا۔ پتلے سرخ رنگ کے شوربے میں روٹی بھگوئی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لقمہ منہ میں ڈالا۔ روٹی جلی ہوئی تھی۔ شوربہ بھی پھیکا تھا۔ مگر اس وقت مجھے بھوک لگی ہوئی تھی، میں سب کچھ کھا گیا۔ کھانے سے میرے اندر تھوڑی طاقت آ گئی۔ میں روشندان سے فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ہمیں کمانڈو ٹریننگ کے دوران اس قسم کے حالات میں پھنس جانے کے بعد کئی ترکیبوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔ ان میں ایک طریقہ ہمارا انسٹرکٹر بتایا کرتا تھا کہ اگر تم دشمن کی قید میں پھنس جاؤ اور دشمن تمہیں ایسی جیل میں قید کر دے جس میں ایک ہی روشندان ہو اور باقی کچھ نہ ہو تو تمہیں یہ کرنا چاہیے، ایسا کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت ساری ترکیبیں مجھے بے کار لگ رہی تھیں۔

ایک بڑی غنیمت تھی کہ میرے ہاتھ کھل گئے تھے۔ ساری رات گزر گئی۔ دوسرا دن آ گیا۔ وہی بھارتی کیپٹن دوبارہ کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے مجھ سے سرسری سی پوچھ گچھ کی۔ میں نے اپنی بے گناہی کا بیان دہرایا۔ بھارتی کیپٹن نے مجھے گالیاں دیں۔ گھونے اور ٹھڈے مارے اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان لوگوں نے اصل میں مجھے کسی اور ٹارچر سیل میں لے جانا ہے جہاں مجھ پر اصل تشدد شروع ہوگا اور جہاں فوجی انٹیلی جنس کے بڑے بڑے بے رحم قصاب بھی موجود ہوں گے۔ کسی وجہ سے مجھے ابھی اس پرانی عمارت میں ٹرانزٹ کی پوزیشن میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس سلسلے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور میرا ذہن بڑی تیزی سے وہاں

سکتا تھا۔ دوسری طرف کیپ کا احاطہ بھی ہو سکتا تھا، جہاں رات کو گور کھا سپاہی پہرے پر موجود ہوں اور دوسری طرف کوئی دیرانہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا اور صرف روشندان تک پہنچ کر چوکھٹے کو اکھاڑنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ دوسری طرف چاہے موت منہ کھولے کیوں نہ بیٹھی ہو۔ مجھے ہر حالت میں دوسری طرف چھلانگ لگنی تھی۔ لیکن اس کے لیے روشندان تک پہنچنا اور پھر بغیر آواز پیدا کیے اس کے چوکھٹے کو اکھاڑ کر دوسری طرف گرانا شرط اول تھی۔ میں باہر رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا، کیونکہ یہ سارا کام رات کے وقت ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے گزشتہ رات کو جب میری کوٹھڑی میں بلب روشن نہیں تھا، یہ دیکھ لیا تھا کہ روشندان کی دوسری طرف سے کسی جلتے ہوئے بلب وغیرہ کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ اگر دیوار کی دوسری جانب قریب قریب کوئی بلب رات کو روشن ہوتا تو روشندان میں سے اس کی روشنی ضرور نظر آ جاتی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دیوار کی دوسری جانب رات کو اندھیرا ہوتا ہے اور وہاں دیوار کے ساتھ کوئی بلب نہیں جلتا۔

رات ہو گئی۔ کل والے دونوں گور کھا سپاہی میرے لیے پتلے بد ذائقہ شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی والا مک لے کر آئے اور میرے آگے اس طرح رکھا جس طرح کتے کے آگے اس کا رات رکھا جاتا ہے۔ دونوں نے گور کھائی زبان میں آپس میں کوئی بات کی پھر ایک گور کھے سپاہی نے میری گردن پر گن کی تلی لگا کر کہا۔
”کھالے راشن آج کا دن۔ کل تیرا آپریشن ہو گا سالے۔“

دونوں خستے ہوئے کوٹھڑی سے نکل گئے۔ میں سمجھ گیا کہ کل یہ لوگ مجھے یہاں سے کسی فوجی یونٹ کے اصلی ٹارچر سیل میں لے جانے والے ہیں۔ اس کوٹھڑی کے اندھیرے میں مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دے چکی تھی۔ میں فرار کی ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ میں فوجی کیپ کے کسی ٹارچر سیل سے فرار ہو سکوں گا۔ میں نے پتلے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کھائی اور گھٹنے

سے فرار کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا تھا۔ کوٹھڑی کا بلب دن کے وقت بھی جلتا رہتا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ نہیں تھی۔ میں بڑے غور سے روشندان والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک جگہ سے دیوار کچھ ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میں آہستہ سے چل کر دیوار کے قریب آ گیا۔ دیوار میں ایک جگہ سے اینٹ کا کونا ذرا سا باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

کوٹھڑی چونکہ باقاعدہ کسی جیل کی کوٹھڑی نہیں تھی، اس لیے اس میں قیدی کو دیکھتے رہنے کے لیے سلاخ دار چوکھٹا نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ نہ میں باہر پہرہ دیتے گورکھے کو نظر آتا تھا، نہ میں ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اینٹ کے کونے کو ذرا ہلایا۔ اینٹ اپنی جگہ پر قائم رہی۔ میں نے ذرا زور سے ایک طرف دبلیا تو اس میں سے سینٹ اکھڑ کر نیچے گر پڑا۔ میں جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل جذبات کی شدت سے زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ کسی غیبی طاقت نے میرے کان میں سرگوشی کر دی تھی کہ کرم داؤ تم یہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ کچھ دیر میں اسی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور دیوار کے پاس جا کر اس کو ہاتھ سے ٹولا۔ اوپر بھی ایک جگہ سے دیوار تھوڑی سی اندر کو ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ کبھی یہاں سے کوئی اینٹ پتھر اکھڑا ہو گا جس کو گارے سے بھر دیا گیا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے کھینچا تو وہاں سے بھی مٹی جھرنے لگی۔

مجھ پر ایک عجیب سی بھجلی کیفیت طاری ہو گئی اور میں جلدی سے دیوار سے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میری حالت اس پرندے کی تھی جس نے بچرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا دیکھ لیا ہو۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور میری کوشش بار آور ہوئی تو میں روشندان تک پہنچ سکتا تھا۔ میری نگاہیں روشندان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے ٹوٹے ہوئے شیشے والی جگہ سے میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر کسی طرح میں روشندان کا چوکھٹا اکھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤں تو روشندان میں سے نکل سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ دیوار کی دوسری طرف کیا ہے۔ دوسری طرف فوج کا کیپ بھی ہو

چھاتی سے لگا کر فرش پر اس پوزیشن میں بیٹھ گیا کہ میری آنکھیں روشندان کی طرف لگی ہوئی تھیں جس میں سے دن کی روشنی دھندلے غبار کی شکل میں اندر آرہی تھی۔ مجھے اس روشنی کے غائب ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میں نے کان باہر کی طرف لگا لیے۔ باہر کچھ دیر تک گورکھے فوجیوں کے باتیں کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر ایک فوجی کے بھاری بوٹوں کی آواز کچھ دور جا کر کم ہو گئی۔ کوٹھڑی کے باہر اب صرف ایک ہی سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر تھا۔

رات۔ رات۔ کاش رات جلدی آجائے، اندھیرا چھا جائے اور میں فرار کی کوشش شروع کر سکوں۔ ایک پلان پورے کا پورا میرے دماغ میں آچکا تھا۔ وہ قابل عمل بھی تھا اور ناقابل عمل بھی تھا۔ میری کامیابی کے چانس صرف پانچ فیصد تھے۔ لیکن میرے اندر بھارتی فوج کی ذلت آمیز قید سے فرار کا جذبہ سو فیصد سے بھی بڑھ کر بیدار ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر دیوار چین بھی میرے راستے میں آجائے تو میں اسے پھلانگ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ دن گزرتا چلا گیا۔ روشندان پر دن کی روشنی کا غبار پھیکا ہوتے ہوئے غائب ہو گیا۔ باہر ایک اور فوجی آکر باتیں کرنے لگا۔ پھر دروازہ کھلا، باہر روشنی تھی۔ میں نے دو فوجی دیکھے۔ ایک نے اندر جھانک کر مجھے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی آواز گیلری میں بلند ہوئی اور دور جا کر غائب ہو گئی۔ شاید گارڈ کی بدلی ہوئی تھی۔ دن والے گورکھے فوجی کی جگہ کوئی دوسرا فوجی ڈیوٹی پر آ گیا تھا۔

میں نے روشندان کی طرف دیکھا۔ روشندان کے باہر اندھیرا تھا۔ کوٹھڑی میں جو بلب جل رہا تھا اس کی مدھم روشنی میں روشندان کا چوکھٹا ایک طرف کو جھکا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے کچھ وقت اور گزار دیا۔ جب باہر گرمی خاموشی چھا گئی تو میں آہستہ سے اٹھ کر دیوار کے پاس آ گیا جس جگہ سے اینٹ کا کونا باہر کو نکلا ہوا تھا اس کو ذرا سا کھچا۔ سینٹ یہاں بھر بھرا تھا اور اس کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ وہ میرے ہاتھ

میں کرنے لگا۔ میں نے دنگز اوپر اسی سیدھ میں دیوار پر اس جگہ کو کھیدا جہاں سوراخ کو مٹی سے لپٹا ہوا تھا۔ وہاں سے بھی مٹی جھڑنے لگی۔ اس سوراخ سے روشندان تین گز کے فاصلے پر تھا۔ اگر کسی طرح میرا پاؤں اینٹ کے کونے پر جم جائے اور سوراخ والی مٹی کھرپنے کے بعد وہاں میرا ہاتھ جم جائے تو میں دوسرے پاؤں کو اوپر کر کے تھوڑا سا اچھل کر روشندان کے دہانے کو پکڑ سکتا تھا۔ یہی میرا پلان تھا اور اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کام شروع کر دیا۔ نیچے والی اینٹ کا کونا اتنا باہر نکل آیا کہ میں اس پر ایک پیر جما سکتا تھا۔ اب میں نے دونوں ہاتھوں سے اوپر والی مٹی کو کھرپنا شروع کر دیا۔ میرے اندر وحشی جانوروں والی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہاں بھی تھوڑا سا شکاف دیوار میں نمودار ہو گیا۔ اب میں نے ایسا کیا کہ اپنا بایاں پاؤں اینٹ پر جمایا۔ بائیں ہاتھ سے ہی دیوار کے شکاف کو پکڑا اور دائیں پاؤں کو فرش پر پوری طرح جما کر جتنی میرے اندر طاقت تھی اس کو پوری طرح عمل میں لاتے ہوئے اپنے آپ کو اتنی زور سے اچھلا کہ میرا بایاں ہاتھ حیرت انگیز معجزے کے ساتھ روشندان کے چوکھٹے پر پڑ چکا تھا۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ جھوڑا اور جھوڑنے کے ساتھ ہی بایاں ہاتھ بھی روشندان کے کنارے پر ڈالا اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اب میرے دونوں ہاتھ روشندان کے کناروں پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور ایک پاؤں اینٹ کے کونے پر تھا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ لیکن یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ ایک طرف زندگی تھی دوسری طرف موت تھی۔ مجھے ہر حالت میں زندگی کی طرف جانا تھا۔ میرے اندر زندہ رہنے اور فرار ہونے کی خواہش ایک زبردست طاقت کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ میں نے دوسری بار اپنے جسم کو پوری طاقت کے ساتھ اوپر کو اچھلا اور میرا گھٹنا روشندان میں پڑ گیا اور میں نے اس کے ساتھ ہی اپنی ٹانگ روشندان کی دوسری طرف نکال دی۔ روشندان کا چوکھٹا چرچا ایا اور درمیان میں سے اس کی لکڑی ٹوٹ کر دوسری طرف گر گئی۔ میں وہیں ساکت ہو گیا۔

ہوں۔ ایک پرانی عمارت تھی جسے عارضی طور پر یعنی دوار کا میں ہنگامی صورت حال پیدا ہونے کی وجہ سے فوج نے فوجی کوارٹر گارڈ میں بدل دیا تھا۔ اس لیے اس عمارت کا پچھواڑا بالکل دیران تھا اور کوئی چار دیواری وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اندھیرے میں درختوں کے سیاہ جھاڑ سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جھاڑیوں سے نکل کر درختوں کی طرف بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ راستے میں کئی جگہ میرا پاؤں پتوں اور پتھروں پر سے پھسلا کر میں رکے بغیر دوڑتا چلا گیا۔ دوڑ لگانے کی مجھے بڑی مشق تھی۔ آرمی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی میں ڈھلکے میں کبھی کبھی دوڑ لگانے یا جھنگل کرنے نکل جایا کرتا تھا۔ مگر اس وقت میں جاگنگ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہا تھا جیسے میرے پیچھے شکاری کتے لگے ہوئے ہوں۔

اندھیرے میں جس طرف سے ذرا دھندلی سی روشنی اور کھلی جگہ دکھائی دیتی تھی اپنا رخ اسی طرف کر لیتا۔ ایک کھائی آگئی جس میں پتھر بہت تھے۔ میں اس میں اتر گیا اور پتھروں پر سے اچھل اچھل کر جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ کر کھائی سے باہر نکل گیا۔ صرف ست کا مجھے اندازہ تھا کہ میں جنوب مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ کاشیاواڑ بھی دوار کا کے جنوب مشرق کی جانب ہی تھا یہ علاقہ میرے لیے بالکل انجانا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب میں زیادہ ہانپنے لگا تو ایک جگہ بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ آدمی کا سانس پھول رہا ہو تو اس کے لیے لمبے سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں کمائنڈو ٹریننگ میں یہی بتایا گیا تھا کہ سانس زیادہ پھول جائے تو دس بار سانس لینے کے درمیان کم از کم ایک سانس ضرور گھرا اور رک کر لو تاکہ آکسیجن کو کچھ دیر پھیپھڑوں میں رہنے اور پھیپھڑوں کے ذریعے خون میں جذب ہونے کا موقع مل سکے۔ میں نے چھ سات بار لمبے لمبے سانس لیے اور سچ میں تین چار سیکنڈ کے لیے سانس کو پھیپھڑوں میں ہی رکھا تو میرا سانس درست ہونے لگا۔ میں زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اٹھا اور دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ میں ایک پگڈنڈی پر آ گیا جس کی جانب اونچے اونچے ستونوں والے تار کے درخت نیم روشن رات کے آسمان کے پس

دوسری طرف لکڑی کے گرنے کی آواز نہیں آتی تھی۔ شاید دوسری طرف نیچے گھاس یا جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس سے مجھے حوصلہ ہو گیا۔ روشندان کے درمیان میں سے لکڑی کے ٹوٹ کر گرنے سے وہاں کافی جگہ بن گئی۔ مجھے اب روشندان کا چوکھٹا اکھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے دونوں کندھے اور سر روشندان سے باہر دوسری طرف نکل لیے۔

دوسری طرف اندھیرا تھا۔ میں نے ٹانگوں کو اندر سے کھسکا کر باہر نکالا اور یا سوئی تیرا آسرا کہہ کر روشندان کی چوکھٹ سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا۔ میں نے کمائنڈو تربیت کے مطابق اپنے آپ کو اس طرح گرایا تھا کہ میں نیچے پہنچنے سے پہلے ایک قلابازی لگا لوں۔ اس کی ہمیں خاص تربیت دی جاتی تھی کہ اگر دوسری منزل سے نیچے رڑے میدان میں بھی چھلانگ لگنی ہو تو جسم کو پورا پھیلا کر نیچے نہ کودو۔ اس طرح سے تمہاری رفتار بھی تمہارے جسم کے بوجھ کے ساتھ شامل ہو جائے گی اور جب تم نیچے گرو گے تو تمہارا وزن چار گنا بڑھ چکا ہوگا۔ اگر راستے میں ایک قلابازی لگاو گے تو نیچے گرتے وقت جسم کا وزن نیچے گرنے کی رفتار سے مل کر صرف دو گنا ہی ہوگا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ نیچے گرتے وقت میں نے اپنا سر پیچھے کر لیا اور زیادہ سے زیادہ کوشش کی کہ میں پتوں کے بل گروں۔ مگر میں ایک بہت گھنی جھاڑی میں گرا۔ میں نے اپنے گھٹنے اوپر اٹھا رکھے تھے اور اس طرح زمین پر گرا جس طرح خرگوش جست لگانے کے بعد پہلے اپنے اگلے پتوں پر گرتا ہے۔

جنگلیان جھاڑیوں نے مجھے دو فائدے دیے۔ ایک تو میرے گرنے کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ دوسرے میرے جسم کو کوئی چوٹ نہ لگی۔ تربیت کے مطابق میں نے گرتے ہی اپنے آپ کو لڑھکا دیا تھا۔ جھاڑیوں کی نوکیلی شاخوں نے میری گردن اور کھنٹیوں کو جگہ جگہ سے معمولی زخمی کر دیا تھا۔ مگر افراتفری میں مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی میں وہیں دبکا رہا اور شاخوں میں سے سر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا کہ میں کہاں پر ہوں۔ یہ چونکہ کوئی فوجی کیپ وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا

منظر میں نظر آ رہے تھے اور دوسری طرف کھلا میدان تھا۔ میدان میں گھاس تھی یا نہیں تھی مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پگڈنڈی پر بلندی بلندی چلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ سی جگہ کوئی روشنی نہیں مل رہی تھی۔

مجھے ہوا میں پانی کی نمی محسوس ہوئی۔ یہ نمی دریا نے پانی کی تھی۔ سانپ بننے کی وجہ سے میری سونگھنے کی حس بے حد تیز ہو گئی تھی اور یہ حس انسانی روپ میں آ جانے کے بعد بھی بہت حد تک برقرار رہتی تھی۔ یہ نمی سمندر کے پانی کی نمی نہیں تھی۔ سمندر کے پانی کی نمی میں کھارے پن کی اور کہیں کہیں مچھلیوں کی بو ملی ہوئی ہوتی ہے۔ دریا کے پانی کی نمی میں ایک نکھار اور مسک سی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے کوئی دریا تھا۔ میں پگڈنڈی پر سے گزر گیا۔ پگڈنڈی ختم ہوئی تو ویرانہ شروع ہو گیا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جھاڑیاں بھی بہت دور دور تھیں اور اندھیرے میں اس طرح لگ رہی تھیں جیسے فقیر سیاہ کبیل اوڑھ کر بیٹھے ہوئے ہوں۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ میں کہاں جا کر نکلوں گا۔ میں صرف اس علاقے سے جتنی دور نکل سکوں نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ میری بھرپور جوانی کا ٹائم نہیں تھا۔ میری کمائڈو ٹریننگ اپنی جگہ پر ضرور قائم تھی مگر جسم میں وہ طاقت نہیں رہی تھی جو میرے آرمی سروس کے زمانے میں تھی۔ چنانچہ مجھے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ میں پھر بھی نہ رکا اور چلتا گیا۔

آسمان اسی طرح بادلوں میں چھپا ہوا تھا جیسے دن کے وقت تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اصل میں قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ قسمت بھی عجیب چیز ہے۔ مصیبت میں آدمی کا ساتھ بھی دیتی ہے اور اچانک ساتھ چھوڑ بھی دیتی ہے۔ اسی لیے بزرگ لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کو قسمت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو قسمت پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ سب سے پہلے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور پھر اپنی ہمت اور کوشش سے کام لے کر مصیبت سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں بھی یہی کچھ کر رہا تھا۔ لیکن ایک مقام پر پہنچ کر میری ٹانگیں جواب دے

گئیں۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے سانپ سنہلوں کا تو کوئی ڈر ہی نہیں تھا۔ زہریلے سے زہریلا سانپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ دوسرے میں فوجی کوارٹر گارڈ سے کلنی دور نکل آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا دھڑکا ضرور لگا تھا کہ یہ میدانی علاقہ ہے۔ میرے فرار کی خبر ہو گئی تو فوجی ٹرک میری تلاش میں آنا ٹاننا یہاں پہنچ جائے گا۔ میں زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ بمشکل تین منٹ بیٹھ کر تھوڑا آرام کیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ اب مجھے دریا کی طرف سے پریشانی لگ گئی تھی کہ آگے دریا آگیا اس پر کوئی پل نہ ہوا تو مجھے تیر کر دریا پار کرنا پڑے گا۔ گرمیوں کا موسم تھا دریا ضرور چڑھا ہوا ہوگا۔ اس کی لہریں مجھے بہا کر کہیں کی کہیں لے جاسکتی تھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دریا آگے جا کر سمندر میں گرے گا جو اس کا غالب امکان تھا کیونکہ سمندر میری دائیں جانب تھا۔ دریا کی طرف سے آنے والی نمی اور ٹھنڈک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ایک گہرائی میں سے ہو کر دوسری طرف اوپر آیا تو کچھ فاصلے پر مجھے درختوں کی سیاہ دیوار اوپر تک اٹھی ہوئی دکھائی دی۔ وہاں سے ضرور دریا کا کنارہ شروع ہوتا ہوگا۔ میں چلتا گیا۔ جب درختوں کی سیاہ دیوار کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا کچا اور پتھریلا راستہ درختوں کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف جاتا ہے۔ درختوں کے درمیان سے مجھے دریا کا حد نگاہ تک پھیلا ہوا پل دکھائی دیا تو مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ دریا کو رات کے وقت دیکھ کر انسان پر ایک بار ہیبت ضرور طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ایک قدرتی ہیبت ہے۔ وہاں کوئی پل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کچے راستے پر دریا کے بہاؤ کے رخ پر چلتے لگا۔ سڑک سو ڈیڑھ سو گز آگے جا کر اونچی ہو گئی۔ اس کے بعد جب سڑک ہموار یعنی زمین کی سطح کے برابر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میری دائیں جانب کچھ فاصلے پر کسی بہت بڑی عمارت کا خاکہ سا ابھرا ہوا ہے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ضرور یہ کسی پرانے قلعے یا پرانی تاریخی عمارت کا کھنڈر ہے کیونکہ اس میں کہیں بھی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بھوت محل لگ رہا تھا۔ کچا راستہ آگے جا کر دو اونچی اونچی چٹانوں جیسے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا گیا۔

میں جب ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگا تو مجھے کسی عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ ضرور یہ کوئی چڑیل ہوگی۔ میں نے سوچا، مگر میں بالکل نہ ڈرا۔ موت میرا پیچھا کر رہی تھی۔ اس وقت میں چڑیل سے خوف زدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے چڑیلوں سے کبھی اتنا زیادہ ڈر نہیں لگتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں آگے نکل جاؤں لیکن جب عورت نے کراہتی ہوئی آواز میں بڑی صاف اردو زبان میں کہا۔

”پلیز میری مدد کرو۔ بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔“

تو میں رک گیا۔ آواز ٹیلے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ میں نے دہلیز سے آواز

دی۔

”اگر تم کوئی انسان ہو تو سامنے آؤ۔ اگر چڑیل ہو تو دفع ہو جاؤ۔“

عورت کی آواز آئی۔

”میں انسان ہوں۔ میرے پاؤں میں سخت درد ہے۔ میری مدد کرو۔ میں اٹھ نہیں

سکتی۔“

اس خیال سے کہ عورت ذات ہے۔ خدا جانے کس تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ویسے بھی میں خطرے کے مقام سے کٹنی آگے نکل آیا تھا۔ میں ٹیلے کے عقب میں آگیا۔ مجھے اندھیرے میں ایک سفید ساڑھی والی عورت کا ہیولا دکھائی دیا جو زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دوری سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟ تم رات کے وقت یہاں کیسے آ گئی ہو؟“

عورت نے کراہتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میرا نام قونج کماری ہے۔ میں اس علاقے کی جاگیردارنی ہوں۔ بائیں طرف

دور سے جو عمارت نظر آ رہی ہے وہ میرے پرکھوں اور باپ داداؤں کی حویلی ہے۔ میں وہاں اپنی بہو اور اس کے بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ شرگئی ہوئی تھی۔ وہاں ہم کے دھمکے ہوئے تو لوگوں نے کہا۔ پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حویلی کی طرف چل پڑی کہ اگر جنگ لگ گئی تو کم از کم اپنے پوتوں کے پاس تو

ہوں گی۔ یہاں آ کر گھوڑا بدک گیا۔ میں گر پڑی۔ گھوڑا بھگوان جانے کدھر چلا گیا۔ میرے پاؤں میں سخت موج آگئی۔ تب سے میں یہاں پڑی ہوں۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنتی ہوں تو آواز دے کر مدد کے لیے پکارتی ہوں۔ دو آدمی مجھے چڑیل سمجھ کر ڈر کر بھاگ گئے۔ تم بڑے بہادر آدمی ہو کہ میری مدد کو آ گئے ہو۔“

میں نے کہا۔

”ہن جی! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

عورت کی آواز سے لگتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ میں ابھی

تک اس سے پانچ چھ قدم دور ہی کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔

”بیٹا! بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ ہماری حویلی یہاں سے تھوڑی دور ہی ہے۔ مجھے کسی طرح سارا دے کر حویلی کے دروازے تک پہنچا دے، آگے میں خود دیواروں کو پکڑ پکڑ کر اندر چلی جاؤں گی، بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔ مجھ سے درد برداشت نہیں ہو رہا۔“

میں انسانی بہردی کے خیال سے اس کی طرف بڑھا۔ جس عمارت کو یہ عورت اپنی حویلی بتا رہی تھی اس کو میں نے دور سے دیکھ ہی لیا تھا۔ وہاں سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ قریب جا کر میں نے دیکھا کہ عورت زمین پر ایک گھٹنا اوپر اٹھا کر بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے ٹخنے کو پکڑ رکھا تھا۔ رات کی دھندلی پھٹکی روشنی میں اس کا سفید چہرہ اور سر کے سفید بال صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے وہ عورت واقعی کوئی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

”ہن جی! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر انھیں، میں آپ کو آپ کی حویلی کے دروازے تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”بھگوان تمہیں سکھی رکھے بیٹا۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔“

میں نے اسے سارا دے کر اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے ایک پاؤں پر کھڑی ہو سکی۔ میں نے کہا۔

”ہن جی! اپنا بازو میرے کندھے پر رکھ لیں اور آہستہ آہستہ چلیں۔“
اس نے ایسا ہی کیا۔ میں اسے بڑی آہستہ آہستہ چلاتا ٹیلے کی اوٹ سے نکل آیا۔
میں نے اس سے پوچھا کہ حویلی کو جانے والا راستہ کس طرف ہے۔ اس نے کہا۔
”بیٹا! ذرا آگے جاؤ گے تو ایک چھوٹی سی سڑک نکلے گی۔ وہ سڑک ہماری حویلی کو
ہی جاتی ہے۔“

جیسے جیسے وہ کبھی گئی میں اسے سہارا دے کر چلاتا رہا۔ چھ سات قدموں کے بعد
واقعی ایک چھوٹی سی سڑک نیچے اترتی تھی اور اندھیرے میں حویلی کی طرف جاتی گئی
تھی۔ جاگیردارانی نے مجھے اسی راستے پر چلنے کے لیے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے وہ
پاؤں کو بالکل زمین پر نہیں رکھی تھی مگر حویلی والی سڑک پر آ کر اس نے پاؤں زمین پر
ٹکا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔
”زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“
وہ بولی۔

”نہیں بیٹا! تمہارے سہارا دینے سے تو مجھے بڑا آرام ملا ہے۔ اب میں پاؤں تھوڑا
دبا کر چل رہی ہوں۔“

جب ہم پرانی عمارت کے قریب پہنچے جو رات کے اندھیرے میں عجیب ڈراؤنی اور
ہیبت ناک لگ رہی تھی تو مجھے روشنی ٹھناتی نظر آئی۔ یہ روشنی حویلی کے دروازے
کے اوپر لگے ہوئے کسی بلب یا لیپ سے آرہی تھی۔ لیپ کے اوپر شیڈ لگا ہوا تھا
شاید کیونکہ روشنی صرف بلب کے نیچے ہی پڑ رہی تھی۔ جاگیردارانی توجہ کماری نے مجھ
سے بڑی شفقت بھری باتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ گلوں چھوڑ کر امریکہ چلا گیا ہے۔ دو سال سے وہیں پر
ہے۔ بھگوان کی بڑی کپا ہے کہ سو اور اس کے بچے میرے پاس ہیں، میرا جی لگا رہتا
ہے۔“

میں نے کہا۔

”ہن جی! آپ کی اردو اس علاقے کی نہیں لگتی۔“
”بیٹا میں پیدا تو اسی صوبے میں ہوئی تھی۔ ہمارے باپ دادا ایس کے رہنے والے
تھے۔ مگر میں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک سال آکسفورڈ یونیورسٹی میں
بھی لگایا تھا۔ مگر بیٹا یہ جوانی کے دنوں کی باتیں ہیں۔ اب تو میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔“
ہم حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے کہا۔

”ہن جی! میرا خیال ہے اب آپ خود اندر جا سکتی ہیں، مجھے اجازت دیں۔“
جاگیردارانی تو میری فٹیں کرنے لگ گئی کہ بیٹا میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں
گی۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اندر چل کر میرے ہاتھ سے پرشلو کا لٹو اور
میری سو کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی کر میری آتما کو شانتی دو۔
”اگر تم یہیں سے واپس چلے گئے تو میں دشمن بھگوان کو پوجا کے وقت کیا منہ
دکھاؤں گی! بیٹا تم میرے لیے اس وقت دشمن بھگوان کا روپ ہو۔“
بوڑھی جاگیردارانی تو آنسو بہانے لگی۔ میں نے کہا۔

”ہن جی! آپ دکھی نہ ہوں۔ اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں آپ کو اندر
تک چھوڑ آتا ہوں مگر میں کھانوں، بیسوں گا کچھ نہیں۔“
جاگیردارانی خوش ہو کر بولی۔

”بھگوان تمہارا بھلا کرنے بیٹا۔ تم نے میرا دل رکھ لیا۔ آ جاؤ، آ جاؤ۔ اندر آ
جاؤ۔“

میں نے بھی سوچا کہ آگے دریا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ یہ علاقہ آگے کس طرف جا
نکتا ہے۔ اس عورت سے کم از کم آگے کے علاقے کے بارے میں کبھی معلومات مل
جائیں گی۔ ممکن ہے یہ مجھے اپنا کوئی ٹھکانا ہی دے دے۔ میں نے اس کے آگے اپنے
بارے میں اور رات کے وقت اس طرف سفر کرنے کی وجہ بیان کرنی تھی۔ اس کی ایک
جھوٹی کہانی میں نے دماغ میں سوچ لی تھی۔

حویلی کی ڈیوڑھی میں کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں تھا۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک کشادہ

صحن تھا جہاں رات کے وقت الو بول رہے تھے۔ میں نے اوپر عمارت کی صحن کی جانب کھانے والی کھڑکیوں پر نگہ ڈالی وہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ جاگیردارنی میرا سارا لیے صحن میں چل رہی تھی۔ سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے پیچھے ایک اور برآمدہ تھا۔ یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ عجیب حویلی ہے کہ جہاں کسی طرف سے نہ کوئی آواز آرہی ہے نہ کہیں کوئی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ برآمدے کے آخر میں بائیں جانب ایک دروازے کے پاس جا کر بوڑھی جاگیردارنی رک گئی۔ کہنے لگی۔

”بیٹا! دروازے کو ذرا دھکیلو۔ اندر سے جتنی نہیں لگی ہوئی۔ مجھے معلوم ہے‘ یہ میرا ڈرائنگ روم ہے۔ جب میں باہر کہیں جاتی ہوں تو رات کو میری ہو دروازے کی جتنی نہیں لگاتی کہ میں نہ جانے کس وقت آ جاؤں اور کسی کو جگانا نہ پڑے۔“

میں نے ایک ہاتھ سے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا، دروازہ کھل گیا۔ اندر بھی گھپ اندھیرا تھا۔ اندر سے ایسی ناگوار بو آئے لگی جیسے اندر الوؤں اور چگدڑوں نے بیرا کر رکھا ہو۔ جاگیردارنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھہرو میں بتی جلاتی ہوں۔“

اس نے میرا سارا لیے لیے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا سوچ دیا دیا۔ میرا خیال تھا میں دبانے سے کمرہ روشن ہو جائے گا۔ مگر ایک بڑا کمزور سا بلب روشن ہو گیا جس کی پھینکی پر اسرار روشنی میں مجھے دیواروں پر لٹکے ہوئے لیے لیے سرخ پردے اور درمیان میں لگا ہوا بھاری صوفہ دکھائی دیا۔ صوفے پر بھی سرخ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ کمرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب اور ڈراؤنی سی لگی۔ جاگیردارنی میرے سارے آگے چل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ کرم داد میں سے جتنی جلدی نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔ مگر اس عورت سے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ دریا پر آگے کوئی پل ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ علاقہ آگے کاٹھیاواڑ کی طرف نکل جائے گا کیا؟ میں نے دماغ میں پیدا ہونے والے

توہمت کو نکل دیا اور جاگیردارنی سے پوچھ لیا۔

”ہن جی! آگے دریا پر ایک پل ہوتا تھا‘ وہ کس طرف ہے؟“

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اس طرف سے پہلے بھی گزرتا رہا ہوں۔ اپنے بارے میں میں نے اسے یہی بتایا کہ ہم کچھ دوست شکار کھینے نکلے تھے کہ میں ان سے پتھر کر راستہ بھول گیا۔ جاگیردارنی نے کہا۔

”وہ پل بہت آگے جا کر ہے۔ پتھر مگر ٹھہر نہ کرو ہماری اپنی کشتی ہے۔ اپنا ملاح ہے۔ وہ اسی حویلی میں ہوتا ہے۔ میں اس کو تمہارے ساتھ کر دوں گی۔ وہ خود تمہیں دریا پار چھوڑ آئے گا۔ دریا پار ایک گھوڑا ہے جہاں سے کاٹھیاواڑ کو لاریاں آتی جاتی ہیں۔ تم کاٹھیاواڑ چلے جانا کیونکہ دوار کا میں تو فوج نے کر لیا دیا ہوا ہے۔ بھگوان جانے پاکستان بھارت کے جھگڑے کب ختم ہوں گے۔ اچھا تم بیٹھو میں سو کو لے کر آتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے چائے بھی لائے گی۔ بھگوان کے لیے چائے نہ جانا۔“

اس بوڑھی عورت کے شفقت بھرے رویے نے میرے دل سے مزید توہمت کو ختم کر دیا۔ اور پھر مجھے یہ لالچ بھی تھا کہ میں اس کی کشتی میں دریا پار کر سکوں گا۔ وہ صوفے کا سارا لے کر کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کی ہر شے سرخ دیکھ کر میں نے یہی خیال کیا کہ یہ پرانے زمانے کے وضع وار جاگیردار لوگ ہیں۔ ان کے ہاں اس زمانے کے صوفے اور پردے پڑے ہیں، جب زمیندار وغیرہ بڑے شوق سے سرخ رنگ کے پردے حویلیوں میں لٹکایا کرتے تھے۔ کچھ دیر اندر بیٹھے رہنے کی وجہ سے اب مجھے فضا میں پھیلی ہوئی محسوس سی ناگوار بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے ایسے لگا جیسے جاگیردارنی نے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔ میں ذرا چونکا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کو ذرا دھکیلا۔ واقعی دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہونے لگے کہ اس عورت نے باہر سے کنڈی کیوں لگائی ہے۔ پھر میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ بے چاری دہم پرست عورت ہے اور دشمن کی پکار ہے، وہ نہیں چاہتی

کہ میرے احسان کا بدلہ چکائے بغیر مجھے وہاں سے جانے دے۔ اس نے کہا بھی تھا کہ اگر میں نے اس کی چائے وغیرہ قبول کر لی تو اس کا دشمن بھگوان اس سے ناراض ہو جائے گا۔ میں واپس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میں صوفے پر واپس آکر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی باہر سے کھلی اور جاگیردارنی چاندی کی منہ والی چھڑی کے سہارے چلتی اندر آگئی۔ آتے ہی بولی۔

”ٹھا کرنا بیٹے۔ تم ضرور سوچتے ہو گے کہ میں نے باہر سے کنڈی کیوں لگا دی تھی۔ بیٹا! میں بڑے پرانے خیال کی عورت ہوں۔ میرا یہ اعتقاد ہے کہ مجھ پر اگر کوئی احسان کرتا ہے اور میں اسے بھگوان وشنو کے نام کے لٹو اور چائے نہیں پیش کرتی تو بھگوان وشنو مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور میرا اگلا جنم جانوروں میں ہوگا۔ اس واسطے میں باہر سے کنڈی لگائی تھی کہ تم کیسے چلے نہ جاؤ۔“

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔
”کوئی بات نہیں بن جی! اب میں آپ کے ساتھ حویلی میں آئی گیا ہوں تو چائے پی کر ہی جاؤں گا۔ لیکن مجھ پر ایک کپا ضرور کرنی ہوگی آپ کو۔“
”تم حکم کرو بیٹا۔“ جاگیردارنی نے بڑے شوق کے ساتھ کہا۔
میں نے کہا۔

”بس اپنے ملاح کو جگا کر کہہ دیں کہ کشتی نکال لے اور مجھے دریا پار کرا دے۔“
جاگیردارنی نے بڑی شفقت سے کہا۔

”بیٹا! میں نے ملاح سرجن کو جگا بھی دیا ہے۔ وہ دریا پر کشتی نکالنے چلا بھی گیا ہے۔ بس تم ایک پیالی چائے پی کر میرے نوکر کے ساتھ دریا پر چلے جانا۔ وہ تمہیں خود کشتی میں سوار کر دیا کر آئے گا یہ تو میرے بڑے سہاگ ہیں کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں گی۔“

پھر وہ خود ہی کہنے لگی۔

”بیٹا تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ اس کمرے کی ہر شے سرخ کیوں ہے۔ اصل

میں میں نے یہ سب کچھ اپنی ہو کا شوق پورا کرنے کے لیے کیا ہے۔ اسے سرخ رنگ بڑا پسند ہے۔ اب میں بھی اس رنگ کو پسند کرنے لگی ہوں۔ کیا کروں مجھے اپنی ہو سے بڑی محبت ہے۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”آپ کی ہو تو اس وقت سو رہی ہوگی۔ اسے تکلیف نہ ہی دیتیں تو اچھا تھا۔“
”بیٹا! کیا کروں میری ہو کو جو دو سری چیز اچھی لگتی ہے وہ صرف رات کو دیر تک سوتا ہے۔ نیند کی تو وہ دیوانی ہے۔ میں نے اسے جگایا بھی مگر وہ اٹھی ہی نہیں۔“
میں نے کہا۔

”تو پھر میں چلا ہوں۔ نوکر سے کہیں کہ مجھے دہریا تک لے جائے۔“

جاگیردارنی نے میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کچھ کھائے پئے بغیر تو میں تمہیں کبھی نہیں جانے دوں گی۔ کم از کم ایک پیالی چائے تو تمہیں ضرور پینی ہوگی۔ تمہارے چائے پینے سے میرا جنم پھل ہو جائے گا۔“

وہ یہ کہہ رہی تھی کہ دروازے میں ایک عورت نمودار ہوئی جس نے ہاتھوں میں چاندی کا طشت تھام رکھا تھا۔ اس نے سیاہ بالوں کا جوڑا بٹایا ہوا تھا۔ جس میں گیندے کے پھول سجے ہوئے تھے۔ ساڑھی اس طرح پھٹی تھی کہ اس کا ایک بازو شانے تک نکلا تھا۔ رنگ سالوا تھا جو کمرے کی سرخی مائل فضا میں تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ صحت مند، جوان اور خوش شکل عورت تھی۔ وہ مجھے کسی ہندو مندر کی رقص لگی جو رقص کرتے کرتے ہمارے لیے چائے لے کر آگئی ہو۔ جاگیردارنی نے اس کا تعارف کروانے ہوئے کہا۔

”یہ دشلی ہے۔ یہ میرا بہت خیال رکھتی ہے اور چائے بڑی عمدہ بناتی ہے۔“

دشلی نے چائے کا طشت میرے آگے میز پر رکھتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اس کی نظریں مجھے کچھ کہہ رہی تھیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ دشلی

کمال

”ہن جی اب اجازت دیں۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے جلدی دریا پار کر جانا ہے۔“

جاگیردارانی نے کمال

”بیٹا! یہ چائے تو ختم کر لو۔ یہ دشتو بھگوان کے نام کی ہے۔ بچی ہوئی رہ گئی تو بد گھوٹی ہوگی۔ جانے کی تم فکر نہ کرو۔ میرا آدمی گھٹ پر کشتی لیے موجود ہوگا۔“

میں نے جلدی جلدی پیالی میں بچی ہوئی چائے حلق میں اندلی اور جاگیردارانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھنے لگا تو مجھے چکر سا آگیا۔ میں نے ہاتھ سے اپنے ماتھے کو سہلایا۔ دوبارہ اٹھنے لگا تو پہلے سے زیادہ شدید چکر محسوس ہوا اور میری آنکھوں کے آگے کمرے کی چیزیں دائرے میں گردش کرنے لگیں۔ جاگیردارانی نے اپنا چہرہ میرے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

میں نے جاگیردارانی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی مجھے گھومتا نظر آیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کب تک صوفے پر بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں صوفے پر نہیں ہوں کسی سخت جگہ پر لیٹا ہوا ہوں۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ چکر ختم ہو گئے تھے۔ چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے تو مجھ پر اس بھیانک حقیقت کا احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھا کر دیکھا۔ میں لوہے کے ایک سڑیچر پر لیٹا تھا۔ میرے دونوں بازو، کلائیوں اور دونوں ٹانگیں اور پاؤں چڑے کے تسموں سے سڑیچر کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

میں تو حیران پریشان رہ گیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ جاگیردارانی تو بڑی خطرناک عورت نکلی۔ اس نے مجھے بے ہوش کر دینے والی چائے پلائی اور پھر سڑیچر پر باندھ دیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ظاہر ہے جاگیردارانی کے ارادے نیک نہیں تھے۔ میں نے بلند آواز سے دشتی کو آواز دی۔ کئی بار دشتی کو پکارا۔ ہر بار کمرے میں میری

صوفے کے درمیان والی نیچی میز کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور چائے پیالوں میں ڈالنے لگی۔ یہ عورت دشتی اپنے ساتھ ایک عجیب پر اسرار اور گہری خوشبو لائی تھی جو اس آسپی کمرے میں پھیلی ہوئی ناگوار بو میں مجھے بڑی خوشگوار لگی۔ جاگیردارانی اسے چائے پلاتے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایک تھلی میں لڈو بھی پڑے تھے۔ جاگیردارانی نے کمال

”بیٹا! یہ لڈو دشتو بھگوان کے مندر کا پرشاہ ہے۔ اسے ضرور چکھو۔“

میں نے کمال

”نہیں ہن جی! میں صرف چائے پیوں گا۔“

دشتی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ جب میں چائے کی پیالی پکڑنے لگا تو دشتی نے ایک بار پھر مجھے گہری معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اپنے سر کو نفی کے انداز میں اس طرح ہلایا جیسے کہہ رہی ہو چائے مت پینا۔ مگر میں نے اس کے اشارے کو زیادہ اہمیت اس لیے نہ دی کہ جو کچھ میرے ساتھ وہیں ہونے والا تھا اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ جاگیردارانی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”چائے پی کر بتاؤ بیٹا کہ چائے کیسی ہے؟“

میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ چائے میں الابچی کی خوشبو بھی تھی۔ چائے واقعی بڑی مزے دار تھی۔ میں نے کمال

”بہت اچھی چائے ہے ہن جی۔“

عورت دشتی میز کے قریب ہی گھٹنوں کے بل ادب سے بیٹھی تھی۔ جاگیردارانی

نے اس سے کمال

”دشتی! اب تم جاؤ۔ تمہارا اب کوئی کام نہیں ہے۔“

دشتی نے اٹھتے ہوئے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ اب کمرے میں میں اور جاگیردارانی رہ گئے تھے۔ مجھے جانے کی جلدی تھی۔ میں نے چائے کے مزید دو ایک گھونٹ پیے اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے

تو میں یہی سمجھا کہ بھارتی سپاہی مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ لیکن جب آدمیوں اور عورتوں کے ہلکے ہلکے قہقہے بھی سنائی دیے تو معلوم ہوا کہ یہ فوجی نہیں ہیں۔ اس کے بعد وہی موت ایسی خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے خدا سے یہ دعا بھی مانگی کہ یا اللہ پاک مجھ پر دورہ ہی پڑ جائے اور میں انسان سے سانپ بن جاؤں۔ کم از کم میں سانپ کے روپ میں آکر وہاں سے بھاگ تو سکتا تھا۔ لیکن میری یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی۔

وقت اس طرح گزر رہا تھا جس طرح بہت زیادہ زخمی سانپ رینگنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جن لوگوں کی آوازیں کچھ دیر پہلے آئی تھیں وہ آگے جا کر کسی اندھے کنوئیں میں گر گئے ہیں۔ ایک سناٹا تھا جس میں اس منحوس کمرے کے در و دیوار سنستا رہے تھے۔ پھر اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دو آدمی لگ رہے تھے۔ وہ دروازے کے پاس آکر رک گئے تھے۔ اس کے بعد تالا کھلنے کی آواز آئی۔ مجھے اس آہستی کو ٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا کہ دو کالے سیاہ جشی اندر آ گئے ہیں۔ وہ بالکل افریقہ کے جشی تھے۔ سر کے بال چھلے دار تھے۔ جیسے افریقہ کے جشیوں کے ہوتے ہیں۔ کندھوں پر انہوں نے سنیں گئیں لڑکا رکھی تھیں۔ اوپر کے دھڑنگے تھے۔ کمرے کے نیچے سرخ رنگ کی سائن کی شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے الف لیلا کے زمانے کے جشی لگ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس آہستی حویلی میں یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں جشیوں نے اندر آتے ہی سترچ کو پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ میں نے غصیلی آواز میں کہا۔

”تم کون ہو؟ مجھے کہیں لے جا رہے ہو؟“

جشیوں پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ جیسے وہ میری زبان ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ میرا سترچ چلاتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ باہر ایک نیم روشن راہ داری تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔

”نیں فوج کا کرغل ہوں۔ میں تم سب کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا۔“

آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ یہ چھوٹا سا نیم روشن کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ اسی منحوس سرخ رنگ کا صوفہ پڑا تھا۔ دیواروں پر سرخ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ یا اللہ خیر! میرے دل سے بے اختیار دعا نکل اور میرے ذہن میں پریشان کر دینے والے خیالات آنے لگے۔ یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ عورت انڈین آرمی انٹیلی جینس کی عورت تو نہیں ہے۔ اس کو پتہ چل گیا ہو کہ میں کمانڈو ہوں اور اس نے مجھے آرمی کے حوالے کرنے کے لیے بے ہوش کر کے سترچ پر جکڑ دیا ہو۔ اس خطرے کا مجھے زیادہ امکان محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ کچھ دیر بعد حویلی میں بھارتی فوجی آئیں گے اور مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔

میں نے دو تین بار اپنی کلائیوں کو تسوں میں سے نکالنے کی کوشش کی مگر تسے چڑے کے تسے اور اس بری طرح سے انہوں نے میرے بازوؤں، کلائیوں اور ٹانگوں اور ٹخنوں کو جکڑ رکھا تھا کہ میں صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیوں اور پاؤں کے پنجوں کو ہی ہلا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ سامنے ایک جھوٹا سا پرانی طرز کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ باہر سے کسی قسم کی کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں اللہ پاک سے دعا مانگنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے باہر سے آدمیوں کے بولنے اور ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں دور سے آ رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں قریب سے ہوتے ہوئے آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد پھر آدمیوں کے بولنے اور قہقہے لگا کر باتیں کرنے کی آوازیں آئیں اور یہ آوازیں بھی کمرے کے قریب سے ہو کر آگے نکل گئیں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی تھیں۔ لگتا تھا کہ کمرے کے باہر کوئی راہ داری ہے جہاں سے لوگوں کی ٹولیاں گزر رہی ہیں۔ چار پانچ ٹولیاں گزر گئیں تو میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ کدھر سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ پہلی دفعہ آدمیوں کی آوازیں آئیں

جیسی بڑے سکون کے ساتھ سڑیچ کو راہ داری میں لیے جا رہے تھے۔ راہ داری اوپر اوپر سے گھوم کر آگے بڑھی تو مجھے انسانوں کی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی بڑے کمرے میں بہت سے لوگ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوں۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جن کی ٹولیاں کمرے کے باہر سے گزری تھیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھیں۔ پھر ایک اونچا دروازہ آگیا۔ دروازے کے باہر بھی دو سیاہ فام جیسی برین گئیں لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے سڑیچ کو دیکھتے ہی دروازے کا ایک کیواڑ کھول دیا۔ کیواڑ کے کھلتے ہی انسانوں کی آواز صاف سنائی دینے لگیں اور اندر سے روشنی بھی باہر آنے لگی۔ یا خدا! یہ کیا منظر ہے! جیسے ہی جیسی میرا سڑیچ لے کر دروازے میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہل کرہ ہے۔ میری دائیں جانب ہل کمرے میں اوپر سے نیچے تک لال رنگ کے صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ صوفوں پر رنگ برنگ لباسوں میں عورتیں اور مرد بیٹھے ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ سامنے ایک سڑیچ بنی ہوئی ہے۔ میرا سڑیچ اسی سڑیچ پر لایا گیا تھا۔ جیسی میرے سڑیچ کو سڑیچ کی ایک طرف دیوار پر گرے ہوئے سرخ پردے کے پاس لے گئے اور اسے میرے سر کی جانب سے ذرا سا اوپر اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ شاید یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ میں ہل کمرے اور سڑیچ کا منظر دیکھ سکوں۔

میں نے بلند آواز میں چیخ کر کہا۔

”تم لوگ کون ہو؟ مجھے کس لیے جکڑا ہوا ہے؟“

میرے بار بار شور مچانے پر پردے کے پیچھے سے ایک سفید لمبے کوٹ والا ڈاکٹر نما آدمی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیکہ لگانے والی سرنج تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے بغیر کچھ کہے میری گردن میں انجکشن لگا دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

”ڈاکٹر! یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

اس کے بعد میرے گلے کی رگیں جیسے خشک ہو گئیں۔ میں نے بولنا چاہا تو میری آواز نہیں نکلتی تھی۔ ان لوگوں نے میری آواز بند کرنے کے لیے کوئی خاص ٹیکہ لگا دیا

تھا۔ اب میں صرف دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ میں بے بسی کے عالم میں سڑیچ پر جکڑا ہل میں بیٹھے ہوئے رنگ برنگ کپڑوں والی عورتوں اور مردوں کو دیکھتا اور کبھی سڑیچ کو دیکھتا جنہاں چار پانچ جشیوں نے پتھر کی ایک لمبوڑھی میز لا کر بچھا دی تھی۔ میں یہ دیکھ کر مزید حیران ہوا کہ اس میز کی دونوں جانب چمڑے کے چوڑے تسمے لٹک رہے تھے۔ جیسے اس میز پر کسی کو لٹا کر باندھا جانے والا ہو۔ جیسی میز بچھا کر چلے گئے۔

ہل کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے باتیں کرنی بند کر دیں۔ کچھ ہونے والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اگلے صوفوں پر سرخ اور کاسی رنگ کی ساڑھیوں میں لمبوس زیادہ تر بوڑھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ہل میں کافی روشنی تھی۔ اسنے میں سڑیچ پر ایک جانب سے پردہ ہٹا اور وہی منحوس جاگیردارنی نمودار ہوئی جس نے مجھے عیاری سے حویلی میں لے جا کر بے ہوش کر دینے والی چائے پلائی تھی۔ میں نے چیخ کر اس کو گالیاں دینی چاہیں مگر میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جاگیردارنی بڑی شاندار سرخ ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ سفید ہاتھوں کا جوڑا بنا کر اس نے جوڑے میں سرخ پھول سجائے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی لمبی چھری تھی۔ اس نے میرے سڑیچ کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سڑیچ پر نمودار ہوتے ہی ہل تالیوں سے گونج اٹھا۔ جاگیردارنی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ جب ہل میں سناٹا طاری ہو گیا تو جاگیردارنی نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جھو! مترو! میرے دوستو! ہماری کلا سوتا کلب کے ممبرو! اور عشق و محبت کے دیوتا کلام دیوتا کے پجاریو! یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے۔ بڑے سوھاگ ہیں کہ آج کی رات ہم ایک بار پھر عشق و محبت کے دیوتا کے آگے عورت مرد کے اصل پیار کا تحفہ پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس دفعہ بھی ہم پریم دیوتا کے چہلوں میں دو بار پریم کا تحفہ پیش کریں گے۔ عورت مرد کے پیار کی

یہ سجاو آج جی ہے کل رات کو بھی تھے گی۔

اس پر سارا ہل تلیوں اور لوگوں کے خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ جب لوگ خاموش ہو گئے تو جاکیر دانی نے کہل۔

”اس کے ساتھ ہی میں کلاس سوترا کی کاروائی شروع کرنے کا اعلان کرتی ہوں۔ سب سے پہلے ہماری سجا کی پرانی رسم کے مطابق سب ممبروں کی خدمت میں سوم رس پیش کیا جائے گا اور سوم رس الگینڈ سے خاص طور پر منگوائی گئی سلج و سکی یعنی اعلیٰ ترین شراب کی شکل میں آپ کو پیش کیا جائے گا۔“

سارا ہل نعروں، سیٹیوں اور تلیوں سے ایک بار پھر گونج اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اگلی قطار کے صوفوں پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں زیادہ جوش و خروش سے تلیاں بجا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کلاس سوترا سجا کس قسم کی ہیں اور یہ لوگ یہاں کس انداز میں عشق و محبت کا ڈرامہ کھیلنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی سمجھ سکا کہ یہاں کھلے بندوں عورت مرد کے پیار محبت کے منظر دکھائے جائیں گے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں دل میں ان شیطان صفت لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جو عورت مرد کے جنسی متاع کو اس طرح کھلے بندوں دکھانے والے تھے۔ جس قسم کا بھیاک کھیل وہاں کھیلا جائے والا تھا اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا بلکہ میں اس کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جاکیر دانی نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی۔ ہل کے مختلف دروازوں میں سے نیم عریاں لڑکیاں شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے ٹرے لے کر ہل میں داخل ہو گئیں اور حاضرین کو شیشے کے گلاسوں میں شراب ڈال ڈال کر دینے لگیں۔ لوگ بڑے مزے سے شراب کی چسکیں لگانے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔ اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں بھی خوب مزے لے لے کر شراب کی چسکیں لگا رہی تھیں۔ میں یہ سارا شیطان منہر ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جاکیر دانی بھی سنج سے اتر کر اگلی قطار والی عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بھی شراب سے بھرا ہوا گلاس تھا اور وہ چسکیں لگا رہی تھی۔ اس دوران وہ کالے جیشوں نے سنج کے درمیان میں بیٹھی ہوئی سبک مرمر کی لمبوتری میز کی ایک طرف چھوٹی میز لا کر رکھ دی تھی۔ جشی سنج کی ایک طرف شین گئیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک سفید کوٹ والا آدمی آیا جس نے مجھے انجکشن دیا تھا اور میری آواز بند ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید ٹرے تھا۔ ٹرے میں آپریشن کرنے والی چھریاں چاقو دیکھ کر میرا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ کہیں یہ لوگ مجھے ازیتیں دے دے کر ہلاک تو نہیں کرنے لگے؟ میں تو اپنا پچلو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوف سے جڑے ہونٹ خشک ہو گئے۔ وہ آدمی چھریوں، چاقوؤں والا ٹرے چھوٹی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ ہل کی روشنیاں تھوڑی تھوڑی مدھم کر دی گئیں۔ ہل کمرے میں سسکرت کے اشلوک پڑھنے کا میزک بلند ہوا۔ عورتیں اور مرد اس کے ساتھ ساتھ گانے لگے۔ جاکیر دانی بھی جھوم جھوم کر گا رہی تھی۔ پھر میزک ایک دم ختم گیا۔ سنج پر روشنی زیادہ کر دی گئی۔ جاکیر دانی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

”کلاس سوترا سجا کے سجا دیوتا کی پوجا شروع ہوتی ہے۔“

سیٹیکوں پر کھٹکروؤں کی چمن چمن سے سارا ہل گونج اٹھا۔ اچانک ایک جانب سے پردہ ہٹا اور ایک عورت بنم عریاں لباس میں کھٹکرو چھٹکائی رقص کرتی سنج پر نمودار ہو گئی۔ اس نے سنج کے کنارے پر جا کر ہل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جھک کر پرہم کیا اور سنج کے وسط میں آکر رقص شروع کر دیا۔ سنج پر کلنی روشنی تھی۔ میں نے اس رقص کو فوراً ”پچپن لیا۔ یہ دھن تھی۔ وہی عورت جس نے مجھے جاکیر دانی کے دیوانہ خانے میں چائے لا کر دی تھی اور وہ تین بار اشاروں کے ساتھ چائے پینے سے منع کیا تھا دھن کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے چائے پینے سے کیوں منع کیا تھا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اگر میں اس وقت اس کی ہدایت پر عمل کرتا اور چائے نہ پیتا تو اس عذاب سے بچ سکتا تھا جس میں اب مجھیں چکا تھا۔ دھن رقص کرتے کرتے میرے قریب سے بھی گزری۔ میرے منہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس

نے اپنی چال اور مدھم کر لی۔ میری طرف دیکھ کر ایک بار آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں اور سر کو ذرا سی جنبش دے کر آگے نکل گئی۔ ایسا اس نے کئی بار کیا۔ ہر بار وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب آ کر رک سی جاتی۔ آنکھیں تین چار بار جھپکتی اور آگے نکل جاتی۔ شاید وہ اس وقت بھی مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں سمجھ نہیں رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن کی حالت بے حد الٹ پلٹ ہو چکی تھی۔ وہشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ساری تیاریاں مجھے ہلاک کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ ہل میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تائیاں بجانا شروع کر دیں۔ کسی نے بلند آواز میں کہا۔

”کھلا سوترا شروع کیا جائے۔“

جاگیردارنی نے یہ سنتے ہی اپنا چھڑی والا ہاتھ اونچا اٹھا کر اعلان کیا۔

”کھلا سوترا شروع کیا جاتا ہے۔“

یہ سنتے ہی دشالی رقص کرتی سنیج سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد سنیج کی دونوں جانب سے مرد اور عورتوں کے دو جوڑے نکل کر سامنے آ گئے۔ ایک مرد عورت ایک جانب سے ایک مرد اور عورت دوسری جانب سے آئے تھے۔ دونوں مرد گیروے رنگ کی سلوہوؤں والے لباس میں تھے۔ عورتوں نے سرخ ریشمی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر لوگ بے تحاشا تائیاں بجانے اور آواز نکالنے لگے۔ دونوں مرد عورت کے جوڑے سنیج پر چھٹی ہوئی لمبی میز کے ارد گرد دائرے کی شکل میں رقص کر رہے تھے۔ ان چاروں کے پاؤں میں گھنگھرو تھے۔ مرد بھی عورتوں کی طرح ڈانس کر رہے تھے۔ ناچتے ناچتے کبھی وہ بالکل ایک دوسرے کے ساتھ لگ جلتے۔ مرد عورت کا اور عورت مرد کا ہاتھ تمام لیتی اور اسی طرح چکر لگا کر ٹپٹا شروع کر دیتے۔ ناچتے ناچتے عورتوں نے اپنا لباس اتارنا شروع کر دیا۔ مردوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد سنیج کی روشنی ایک دم سرخ ہو گئی اور پھر سنیج پر جو شیطان ڈرامہ شروع ہوا۔ اس نے اخلاق و تہذیب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے

خیال آیا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟

ہل میں سے بھی کچھ عورتیں اور مرد سنیج پر آ گئے اور وہ بھی سنیج پر کھیلے جانے والے شیطان کھیل میں شریک ہو گئے۔ یہ ڈرامہ دیر تک ہوتا رہا۔ پھر سب عورتیں اور مرد سنیج پر سے چلے گئے۔ سنیج کی روشنی تیز کر دی گئی۔ جاگیردارنی نے اعلان کیا۔

”کھلا سوترا کے پچاریو! اب کام دیوتا کے چرنوں میں خاص تحفہ بھیجتا کیا جاتا ہے۔“

ہل میں ایک دم موت ایسا سا ظاری ہو گیا۔ میں یہی سمجھا کہ اب میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن سنیج کا پردہ اٹھا اور دو جھٹی ایک آدمی کو اس حالت میں سنیج پر لائے کہ جشیوں نے اس کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آدمی نیم جان تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ جھٹی اسے گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ بد نصیب بالکل نکا تھا۔ اس کے آتے ہی ہل ایک بار پھر تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ جشیوں نے اس آدمی کو سنگ مرمر کی لمبی میز پر لٹا کر اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کو تسوں سے جکڑ دیا اور جلدی سے پیچھے ہٹ کر سنیج سے اتر گئے۔ اب سنیج پر صرف وہی ایک بد نصیب میز پر جکڑا ہوا رہ گیا تھا جس کے ساتھ نہ جانے کس قسم کا وحیاندہ سلوک ہونے والا تھا۔

جاگیردارنی نے چھڑی بلند کر کے ایک اشلوک پڑھا اور بلند آواز میں کہا۔

”کھلم دیوتا کو ہماری بھیجتا سوینکار ہو۔“

سارے ہل نے لوہی آواز میں کہا۔

”سوینکار ہو! سوینکار ہو!“

جاگیردارنی نے حکم دیا۔

”کھلم دیوتا کی پوجا شروع ہو۔“

سنیج کی روشنی ایک دم زیادہ تیز ہو گئی۔

ایک جانب سے وہی آدمی جس نے مجھے انجشن لگایا تھا نمودار ہوا۔ مگر اب اس

آرمیا اور اس کے پاؤں کی فٹخوں کے قریب سے رگیں کٹ ڈالیں۔ بد نصیب آدمی کے حلق سے ایک نور بھیانک چمک بلند ہوئی اور خون کے فوارے نکلنے لگے۔ پھر اس کی راتوں پر سے چھری کی مدد سے گوشت کے لوتھڑے اتارنے جلنے لگے۔ مجھے اس بد نصیب کی سفید ہڈیاں نظر آئیں تو دہشت کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی چیخوں سے ہل گونج رہا تھا۔ لوگ سبک دلائے محویت سے یہ خونیں منظر دیکھ رہے تھے۔

جلاد ڈاکٹر جب زندہ انسان کی دونوں ٹانگوں کا گوشت کھرج کھرج کر اتار چکا تو پھر اس کے پیٹ میں دھنسنے ہوئے نشتر کو نکل کر ٹرے میں رکھ دیا اور چھری سے اس کے پیٹ کو اوپر سے نیچے تک کٹ کر کھول دیا اور ساری استریاں نکل کر سٹیج پر اچھل دیں اور ”جے کلام دیوتا کی“ کا نعرہ لگایا۔ ہل میں سارے تماشا بین نعرے لگاتے لگے۔

”جے ہو کلام دیوتا کی“ جے ہو کلام دیوتا کی۔“

خوف کے مارے میرا اپنا برا حال ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بعد میری باری آنے والی ہے۔ سیاہ پوش جلاد نے اس کے بعد چاقو سے ایک ایک کر کے اس کی دونوں آنکھیں نکل دیں۔ اس وقت وہ بد نصیب شاید مر چکا تھا کیونکہ پھر اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ موت نے آخر اسے اس بھیانک اذیت سے نجات دلا دی۔ جلاد نے مرے ہوئے آدمی کی گردن آری سے کٹ کر الگ کر دی اور اس کے سر کو لوگوں کی طرف اچھل کر فوٹ لگایا۔

”جے بجزنگ ملی! جے بجزنگ ملی۔“

لوگ بد نصیب انسان کے سر کو ایک دوسرے کی طرف اچھلنے اور نعرے لگانے

لگے۔ جاگیر دارانی نے اس وقت اٹھ کر اعلان کیا۔

”کھاسو ترا سبھا کے ممبوا! میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہوں کہ کل اسی وقت اسی جگہ ایک بار پھر کلام دیوتا کے چرنوں میں قربانی پیش کی جائے گی اور کل جس آدمی کو کلام دیوتا پر قربان کیا جائے گا وہ آپ لوگوں کے سامنے شہر بھر پر موجود ہے۔“

نے سفید کی بجائے کالا کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر سرخ روبل بندھا ہوا تھا۔ وہ اس میز کے سرہانے کی طرف آ کر کھڑا ہو گیا جس میں خوف زدہ بد نصیب انسان کو لٹا کر جکڑا ہوا تھا۔ اس آدمی کی دہشت کے مارے پوری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ عجیب قسم کی خشک اور بیٹھی ہوئی آواز میں وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

”مجھ پر رحم کرو، مجھ پر رحم کرو، مجھ پر رحم کرو۔“

لیکن شیطانی طوفان کے غار خانے میں اس بے چارے کی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔ سیاہ کپڑوں والے جلاد نے ”میں اسے جلاد ہی کہوں گا“ ٹرے میں سے ایک قیمتی اٹھالی اور بد نصیب انسان کی طرف بڑھل۔ وہ میز کے عقب میں آ گیا تاکہ سامنے ہل میں بیٹھے ہوئے لوگ درندگی اور بربریت کا مظاہرہ دیکھ سکیں۔ اس نے قیمتی سے اس آدمی کے سر کے ہل تیزی سے کٹنے شروع کر دیے۔ جب وہ کلن ہل کٹ چکا تو قیمتی میز پر رکھ دی اور ٹرے میں سے ایک نشتر اٹھایا اور بد نصیب انسان کے پیٹ کو ایک ہاتھ سے دبائے لگا۔

بد نصیب آدمی روتے ہوئے خشک آواز میں چلا رہا تھا۔

”مجھ پر رحم کرو، مجھ پر رحم کرو۔“

کالے کپڑوں والے جلاد نے میرے دیکھتے دیکھتے آدمی کے پیٹ میں نشتر زور سے گھونپ دیا۔ آدمی کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ ایسی تھی جیسے بکے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہے۔ اس چیخ کی آواز پر لوگوں نے زور زور سے تلبلیں بجائیں اور نعرے لگانے شروع کر دیے۔ جاگیر دارانی نے چھری دلا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”جنا کلام دیوتا کی بھیٹ پر شور نہ کرو۔“

آدمی کے پیٹ سے خون ابل ابل کر سٹیج پر گر رہا تھا۔ جلاد نے نشتر کو بد نصیب کے پیٹ میں ہی آدھا دھنسا ہوا رہنے دیا اور اٹھ کر ٹرے میں سے ایک لمبی اور تیز دھار والی چھری اٹھالی۔ چھری کو لہرا لہرا کر لوگوں کو دکھایا۔ میز پر لیٹے دائیں بائیں شدت درد کے عالم میں سرمارتے اور بلبلاتے ہوئے بد نصیب آدمی کے پاؤں کی طرف

جاگیرداری نے چھری سے میری طرف اشارہ کیا۔ ہل میں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ”اس کو بھی آج ہی قربان کیا جائے۔“
جاگیرداری نے کہا۔

”نہیں دوستو! یہ قربانی کل آدمی رات کے بعد ادا کی جائے گی۔ کل آپ سب لوگ آج ہی کی طرح یہاں پہنچ جائیں۔ اب قربانی کی رسم ختم ہوتی ہے۔ بے ہو کام دیوتا کی۔“

سب لوگوں نے جواب میں زور سے نعرہ لگایا۔
”بے ہو کام دیوتا کی۔“

میری جان بچ گئی تھی مگر صرف ایک رات کے لیے۔ یہ سن کر میری جان آدمی نکل گئی تھی کہ کل مجھے قربان کیا جائے گا۔ یعنی کل اسی طرح میری ٹانگوں کا گوشت بھی کراچا جائے والا تھا اور میری بھی آنکھیں نکل جانے والی تھیں اور میرا سر بھی کاٹ کر لوگوں کی طرف اچھلا جائے والا تھا۔ کیا میرا یہی ہولناک انجام ہونا تھا؟ میں نے دل میں غور کیا۔ پھر جیسے کسی نے مجھے غیبی آواز میں کہا۔ نہیں کرم داد! تمہارا یہ انجام نہیں ہوگا، خدا تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن خدا میری کس طرح مدد کرے گا۔ اس کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

دونوں جہتی میری طرف بڑھے۔ انہوں نے میرے سترچر کو سیدھا کیا اور اسے چلاتے ہوئے واپس اسی کمرے میں لے آئے جہاں پہلے میرا سترچر پڑا تھا۔ سترچر دیوار کے ساتھ لگا کر دونوں جہتی باہر نکل گئے۔ باہر سے مجھے تالا لگنے کی آواز آئی تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ میرا حسرت ناک انجام میرے سامنے تھا۔ اب مجھے سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی اس درندہ صفت، اذیت ناک موت سے نہیں بچا سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے کھانسی آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرا گلا جیسے کھل گیا۔ میں نے آواز نکالی تو میں بول سکتا تھا۔ الجھن کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب میرا بولنا میرا سنتا صرف اس رات اور اگلے دن تک ہی تھا۔ دوسرے روز رات کو مجھے جلا کے

سرد کیا جاتا تھا۔

میں سترچر پر جکڑا ہوا کسی کی حالت میں پڑا خدا کو یاد کر رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے اس عذاب سے بچالے۔ کمرے کے اندر نور باہر ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خون سرد کر دینے والی آہستی خاموشی میں مجھے کسی چیز کے چرچانے کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے سانس روک کر اس آواز پر کلن لگا دیے۔ آواز رک گئی۔ دو تین سیکنڈ کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی چوہا کسی کونے کھدوے میں ہڈی وغیرہ چھچھوڑ رہا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کوئی تختہ آہستہ سے ایک طرف کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں آہٹ نور لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ ساری آوازیں جدھر سترچر کا سر تھا اس طرف سے آرہی تھیں۔ میں اس طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اچانک کمرے کی تہدار فضا ایک خاص قسم کی گہری خوشبو سے بھر گئی۔ یہ خوشبو مجھے پہلی بار اس وقت محسوس ہوئی تھی جب جاگیرداری کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے خلاصہ و شملی نے جھک کر میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی دی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”وشملی! کیا یہ تم ہو؟“

کسی نے جلدی سے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ان ہاتھوں سے حنا اور عطر کی تیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔
”خاموش رہو۔“

”وہ میرے سامنے آگئی۔ وہ وشلی ہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی میرے سترچر کے تسمے کھولنے شروع کر دیے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وشلی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہاتھ سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں سترچر سے اتر آیا تھا۔ وشلی کمرے کے کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ مگر وہ بیٹھی نہیں تھی، کونے میں ایک جگہ سے فرش کی چوکور سل اٹھی ہوئی تھی۔ وہاں نیچے کسی تسمے خانے کو زینہ جاتا تھا۔ وشلی زینے میں اترتی ہوئی تھی اور اشارے سے کہہ رہی تھی کہ میرے پیچھے

آ جاؤ۔ وہ میڑھیاں اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے میڑھیاں اتر گیا۔ وہ میڑھیوں میں کھڑی تھی۔ میڑھیوں میں اندھیرا تھا اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”پھر کی سل فرش میں والیں اپنی جگہ پر رکھ دو۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے سل کو آہستہ سے اٹھایا اور میڑھیوں میں بیٹھ کر سل کو چوکور سوراخ کے اوپر جما کر رکھ دیا۔ دھلی نے کہا۔

”جلدی سے آؤ۔“

میں ٹوٹا ہوا میڑھیاں اترنے لگا۔ دس گیارہ میڑھیاں تھیں۔ گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دھلی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے کہا۔

”خاموش رہو۔“

اور وہ مجھے لے کر چلے گئی۔ اسے راستے کی شناخت تھی۔ وہ بغیر رکے چل رہی تھی۔ ہم کچھ قدم چلنے کے بعد ایک طرف مڑ گئے۔ یہ کوئی سڑک تھی کہ راہ داری تھی کہ عمارت خدا جانے کیا جگہ تھی۔ وہاں سلیں کی بو تھی اور سخت جس تھا۔ دھلی اگرچہ قدم قدم چل رہی تھی مگر بغیر رکے چل رہی تھی۔ زمین نیچے ہوتی گئی۔ آگے نشیب تھا۔ پندرہ بیس قدم گہرائی میں اترنے کے بعد آگے پھر زمین کی چڑھائی آگئی۔ اس کو عبور کیا تو زمین ہموار ہو گئی۔ اس دوران وہاں اس قدر گہری تاریکی تھی کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھلی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ وہ بالکل میرے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس کے سانس چلنے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا بات ہوئی ہے دھلی۔“

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے کچھ نہ پوچھا۔ خاموش ہو گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ فاصلے پر کوئی جانور خرخر کر رہا ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد یہ خرخر غراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر ہلکی سی گرج سنائی دی۔ میں نے

پہچان لیا۔ یہ شیر کی آواز تھی۔ تو کیا آگے کوئی شیر بیٹھا تھا اس خیال نے مجھے یوں کر دبا۔ لب ہلکا آگے جانا عمل تھا۔ پیچھے بھی موت تھی، آگے بھی موت تھی۔ شیر کی گرج آہستہ آہستہ غراہٹ میں بدلتی گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ دھلی نے میرے کان میں کہا۔

”آ جاؤ، کوئی آواز نہ نکلتا۔ بس اسی طرح میرے ساتھ لگ کر قدم قدم چلے چلو۔“

میں بالکل اس کے ساتھ لگ کر بیٹھا آوی کی طرح چلنے لگا۔ یہ عمارت یا جو کچھ بھی تھا وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے ایسی بو آنے لگی جیسی بو چڑیا گھروں میں جانوروں خاص طور پر شیر کے خیرے سے آیا کرتی ہے۔ یہ شیر کی بو تھی۔ ہم شیر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دھلی مجھے اپنے ساتھ آگے چلاتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ پھر دیوار پر ہاتھ رکھ کر بیٹی آہنگی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شیر کی بو تیز ہو گئی تھی۔ کچھ قدم اٹھانے کے بعد شیر کے ہانپنے کی آواز آنے لگی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں شیر کے خیرے میں سے گزر رہا ہوں۔ شیر ایک بار پھر غریلا۔ میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ خوف سے ہاتھ سرد ہو گئے۔ دھلی ایک سیکنڈ کے لیے بھی رکی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ایک بار پھر دھلی آ گئی۔ دس بارہ قدم چلنے کے بعد پھر زمین لوٹتی ہو گئی۔ جیسے ہی زمین لوٹتی ہوئی باہر کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کا جھوٹا طہرے جسموں کو چھو کر گزر گیا۔ دھلی نے دھبی آواز میں کہا۔

”ہم باہر نکل رہے ہیں کوئی بات نہ کرنا باہر پرے دار ہو سکتے ہیں۔“

چلے چلے دھلی ٹھہر گئی۔ سرگوشی میں بولی۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں باہر کوئی پرے دار تو نہیں۔“

مجھے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ کھڑے کر کے وہ چلی گئی۔ میں بت بٹا اندھیرے میں کھڑا رہا۔ باہر کی طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا کے جھوٹے آ رہے تھے جن کی وجہ

کے شکتے سے کام لیتا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے قریب آیا اس نے میری آہٹ سن لی اور پلٹ کر دیکھل میں اندھیرے میں اسے نظر آگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بدوق سے نبھتا اس کی گردن میرے بازو کے شکتے میں تھی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اپنی کلائی کے نیچے رکھ کر زور سے اوپر کو جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کامٹا ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے اسے اپنے سے الگ کر دیا۔ وہ گر پڑا۔

دشلی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے ایک جگہ رکنے کو کہا تھا۔ یہ راز بھی بعد میں کھلا کہ دشلی مجھے اپنی نظروں سے کیوں اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ دشلی میرے پاس آ کر زمین پر گرے ہوئے پرے دار کو دیکھنے لگی۔

”تم نے اسے کیسے مارا؟“

میں نے کہا

”یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم ٹھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کھلی جگہ پر آ گئے جہاں دریا کی طرف سے ٹھٹھے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے دشلی سے کہا۔

”آگے دریا ہے شاید۔ کیا وہاں ہمیں کوئی کشتی وغیرہ مل جائے گی؟“

اس نے کہا

”فکر نہ کرو مجھے معلوم ہے جاگیر دارانی کی کشتی کس جگہ پر ہوتی ہے۔“

دریا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک طرف دریا کا گھٹ تھا جہاں لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کشتی ری سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم اس کشتی میں بیٹھ گئے۔ میں نے چو سنبھل لیے۔ دشلی نے مجھ سے پوچھا۔

”تم کس طرف جانا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا

”یہ میں تمہیں دریا پار کرنے کے بعد بتاؤں گا۔“

سے جس اور گرمی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دشلی مجھے موت کے منہ سے نکال کر لے آئی ہے۔ یہ ایک معجزہ ہی ہو گیا تھا۔ ورنہ میرا بچنا ناممکن تھا۔ خدا نے مجھے بچا لیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد دشلی کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی وہ آگئی تھی۔ اس نے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر کہا۔

”باہر ایک پرے دار بیٹھا ہے۔“

یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ مگر یہ مصیبت میرے لیے اتنی مشکل نہیں تھی۔ میں نے دشلی سے کہا

”مجھے وہاں تک لے چلو۔ میں اس کو ایک سیکنڈ میں ٹھکانے لگاتا ہوں۔“

اس نے آہستہ سے کہا

”اس کے پاس بدوق ہے۔“

میں نے کہا

”تم مجھے لے چلو۔“

ہم غار میں آگے چل پڑے۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے تاکہ ہمارے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے اور پرے دار ہوشیار ہو کر ہم پر فائر نہ کر دے۔ ہم اس زمین دوز غار کے دہانے کے قریب آ گئے تھے۔ باہر سے رات کے کھلے آسمان کی دھندلی دھندلی روشنی سفید کرے کی مانند نظر آنے لگی تھی۔ غار کے منہ پر ایک جانب مجھے ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ رات کی پھلکی دھند میں مجھے اس کا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی سٹول یا پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بدوق مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دشلی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود مسلح پرے دار کی طرف بڑھا۔ مجھے اسے اس طرح دوچٹا تھا کہ نہ وہ آواز نکال سکے نہ گھبراہٹ میں بدوق کا فائر کر سکے۔ یہ مجھے علم تھا کہ یہ کوئی تربیت یافتہ فوجی نہیں ہے۔ صرف اتنی احتیاط کی ضرورت تھی کہ میرے پاؤں کی چاپ سن کر وہ ہوشیار نہ ہو جائے اور فائر نہ کر دے۔ میں اندھیرے میں جھک کر چل رہا تھا۔ مجھے صرف خلی ہاتھوں اور اپنے بازوؤں

میں نے کہا۔

”انشاء اللہ ایسی بات نہیں ہوگی۔“

میرے منہ سے بے اختیار انشاء اللہ نکل گیا تھا۔ کہنے لگی۔

”ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ تم مسلمان ہو۔ یہ بات جاگیروانی کو بھی معلوم ہو گئی

تھی۔ اب تمہارے منہ سے اللہ کا لفظ سن کر یقین ہو گیا کہ تم واقعی مسلمان ہو۔“

میں نے کہا۔

”الحمد للہ! میں مسلمان ہوں و شلیل۔“

اس نے پوچھا۔

”تم آدمی رات کے وقت شر سے نکل کر اس طرف کیا کرنے آ گئے تھے؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم دوار کا سے کہاں جا رہے تھے؟“

میں نے اسے اپنا مسلمانوں والا فرضی نام بتا دیا اور رات کے وقت دوار کا شر سے نکلنے کی ایک جھوٹی کہانی بھی گھڑ کر سنا دی۔ و شلیل نے یقین کر لیا۔ کہنے لگی۔

”کشتی بائیں طرف جا رہی ہے اس کو سیدھ میں دکھو۔ ابھی دوسرے کنارے پر ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ موجود ہے۔“

میں نے چپو ہلاتے ہوئے کشتی کو دریا کے رخ پر سیدھ میں کر لیا۔ کشتی دریا کی تیز لہروں کے ساتھ تیزی سے بہتی چلی جا رہی تھی۔ رات کے وحند لے اندھیرے میں دریا کا پاٹ دور تک خلی تھا۔ جب کافی دیر تک کشتی دریا میں بہو کے ساتھ بہتی چلی گئی تو و شلیل نے کہا۔

”یہاں سے کشتی کنارے کی طرف لے چلو۔“

میں نے کشتی کا رخ کنارے کی طرف کر دیا اور چپو چلائے لگا۔ کشتی دوسرے کنارے تک پہنچنے پہنچنے کافی آگے نکل آئی تھی۔ دریا کا دوسرا کنارہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی گھٹا وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ ایک بھی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے و شلیل سے کہا۔

و شلیل نے کہا۔

”دریا پار جاگیروانی کے جیٹی ٹکڑوں کا گھون ہے۔ وہ لوگ رات کو بھی جاگ کر

گھٹ گھٹاتے رہتے ہیں کہ کس جاگیروانی کا کوئی ملازم فرار ہو کر دریا پار نہ کر لے۔“

میں یہ سن کر فکر مند ضرور ہوا لیکن دریا مجھے ہر حالت میں پار کرنا تھا۔ و شلیل نے مجھے قلی دیتے ہوئے کہا۔

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہاری جان بچائی ہے تو تمہیں تمہاری جمل تک پہنچا کر اپنے گھون جھون کی۔“

میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے واپس کیوں نہیں چلی جاتی۔ وہ بولی۔

”جب میرے لیے جاگیروانی کی حویلی میں سوائے قوت ناک موت کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں کیسے وہاں جا سکتی ہوں۔ اس کو تو صبح ہوتے ہی پتہ چل جائے گا کہ تم فرار ہو چکے ہو اور میں تمہیں فرار کروا کر اپنے ساتھ لے گئی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”اگر دریا پار جاگیروانی کے جیٹی سپاہیوں کی جیٹی پارٹیاں پہرے پر ہوتی ہیں تو ہمیں آگے جا کر دریا پار کرنا چاہیے۔“

و بولی۔

”ہم یہاں ہی کریں گے۔ ہم دریا کے بہو کے ساتھ ساتھ چھ سات میل آگے نکل جائیں گے۔ وہاں سے ہم دریا پار کر لیں گے۔ پھر کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

ہماری کشتی دریا کے بہو کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

”جیٹی کو اپنے کچھ میں رکھو۔ جس وقت میں کہوں فوراً جیٹی کا رخ دوسرے کنارے کی طرف موڑ دیتا۔ اگر کشتی پر کچھ نہ رہا تو آگے سمندر ہے۔ یہ دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ وہاں دلدلیں بھی ہیں۔ ایک بار ہماری کشتی ان میں پھنس گئی تو زندہ نہ بچ سکیں گے۔“

”اس لیے کہ تم مجھے بڑے اچھے لگے تھے۔ جب پہلی بار میں نے تمہیں جاگیردارنی کے دیوان خانے میں دیکھا تو میں تم پر عاشق ہو گئی تھی۔ میں کسی زمانے میں ایک مندر کی دیوہاسی ہوا کرتی تھی۔ جاگیردارنی وہاں سے مجھے خرید کر اپنی حویلی میں لے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جاگیردارنی تمہیں وہاں کس لیے لائی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے دو ایک بار اشاروں سے تمہیں چائے پینے سے منع کیا مگر تم سمجھ نہ سکے۔ لیکن میں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ تمہیں مرنے نہیں دوں گی اور اس خونی حویلی سے نکل کر لے جاؤں گی۔“

میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”تمہیں میری کون سی شے اچھی لگی تھی؟“

اس نے میرا ہاتھ تھوڑا سا دھیرا اور کہنے لگی۔

”تم ایسا بھرپور جوان مرد اس سے پہلے میں نے حویلی میں نہیں دیکھا تھا۔ تم خوبصورت بھی تھے اور تمہارا رنگ بھی کالا نہیں تھا۔ مجھے تمہارے نین نقش اور رنگ بھا گیا تھا‘ بس۔۔۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تمہارے سامنے ہے۔“

میرے مردانہ احاسات کو قدرتی طور پر وشلی کی ان باتوں سے بڑی تسکین مل رہی تھی۔ لیکن میرا ذہن کسی اور ہی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے کاٹھیاواڑ کے شہر میں پہنچنا تھا جہاں سے میں آسانی کے ساتھ بھوپال جاسکتا تھا۔ میں نے وشلی سے کہا۔

”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ کیا آگے کوئی ایسا گاؤں وغیرہ ہے جہاں سے مجھے کسی شریک کوئی لاری وغیرہ مل جائے؟ اور تم کہاں جانا چاہو گی؟ کیا واپس اپنے پرانے مندر میں جاؤ گی؟“

وشلی نے آہ بھر کر کہا۔

”میں اپنے پرانے مندر میں گئی تو جاگیردارنی کے آدمی بڑی آسانی سے وہاں آکر مجھے قتل کر جائیں گے۔“

”تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟“

”وشلی! تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اب مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں سے کاٹھیاواڑ کی طرف کون سا راستہ جائے گا۔ کاٹھیاواڑ میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں کچھ دن اس کے پاس رہوں گا۔ اس کے بعد دلی کی طرف چلا جاؤں گا۔ دلی میں میری چھوٹی سی دکان ہے۔“

وشلی نے کہا۔

”یہاں سے کوئی راستہ کاٹھیاواڑ کی طرف نہیں جاتا۔ یہ سارا علاقہ جاگیردارنی کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں کے گھوڑوں میں اس کے جشی غلاموں کی آہلی زیادہ ہے۔ جاگیردارنی ہمیں ہر قیمت پر ہلاک کرنا چاہے گی۔ کیونکہ ہم دونوں اس کی حویلی کا ایک ایسا خونی راز لے کر فرار ہوئے ہیں جو جاگیردارنی کو پھانسی کے تختے تک لے جاسکتی ہے۔ تم اکیلے اس علاقے میں نکلے تو جاگیردارنی کے خونخوار کتے اور آدمی تمہیں کسی نہ کسی جگہ ضرور دیوچ لیں گے۔“

میں نے سوچا وشلی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے میں تو جاگیردارنی کے ایک انتہائی گھناؤنے خونی راز کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں چاہے پولیس کو خبر کروں یا نہ کروں لیکن جاگیردارنی تو یہی سوچے گی کہ میں پولیس کو جا کر رپورٹ کر سکتا ہوں کہ جاگیردارنی کی حویلی میں ہر ماہ خونی ڈامہ کھیلا جاتا ہے۔ وشلی اپنی جگہ پر کچی تھی۔ میری خاطر اس نے بھی جاگیردارنی کی حویلی سے دہس نکالنے لیا تھا۔ اب وہ بھی واپس نہیں جاسکتی تھی اور اس کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ جاگیردارنی اسے ہر قیمت پر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں وشلی کی اس قربانی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ سکا تھا کہ اس نے محض انسانی ہمدردی کی خاطر ایسا کیا ہے اور مجھے ایک اذیت ناک موت سے بچایا ہے۔ آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”وشلی! تم نے میری خاطر اپنی زندگی اتنے بڑے خطرے میں کیوں ڈالی ہے۔“

ہم دریا کے کنارے آگئے تھے۔ میں نے کشی کو چھوڑ دیا تھا اور ہم دونوں دریا کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ وشلی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

وہ بولی۔

”یہاں سے آگے ایک جنگل ہے۔ اس جنگل میں میری ایک سیلی کا گھون ہے۔ یہ گھون پہاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہاں باہر سے کوئی نہیں آ سکتا۔ تم بھی میرے ساتھ وہاں چلے چلو۔ کچھ دن وہاں رہنا۔ وہاں سے ہر ہفتے گھون کی عورتیں تیل گاڑی میں بیٹھ کر اگلے گھون جاتی ہیں۔ تم اس تیل گاڑی میں سوار ہو کر اگلے گھون چلے جانا وہاں سے تمہیں کاٹھیاواڑ جانے والی کوئی لاری ضرور مل جائے گی۔ وہاں شہر سے لاریاں آتی جاتی رہتی ہیں۔“

مجھے امید کی کوئی صورت نظر آئی۔ مگر میں وشلی کی سیلی کے گھون میں اتنے دن قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہاری سیلی کے گھون میں ایک آدھ دن رہ کر خود تیل گاڑی لے کر اگلے گھون چلا جاؤں؟“
وشلی نے جواب دیا۔

”تیل گاڑی ہفتے میں صرف ایک دن ہی جاتی ہے اور اسے میری سیلی دکھتا کا خولند ہی چلاتا ہے۔ آگے راستہ پہاڑی جنگلوں میں سے ہو کر جاتا ہے اور بڑا خطرناک راستہ ہے۔ وہاں جنگلی درندے حملہ کر دیتے ہیں۔ میری سیلی دکھتا کا مالک جنگل کے خفیہ راستوں سے واقف ہے۔ وہ تیل گاڑی خفیہ راستوں سے لے کر جاتا ہے۔ تم اکیلے جاؤ گے تو کسی شیر باگھ کا شکار ہو جاؤ گے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ چلو ایک ہفتہ کوئی زیادہ مدت نہیں ہے۔ اتنی دیر وشلی کی سیلی کے گھون میں رہ لوں گا۔ کم از کم میں کاٹھیاواڑ تو بحفاظت پہنچ سکوں گا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے وشلی! تم جیسے کہتی ہو میں ویسے ہی کروں گا۔“

وشلی چلتے چلتے بالکل میرے ساتھ لگ گئی اور بڑے محبت بھرے لہجے میں بولی۔
”تم کتنے اچھے ہو۔ کاش میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی۔ لیکن کیا کروں؟ میں

مجبور ہوں ایسا نہیں کر سکتی۔“

اسی طرح باتیں کرتے اور دریا سے ہٹ کر چلتے ہم ایک چھوٹے سے میدان میں آ گئے جہاں بانس اور ناریل کے بہت درخت تھے۔ بانس اور ناریل کے درختوں سے میری نگاہیں اتنی مانوس ہو گئی تھیں کہ میں انہیں رات کے اندھیرے میں بھی پہچان لیتا تھا۔ یہ درخت وسطی اور جنوبی ہندوستان کے جنگلوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ درختوں کا ذخیرہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ وہ ختم ہوا تو پھر بلا راستہ شروع ہو گیا جس کی دونوں جانب رات کے اندھیرے میں سیاہ چٹانیں ستونوں کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ وشلی نے کہا۔

”ان ٹیلوں کے پیچھے ایک ندی بہتی ہے۔ ہم وہاں منہ ہاتھ دھو کر پانی پیئیں گے۔ اس ندی کا پانی بڑا میٹھا ہے۔ مجھے پیاس بھی لگی ہے۔“
میں نے کسی قدر ہزار ہو کر پوچھا۔
”لیکن تمہاری سیلی کا گھون ابھی کتنی دور ہے؟“
وشلی نے کہا۔

”مگر کیوں کرتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دن نکلنے سے پہلے پہلے دکھتا کے گھون میں ہوں گے۔“

رات ڈھلتا شروع ہو گئی تھی۔ چٹانوں والا پتھر بلا راستہ ختم ہو گیا۔ آگے اترا کی تھی۔ وہاں ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی۔ وشلی اور میں ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہم کافی تھک گئے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ وشلی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

”یہاں زیادہ دیر نہیں رکھنا چاہیے۔ آگے چلتے ہیں۔“

ایک جگہ سے ہم نے ندی پار کی۔ ندی کی دوسری طرف جنگل تھا۔ یہ زیادہ گھٹا نہیں تھا۔ اس جنگل سے بھی ہم گزر گئے۔ سامنے پہاڑی ٹیلے نظر آنے لگے۔ وشلی نے ان ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان پہاڑیوں کے درمیان میری سیلی دکھتا کاٹھن ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم وہ گھوڑے تو آیا جس سے مجھے کسی اگلے گھوڑے یا شرتک پہنچنے کے لیے کوئی تیل گاڑی مل سکتی تھی۔ پہاڑیوں تک پہنچنے پہنچنے بھی کافی وقت لگ گیا۔ ہم پہاڑیوں کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ پہاڑیوں پر کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ آخر ہم پہاڑی کی چوٹی پر آ گئے۔ ہم دونوں کا سانس پھول گیا تھا۔ دھلی پہاڑی کی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ نیچے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک پیالہ نما چھوٹی سی وادی تھی۔ وادی میں اندھیرا تھا اور کہیں کہیں روشنی ٹٹمار رہی تھی۔ دھلی بولی۔

”یہ میری سیلی کا گھوڑا ہے۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر رات کے پچھلے پیر کے دھندلے اندھیرے میں اس کی سیاہ آنکھیں سیاہ موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

”میری سیلی کے گھوڑے میں تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ تم کھانے کو جو چاہو گے تمہیں ملے گا۔ یہ گھوڑے نہیں ایک سورگ ہے جس کو تم مسلمان جنت کہتے ہو۔“

وہ بڑے پر اسرار انداز میں مسکرائی اور اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا دبایا اور کہا۔

”آ جاؤ، سورگ میں چلتے ہیں۔“

میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ وہ اس قسم کی پر اسرار اور ہلکی ہلکی باتیں کیوں کرنے لگی تھی۔ ہم پہاڑی کی دوسری جانب ڈھلان اترنے لگے۔ آخر ہم وادی میں آ گئے۔ یہاں تک آتے آتے آسمان پر جو ہلبل چھلے ہوئی تھیں ان کے عقب میں صبح کھڑے کی یعنی سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے کی پھلکی پھلکی سفید جھلکنے لگی تھی اور اس دھندلی پھلکی روشنی میں مجھے پہاڑی کے دامن میں دونوں جانب قاصطے قاصطے پر گول گول لیوٹری جھونپڑیاں دکھائی ہیں۔ کسی کسی جھونپڑی کے باہر روشنی ٹٹمار رہی تھی۔ شاید یہ مٹی کے تیل کی لائین تھی۔ دھلی میرے آگے آگے چلنے لگی تھی۔ وہ ایک جھونپڑی کے

باہر آ کر رک گئی۔ اس نے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر کہا۔

”یہ میری سیلی دکھتا کی جھونپڑی ہے۔ سب گھوڑے والے جھونپڑیوں میں ہی رہتے ہیں۔“

عجیب بات تھی کہ وہاں مجھے کوئی تیل گاڑی، کوئی مل موٹی وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا جو گھوڑوں کی خاص نشانی ہوتے ہیں۔ جھونپڑی کے دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ دھلی پردہ اٹھا کر جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ کبھی ارد گرد کی جھونپڑیوں کو دیکھتا اور کبھی اس پاس کی بلند پہاڑیوں کو نکلنے لگتا جنہوں نے اس چھوٹے سے گھوڑے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ دھلی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ گھوڑے لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے اندر سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھلی کے ہنسنے کی آواز نہیں تھی۔ اتنے میں جھونپڑی کا پردہ ہٹا اور ایک اونچی لمبی جوان عورت نمودار ہوئی۔ صبح کھڑے کے پھلکے اجالے میں اس کی آنکھیں میری طرف دیکھتے ہوئے چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ کھٹا ہوا تھا۔ جسم پر صرف ایک ساڑھی تھی جو اس کے جسم کو پوری طرح سے نہیں ڈھانپ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سے نکل کر دھلی نے کہا۔

”یہ میری سیلی دکھتا ہے۔“

وہ جوان اور دراز قد نیم عریاں عورت جس کا نام دکھتا تھا اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس نے پہلی بار کسی مرد کی شکل دیکھی ہو۔ دھلی نے سرسری طور پر میرا اس سے تعارف کرایا۔ دکھتا نے کہا۔

”اندر آ جاؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔“

اس عورت کی آواز بھی بڑی خترم تھی۔ وہ کسی طرح بھی گھوڑوں کی عورت نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی زبان بھی اس علاقے کے دیہاتیوں والی ٹوٹی پھوٹی بھارتی اور مراٹھی آمیز ہندی نہیں تھی۔ اس نے بڑی صاف اردو میں بات کی تھی۔ میں جھجکتے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑی میں سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متاثر کیا

وہ ایک خوشبو تھی۔ یہ خوشبو پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے دور دراز گھٹوں کی جھونپڑی سے کبھی نہیں آسکتی تھی۔ دوسرے جس بات نے مجھے چونکایا وہ یہ تھی کہ یہ خوشبو کسی ولایتی ملک کے پرفیوم کی خوشبو تھی۔ جھونپڑی میں ایک دیا جل رہا تھا۔ دیے کی روشنی میں مجھے زمین پر چار پانچ ہرن کی کھالیں ساتھ ساتھ بچھی ہوئی نظر آئیں۔ ہرن کی کھالوں کے فرش پر سرخ رنگ کے گلاب جاسنوں کی شکل کے بڑے نیکیے اوپر اوپر پڑے تھے۔ میں حیرانی کے تاثر کے ساتھ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ عورت دسماتی نہیں ہے تو پھر یہ کون ہے؟ ذہن نے کہا ہو سکتا ہے اس کا خاوند شکاری ہو اور یہ ہرن وہی مار کر لایا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی انگریز شکاری کو شکار کھلاتا ہو اور یہ ولایتی پرفیوم وہ انگریز شکاری سے اپنی بیوی کے لیے لے آیا ہو۔ وٹھلی اور دکھتا بھی میرے پاس بیٹھ گئیں۔ وٹھلی کہنے لگی۔

”دکھتا کا خاوند اس گھٹوں کا مالک ہے۔ یہ ساری زمین اسی کی ہے۔ وہ یہاں کبھی کبھی ہی آتا ہے۔ شہر میں کام کرتا ہے۔ کیوں دکھتا؟“

دکھتا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔

”ہاں ہاں۔ وہ کبھی کبھی ہی یہاں آتا ہے مگر مجھے اس سے پریم نہیں ہے۔“

اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ وٹھلی نے میرے سامنے دکھتا سے پوچھا۔

”گھٹوں سے تیل گاڑی کس روز شہر جائے گی؟“

دکھتا نے ہنس کر کہا۔

”کیوں؟ کیا تم اتنی جلدی واپس چلی جاؤ گی؟“

وٹھلی نے کہا۔

”اری نہیں مجھے نہیں ہمارے دوست کو کاٹھیاواڑ جانے کی جلدی ہے۔“

دکھتا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”ہاں‘ مجھے جانا ہے۔ وہاں لوگ میری راہ دیکھ رہے ہیں۔“

اس عورت نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”ہم بھی تو تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔“

اور ایک بار دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اس عورت کا یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اس نے کیوں کہا تھا۔ بس میں بھی کھسپائی سی ہنس کر رہ گیا اور صرف اتنا ہی کہا۔

”آپ کا شکریہ لیکن مجھے جلدی جانا ہے۔“

دکھتا گردن کو ایک طرف بڑی خاص ادا سے جھکا کر بولی۔

”چتا نہ کرو۔ کل کا دن چھوڑ کر پرسوں بڑے کا کا خود گاڑی لے کر شہر جا رہے

ہیں۔ وہاں سے تمہیں کاٹھیاواڑ کی لاری مل جائے گی۔“

میں نے دل میں سوچا کہ یہ دو دن کسی نہ کسی طرح یہاں گزارنے ہی پڑیں گے۔

دکھتا نے ہرن کی کھال کے بستر پر میرا تکیہ ایک طرف لگا دیا اور مجھ سے کہا۔

”تم آرام کرو۔“

پھر وٹھلی کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور پوچھا۔

”تم بھی یہیں ساتھ ہی سو جاؤ۔“

دونوں ہنسنے لگیں۔ وٹھلی بولی۔

”نہیں دکھتا۔ یہ میرا دوست ہے۔ یہ اکیلا ہی سوئے گا۔ ہم دونوں ذرا پرے ہو

کر سو جائیں گی۔“

میں وہیں لیٹ گیا۔ دکھتا اور وٹھلی کچھ فاصلے پر ٹکٹے لے کر لیٹ گئیں تھوڑی

دیر بعد ہی مجھے نیند آگئی کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیا بجھ چکا

تھا۔ جھونپڑی کے پردے کے نیچے سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اتنے میں وٹھلی

جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ کہنے لگی۔

”اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر کھانا کھائیں گے۔“

میں جھونپڑی سے باہر آگیا۔ باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوسری جھونپڑیوں کے باہر کوئی عورت مرد

یا بچہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے وشلی سے پوچھا۔
 ”گلوں کے لوگ کہاں ہیں؟ کیا سب ابھی تک سو رہے ہیں؟“
 وہ بولی۔

”دوسرے گلوں میں کوئی میلہ ہے۔ وہاں گئے ہوئے ہیں۔ شام تک واپس آ جائیں گے۔ آؤ ندی پر چلتے ہیں۔“

گلوں کی فضا مجھے بڑی پر اسرار سی لگی۔ جھوپڑیوں کے پیچھے کچھ پھل دار درخت تھے۔ ان کے درمیان سبزوں کے دو تین کھیت تھے۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ وشلی ساڑھی اتار کر میرے سامنے ہی ندی میں اتر گئی۔ میں ذرا اوٹ میں ہو کر نہانے لگا تو اس نے کہا۔

”میرے سامنے کیوں نہیں اٹھن کرتے؟ مجھ سے کیوں پردہ کرتے ہو؟“

میں نے وشلی کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ندی کا پانی گہرا نہیں تھا۔ میں نے اچھی طرح سے اپنے جسم اور سر کو دھویا۔ ٹھنڈے پانی نے جسم کو تروتازہ کر دیا۔ میں ندی سے باہر نکلتے لگا تو وشلی اس وقت ندی سے نکل کر ساڑھی پہن رہی تھی۔ ذرا اس کا رخ دوسری طرف ہوا تو میں جلدی سے ندی سے باہر آ گیا اور جلدی جلدی پتلون پہن لی۔ پتلون جیکٹ میرا ابھی تک وہی پرانا لباس تھا جو کلنی خراب ہو چکا تھا۔ لیکن میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔

ہم دکھتا کی جھوپڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی جس کے بال کھلے تھے اور کھلے بالوں میں گیندے کا بڑا سا سنہری پھول لگا تھا، ہاتھوں میں طشت پکڑے اندر داخل ہوئی۔ یہ لڑکی بھی شکل صورت سے دیہاتی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ طشت میں تانبے اور چینی کے برتنوں میں کھانا لگا ہوا تھا۔ بننا ہوا گوشت اور مچھلی تھی۔ چاول تھے، چائے کی چٹیک اور چھوٹی نیلے پھولوں والی پیالیاں تھیں۔ ایک تھلی میں پھل رکھے تھے۔ شیشے کا جگ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میری حیرانی اور تجسس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سارے برتن اور کھانا شہر کے کسی اوسنے طبقے کی معاشرت کی

نمائندگی کرتے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے قیمتی برتن یہاں کہاں سے آ گئے ہیں اور اتنا عمدہ کھانا پکانے والا یہاں کون ہو گا۔ پھر خیال آیا کہ دکھتا کا خلوند شہر میں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شہر سے یہ برتن لے آیا ہو اور اس نے دکھتا کی خدمت گاری کے لیے کوئی شہر کا بوڑھا بلورچی لا کر رکھ دیا ہو۔ دکھتا بھی آگئی۔ اس نے گولڈن رنگ کی دوسری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں میں اسی رنگ کے پتھر چمک رہے تھے۔ ناک میں موتی پڑا تھا۔ بالوں کا جوڑا کیا ہوا تھا جس میں موتیے کے سفید پھول سجے تھے۔ اس کے لباس سے وہی دلانسی پرفوم کی خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ یہ پرفوم کہاں سے لائی ہے۔ دکھتا نے مسکرا کر کہا۔

”میرے خلوند نے مجھے شہر سے لا کر دیا تھا۔ ہمیں پسند ہے تو تم لے لو میں اور منگوا لوں گی۔“

میں نے فوراً ”کہا۔“

”نہیں نہیں دکھتا جی۔ یہ آپ کو ہی اچھا لگتا ہے۔“

وہ بولی۔

”ہاں! یہ لیڈیز پرفوم ہے۔“

اس کے انگریزی میں لیڈیز پرفوم کہنے پر میں اور بھی حیران ہوا۔ لیکن اس کو اپنے خلوند کی نوکری کی وجہ سے شہر کی ہوا لگ چکی تھی اس لیے اس میں زیادہ تعجب کرنے والی بات نہیں تھی۔ ہم تینوں نے جھوپڑی میں ہی کھانا کھلایا۔ کھانا واقعی بڑا لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد دکھتا نے مجھ سے پوچھا۔

”برائزی دسکی کا شوق ہو تو لاؤں؟“

میں نے کہا۔

”نہیں شکریہ، شکریہ ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا مطلب تھا کہ اس دراز قد حسین عورت کو شہر کی کچھ زیادہ ہی ہوا لگ چکی تھی۔ اس کے بعد میں وہیں سو گیا۔ جب اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ سورج پہاڑیوں کے

”چائے پیو میرے پریمی اکل تو چلے ہی جاؤ گے۔“
 وشلی نے میرے لیے پہلی بار پریمی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف
 سٹرا کر دیکھا۔

”یہ پریمی تم نے مجھے بھلا کیوں کہا؟“
 دکھتا ہنستے ہوئے بولی۔

”جب کہ میں تمہیں اپنا پریمی سمجھتی ہوں۔“
 دونوں ہنسنے لگیں۔ وشلی نے کہا۔

”ہم سب ایک دوسرے کے پریمی ہی ہیں۔ یہاں ہمارے گھوڑوں میں پریم کا راج
 ہے۔ ہم سب آپس میں پریم کرتے ہیں۔ ہمارا ایک سوگ بھی ہے یعنی ایک اپنی بنائی
 ہوئی جنت ہے۔ تم اگلی بار آؤ گے تو تمہیں اپنی جنت کی سیر کرائیں گے۔“
 میں نے دل میں کہا خدا نہ کرے کہ میں پھر اس طرف آؤں۔ وشلی نے مجھے
 چائے کی ایک اور پیالی بنا کر دی۔ اس وقت باہر بلوں کے گرجنے کی ہلکی ہلکی آواز
 آنے لگی۔ دکھتا نے جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”درشا آ رہی ہے۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”پریمی! درشا کا مطلب تو تم ضرور جانتے ہو گے؟“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ درشا کا مطلب ہے بارش۔“

دونوں بہت خوش ہوئیں۔ اب بن دونوں عورتوں نے نہ جانے کیوں مجھے پریمی
 کہہ کر بلانا شروع کر دیا تھا۔ باہر سے بارش کی بوندیں گرنے کی آواز آنے لگی۔ دکھتا
 نے بڑی جذباتی آواز میں کہا۔

”درشا ہونے لگی ہے۔ اس وقت آکاش پر دیوتا اپنی دیوتا سیوں کے ساتھ بیٹھ کر
 سو مرس پیتے ہیں۔“

پیچھے غروب ہو گیا ہوا تھا اور جھونپڑی کے باہر لائین روشن کر دی گئی تھی۔ جھونپڑی
 کے اندر تیل کا دیا روشن تھا۔ دکھتا نے مجھے بتایا تھا کہ لائین جلانے سے جھونپڑی میں
 مٹی کے تیل کی بو پھیل جاتی ہے، اس لیے میں اندر ناریل کے تیل کا دیا روشن کرتی
 ہوں۔ اس وقت تک میں نے ان تین عورتوں یعنی وشلی، دکھتا اور ان کی نوجوان
 نوکرانی کے سوا کوئی چہرہ نہ دیکھا تھا۔ اس چار پانچ جھونپڑیوں والے گھوڑوں میں نہیں دیکھی
 تھی۔ باقی جھونپڑیوں پر بھی سارا دن دیرانی چھائی رہتی تھی اور شام کے وقت تو ان کے
 باہر لائین بھی روشن نہیں کی گئی تھی۔ ہم دکھتا کے جھونپڑے میں بیٹھے چائے پی
 رہے تھے۔ میں نے وشلی سے پوچھا۔

”صبح تیل گاڑی شرکس وقت جائے گی؟“

اس نے دکھتا کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

”بڑے کالا تیل گاڑی لے کر دوسرے گھوڑوں میلے پر گئے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی
 عورتیں اور بچے اور مرد بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔ صبح شاید آجائیں گے۔ دوسرے کو
 تمہیں لے کر شر چلے جائیں گے۔ کیوں تم بور ہو گئے ہو؟“

یہ بور کا لفظ بھی شرعی معاشرت کا لفظ تھا۔ لیکن میری ساری حیرانی یہ معلوم
 کر کے تقریباً ختم ہو گئی تھی کہ دکھتا کا خلود یہ سارا کلچر شر سے لایا ہے اور دکھتا
 چونکہ رنگین مزاج عورت ہے اس لیے اس پر شر کا رنگ زیادہ چڑھ گیا ہوا ہے۔
 میں نے کہا۔

”نہیں نہیں‘ میں بالکل بور نہیں ہوا۔ پیچھے میرے دوست میری گم شدگی سے
 پریشان ہو رہے ہوں گے اس لیے میں جلدی پہنچنا چاہتا ہوں۔“
 دکھتا بولی۔

”کوئی بات نہیں جہاں کل کی رات گزاری ہے وہاں ایک رات اور گزار لو۔ کل
 شام تک تو تم شر پہنچ ہی جاؤ گے۔“
 وشلی کہنے لگی۔

”میرے پریمی ناراض نہ ہوئے ہم دونوں سیلیں بارش کو بہت پسند کرتی ہیں۔
درشارت کے وقت ہو تو ہم جذباتی ہو جاتی ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔“

دشلی نے سوم رس کی بوتل میں سے تھوڑی تھوڑی شراب چینی کی پیالیوں میں
ڈالی اور اس کی چسکیں لگانے لگیں۔ انہوں نے مجھے بھی تھوڑی سی پی لینے پر بہت
مجبور کیا جب میں نے ہر بار سختی سے انکار کیا تو انہوں نے پھر مجھے مجبور نہ کیا۔ اس
دوران دشلی نے مجھے چائے کی ایک اور پیالی بنا کر دی۔ میں چائے پیتا رہا اور وہ دونوں
عورتیں سوم رس پیتی رہیں۔ باہر بارش تیز ہو گئی تھی۔ اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی تو
میں اٹھ کر باہر چلا جاتا کیونکہ میں وہاں بیٹھے بیٹھے سخت بور ہو گیا تھا۔ پھر میں ایک
طرف سر ہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

دکھتا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”پریمی جی! نیند آرہی ہے تو تھوڑا آرام کر لو۔ کھانے کے وقت ہم تمہیں اٹھا
دیں گی۔“

مجھ پر واقعی کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ایک تو
میں وہاں بور ہو گیا تھا۔ دوسرے کچھ رات بھی نہیں سویا تھا۔ دن کو بھی اچھی طرح نہ
سو سکا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ نیند آرہی ہے تو تھوڑی دیر آرام کر لیتا چاہیے۔
میں نے کہا۔

”میں کچھ دیر کے لیے سو جاتا ہوں۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں مجھے کچھ ہوش نہ
رہا۔ جب آنکھ کھلی تو میں یہی سمجھا کہ میں کافی دیر تک سویا رہا ہوں۔ سر تھوڑا تھوڑا
بھاری ضرور تھا۔ میری چاروں طرف اندھیرا تھا۔ شاید جھونپڑی میں جتا ہوا دیا بجھ گیا
تھا یا کسی نے اسے بجھا دیا تھا۔ جھونپڑی میں کسی طرف سے کوئی روشنی نہیں آرہی
تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رات ہی کا وقت ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے
محسوس ہوا کہ میں ہرن کی کھال کے سخت بستر کی بجائے کسی نرم ریٹی بستر پر ہوں۔

میں نے دل میں کہا جنم میں جائیں تمہارے دیوتا اور دیوداسیاں۔ ان لوگوں کی
وجہ سے میں نے بڑی سخت مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ دشلی بولی۔

”میں سوم رس لاتی ہوں ہم دیوتوں کا نیک شگون منائیں گی۔“

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ دکھتا میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ وہ بار بار بازو اوپر اٹھا کر
اپنے جوڑے کو ٹھیک کر رہی تھی اور میری طرف بڑی ترجہی اور معنی خیز نگاہوں سے
دیکھتی جاتی تھی۔ میں اس کی نگاہوں کے معنی خوب سمجھتا تھا۔ لیکن اپنی جگہ پر قائم تھا
اور پہلے بھی مشکل سے مشکل حالات میں بھی خدا کے فضل سے قائم رہا تھا۔ ایسے
موقعوں پر مجھے اپنی بیوی جیل کا خیال آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے جیل کا خیال آ گیا
اور میرا دل اس کو یاد کر کے واقعی لو اس ہو گیا۔ دشلی تیز تیز قدم اٹھاتی جھونپڑی میں
آئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ یہ دلائی شراب کی بوتل تھی۔ کہنے لگی۔

”باہر بارش ہو رہی ہے دکھتا۔“

دکھتا نے تیز تیز سانس لے کر کہا۔

”سچ کہہ رہی ہو میری جان؟“

”ہاں خود جا کر دیکھ لو۔ میری جان۔“

دکھتا نے کہا۔

”میں تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھوں گی کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔“

میرے پاس آؤ۔“

دشلی نے بوتل رکھ دی اور دکھتا کے پاس چلی گئی۔ دکھتا اس کے جسم پر بوسے
پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ دشلی نے بھی دکھتا کے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔
میں نے دل میں لاجول دلا توہ پڑھی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ دکھتا نے ہلکا سا قہقہہ
لگا کر کہا۔

”تمہارا پریمی ناراض ہو گیا ہے دشلی۔“

دشلی کہنے لگی۔

میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا میرا ہاتھ بستر کی ریٹی چادر پر پھسلتا چلا گیا۔ فضا میں دکھتا کے خاص پر فوم کی خوشبو بھئی ہوئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ میں دکھتا کے جھونپڑے میں ہی ہوں لیکن وہاں ریٹی بستر کمال سے آگیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے دھڑکی کو آواز دی۔

”دھڑکی! دھڑکی!“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بستر کو ٹٹولا۔ بہت جلد مجھ پر ایک اور حیران کر دینے والا انکشاف ہوا کہ میں ایک نرم و نازک گدے والے پتنگ پر بیٹھا ہوں۔ میں نے پتنگ کے نیچے پاؤں رکھے تو محسوس ہوا کہ غرش پر قلین بچھا ہوا ہے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے میں کسی جانب سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں ابھرنے لگیں۔ میں نے غور سے سنیں۔ یہ اس زمانے کے مقبول عالم انگریزی گانے کی دھن تھی جسے ایک مشہور انگریز لڑکی نے گایا تھا۔

کیس میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے بازو پر چٹکی بھری۔ لیکن میں یہ خواب نہیں تھا۔ میں جاگ رہا تھا یہ سب کچھ میں زندہ حالت میں سن رہا تھا۔ پھر میں کہاں آگیا ہوں؟ دھڑکی اور دکھتا مجھے کہاں لے آئی ہیں۔ چونکہ اس قسم کا خطرناک حادثہ یا واقعی میرے ساتھ پہلے ہو چکا تھا اس لیے میں اندر سے خوف زدہ ضرور ہوا کہ کہیں اس قسم کا بھیانک حادثہ میرے ساتھ ایک بار پھر پیش تو نہیں ہو رہا۔

انگریزی میوزک آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ اب ستار کی دھن ابھرنے لگی۔ یہ ہندوستانی دھن تھی۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں بے اختیار پکار اٹھا۔

”دھڑکی! دکھتا!“

اس بار بھی کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یا خدا یا! میں کس دنیا میں آگیا ہوں۔ کہیں میں کسی خدائی مخلوق کی قید میں تو نہیں ہوں۔ اتنے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ میری آنکھیں چند حیا گئیں۔ میں نے آنکھوں کے آگے بازو کر لیا۔ بازو ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں۔ میں ایک شاندار اور امیرانہ ماحول کے بیڈروم میں ہوں۔ دیواروں پر

ریٹی پردے گرے ہوئے ہیں۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ جس پتنگ پر میں بیٹھا ہوا تھا وہ ڈبل بیڈ تھا اور زرد ریٹی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ پتنگ کی دونوں جانب آبنوی سلڈر فیمیل تھے جن پر دونوں جانب ایک ایک سنہری فیمیل لیپ روشن تھا۔ سامنے آتش دان کے پاس گولڈن کناروں والے صوفے پڑے تھے۔ کارنس پر کیوبڈ اور سانگی دیوی کا مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر ایک عریاں عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی جو جنگل میں ایک طرف دوڑتی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک شیر لگا ہوا تھا۔ چھت منقش تھی۔ درمیان میں چاندی کا فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر دونوں جانب قد آدم تصویریں لگی تھیں۔ ان تمام تصویروں میں ایک جنگل دکھایا گیا تھا جس میں عریاں اور نیم عریاں عورتیں درختوں کے نیچے بیٹھی اور لیٹی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ میں تو دکھتا کے جھونپڑے میں سو گیا تھا۔ پھر وہاں سے مجھے کون اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہ بالکل الف لیلٰی کے کسی شہزادے کی طرح ہوا تھا جس کو سوتے میں کوئی جن اٹھا کر کسی بادشاہ زادی کے محل میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ بیڈ روم جدید وضع کا تھا مگر وہاں دیوار پر کوئی کلاک نہیں لگا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا تاہم کیا ہوا ہے۔ وہاں رات اور دن کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ بیڈ روم کی کوئی کھڑکی یا روشندان بھی نہیں تھا۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ میں دروازے کی طرف گیا۔

اسے باہر کو ذرا سادہ کیلا، دروازہ باہر سے بند تھا۔ بیڈ روم کی فضا میں ستار کی ہلکی ہلکی جھٹکار ابھر رہی تھی۔ یہ آواز دیوار کے اندر لگے کسی پیسکر سے آ رہی تھی۔ میں اپنے اسی جیکٹ اور چٹون والے لباس میں تھا۔ میرا لباس تبدیل نہیں ہوا تھا۔ میں پتنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور میں کسی جادوگری میں تو نہیں آگیا۔ کہیں میرے ساتھ پھر کوئی بھیانک واردات تو نہیں ہونے والی۔ میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے اور خدشات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں پتنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دکھتا بڑی بڑی سنہری زرتار ساڑھی پہنے بالوں میں گیندے کے پھولوں کا مجرا سجائے مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے اپنے لمبے

کی تنگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 ”میں جانتا ہوں تم لوگ مجھے بے ہوش کر کے یہاں لائے ہو۔ تمہیں کیا حق پہنچتا تھا؟“

دکھتا بڑی دلربائی کے ساتھ چلتی میرے پاس آکر چنگ پر بیٹھ گئی اور شیریں لہجے میں بولی۔

”پریمی جی! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اپنے سورگ کی سیر کراؤں گی۔ میں تو تمہیں سورگ کی سیر کرائے لائی ہوں۔ آج کا دن ہمارے سورگ میں گزار لو ساری زندگی یاد کرو گے۔ کل چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں جانے سے تو نہیں روکا۔“

”میں تمہارے سورگ کی سیر نہیں کرنا چاہتا۔ میں ابھی واپس جانا چاہتا ہوں۔“
 دکھتا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا چلا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔
 ”پریمی! مجھ سے ناراض ہو گئے؟“

میں نے سرد لہجے میں کہا۔
 ”مجھے پریمی شرمی مت کہو۔ میں کسی کا پریمی نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔“

میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو وہ چنگ پر ہی بیٹھی رہی۔ وہیں سے بولی۔
 ”تم اس وقت ہمارے سورگ میں ہو جو زمین سے بہت اوپر بلوئوں سے بھی اوپر پر لوگ میں ہے۔ یہاں تو دیوتا اور دیوتاہیں ہی رہتی ہیں۔ تم بڑے خوش قسمت ہو میرے ساتھ یہاں آئے ہو۔ اب تم میرے ساتھ ہی واپس جاسکتے ہو۔ اکیلے جاؤ گے تو بلوئوں میں لڑھک کر ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر گر پڑو گے۔“

میں نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا اور کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ نیچے ہی باہر نکلا سامنے سفید اور سنہری رنگ کے بادل ہی بادل دکھائی دیئے۔ میں خوف زدہ ہو کر وہیں رک گیا۔ بادل آہستہ آہستہ ایک طرف چلے جا رہے تھے۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ مجھے بلوئوں کے درمیان میں سے نیچے چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور

سیاہ دھبوں کی طرح درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کیا کرشمہ ہے؟ یہ کیا طلسم ہے؟ ضرور یہ دکھتا کوئی جادوگر ہے جس نے جادو کے زور سے زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر بلوئوں میں خواب کا محل بنایا ہوا ہے۔ مجھے دکھتا کی آواز آئی۔

”پریمی! میرے پاس واپس آ جاؤ۔ پاؤں پھسل گیا تو نیچے گر پڑو گے اور تمہاری ہڈیاں چور ہو جائیں گی۔“

میں واپس بیڈ روم میں آ گیا۔

”دکھتا! یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر تم اپنے دیوتوں کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے کل یہاں سے نکال کر دھرتی پر واپس لے جاؤ گی تو میں تمہارے سورگ میں ایک دن بڑے شوق سے گزار لوں گا۔“

دکھتا نے چنگ پر بیٹھے بیٹھے بازو اٹھا کر مجھے اپنی طرف بلایا اور بولی۔

”میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں دین دیتی ہوں کہ کل تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤں گی اور خود کاٹھیاواڑ پہنچا کر آؤں گی۔ اب تم خوش ہو جاؤ کیونکہ یہاں سورگ میں کوئی پریشان نہیں ہوگا۔ ہر کوئی خوش رہتا ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“
 مجھے اب بھی اس عیش پرست جادوگر نے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ لیکن میں مجبور تھا۔ اگر یہ کوئی طلسمی عمل تھا جادو کی فضا تھی تو میں وہاں سے دکھتا کی مدد کے بغیر نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ذل میں یہی فیصلہ کیا کہ دکھتا جس طرح کہتی ہے اسی طرح کرتے جاؤ۔ ہو سکتا ہے یہ خوش ہو کر واقعی مجھے یہاں سے نکال کر کاٹھیاواڑ پہنچا دے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

”پریمی! آؤ میں تمہیں اپنے سورگ کی سیر کراتی ہوں۔“

وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے کے کونے والے پردے کو اٹھا کر بیڑھیاں اترنے لگی۔ بیڑھیاں اترے تو ہم ایک روشن روشن راہ داری میں آ گئے۔ جہاں نیم عریاں

نوجوان عورتیں دیوار کے ساتھ ادب سے کھڑی تھیں۔ دکھتا نے کہا۔

”یہ ہماری سورگ کی دیوداسیاں ہیں۔ پورن ہاشی کی رات کو جب دیوتا لوگ یہاں آتے ہیں تو یہ دیوداسیاں ان کے سامنے رقص پیش کرتی ہیں اور دیوتاؤں کا جی بہلاتی ہیں۔“

راہ داری سے نکلتے ہوئے ہم ایک بہت بڑے دالان میں آ گئے۔ جہاں سنگ مرمر کے ستونوں کے ساتھ سفید اور سرخ پھولدار بنیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں حوض تھا جس میں فوارہ چل رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیم عریاں لڑکیاں نیم دراز تھیں۔ کوئی ستار بجا رہی تھی، کوئی سوم رس کی چسکیاں لے رہی تھی۔ کوئی اپنے ہل سنوار رہی تھی۔ کوئی حوض میں اٹھان کر رہی تھی۔ ان کے سامنے چاندی کے طشت رکھے تھے جن میں طرح طرح کے پھل پڑے تھے۔ تین لڑکیاں گلاب پاش لے لے ان پر چل پھر کر خوشبوئیں چھڑک رہی تھیں۔ دکھتا مجھے لے کر سنگ مرمر کے ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔ دالان کی چھت نیلی تھی جس میں ستارے بنے ہوئے تھے۔ دکھتا کہنے لگی۔

”یہ ہمارے سورگ کا ایک بلغ ہے۔ ہمارے سورگ میں اسی طرح کے کتنے ہی بلغ ہیں۔“

میں نے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سورگ میں صرف دیوداسیاں ہی ہیں۔ مرد دیوتا کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔“

دکھتا نے نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ کہنے لگی۔

”تم ہی اس سورگ کے مرد دیوتا ہو۔ کیا تم نہیں ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں تو عالم دنیا دار انسان ہوں، سنا ہے تمہارے دیوتا آدھے آدمی اور آدھے جن

بھوت ہوتے ہیں۔“

دکھتا نے کہا۔

”آہستہ آہستہ ساری باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔“

میں نے کہا۔

”میں پھر تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے بچن دیا ہوا ہے کہ تم مجھے کل یہاں سے زمین پر لے جاؤ گی۔“

وہ بولی۔

”مجھے یاد ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں سورگ کا دوسرا بلغ دکھاتی ہوں۔“

ہم وہاں سے نکل کر ایک دوسرے دالان میں آ گئے۔ یہاں بھی پہلے دالان کی طرح عورتیں حوض کے گرد بیٹھی تھیں۔ کچھ نما رہی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ ان عورتوں کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے دکھتا سے کہا۔

”انہوں نے کپڑے کیوں نہیں پہنے ہوئے؟“

وہ بولی۔

”یہ سورگ کا وہ بلغ ہے جہاں عورتوں کے جسموں سے ان کے پاپ جھڑ جاتے ہیں۔“

مجھے یہ سب خرافات لگ رہی تھی۔ لیکن میں اندر سے حیران ضرور تھا کہ اگر یہ سب کچھ طلسم ہے یا نظر بندی کا کرشمہ ہے تو یہ عورت دکھتا بڑی زبردست جادوگر ہے۔ یقین کریں مجھے اس سے کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اس وقت اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس عورت کی تھوڑی تھوڑی خوشامد کرتے رہنا چاہیے۔ یہ اگر ناراض ہو گئی تو مجھے بے ہوش کر کے پہاں طلسمی دنیا میں لائی ہے تو یہاں سے کسی دوسری دنیا میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”دشلی کہاں ہے؟ وہ یہاں کہیں نظر نہیں آتی۔“

دکھتا نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تم اس کو کیوں یاد کرتے ہو؟ کیا تم اس سے پریم کرتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”بالکل نہیں۔ میں دشلی سے بالکل پریم نہیں کرتا۔“

دکھتا نے میری گردن میں بازو ڈال دیا اور پوچھا۔

”تو پھر کس سے پریم کرتے ہو؟“

میں نے اس کو خوش کرنے کے خیال سے کہہ دیا۔

”میں تم سے پریم کرتا ہوں۔“

دکھتا نے جیسے بے اختیار ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ کہنے لگی۔

”میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں ناگ دیوتا کے سورگ کی سیر کراتی ہوں۔“

وہ مجھے ایک نیم روشن راہ داری میں سے لیتی ہوئی ایک اور دالان میں لے گئی۔

وہاں جو منظر میں نے دیکھا اسے دیکھ کر ایک بار تو میرے جسم کے سارے روٹنے

کھڑے ہو گئے۔ وہاں بھی ایک حوض تھا جس کے کنارے کی روشوں پر قالین بچے

تھے۔ قالینوں پر عریاں، نیم عریاں عورتیں ہال کھولے سانپوں کو ہاتھوں میں لیے انہیں

پیار کر رہی تھیں۔ وہ سب نیم دراز تھیں اور کچھ سانپ ان کے جسموں پر بھی رینگ

رہے تھے۔ دکھتا نے کہا۔

”یہ ناگ دیوتا کی دیوداسیاں ہیں۔ یہ ناگ دیوتا کی پوجا کر رہی ہیں۔“

دکھتا قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر اس نے ایک عورت

کو اشارہ کیا۔ وہ عورت سانپ لیے دکھتا کے پاس آ گئی۔ ایک سانپ اس کی گردن

میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک سانپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دکھتا کو جھک کر پرنام کیا۔

دکھتا نے کہا۔

”ناگ دیوتا مجھے دے دو۔“

عورت نے سانپ دکھتا کو دے دیا۔ سانپ دکھتا کی کلائی سے لپٹ گیا۔ پھر

اچانک سانپ پھن اٹھا کر اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس وقت مجھے

خیال آیا کہ اس سانپ نے میرے جسم سے نکلنے والی سانپ کی بو کو محسوس کر لیا ہے اور

ہو سکتا ہے کہ اس نے پہچان بھی لیا ہو کہ میں کبھی کبھی سانپ کا روپ اختیار کر لیتا

ہوں۔ دکھتا بھی سانپ کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

”پریمی! تم ناگ دیوتا کو پسند آ گئے ہو۔ دیکھو ناگ دیوتا کتنی محبت سے تمہاری

طرف دیکھ رہا ہے۔ لو۔ تم بھی ناگ دیوتا کو پیار کرو۔“

اس نے سانپ کو میری طرف بڑھایا تو سانپ نے زور سے پھنکار ماری اور اپنا

پھن پیچھے کر لیا۔ جیسے میرے پاس آتے ہوئے گھبرا رہا ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سانپ ایسا

کیوں کر رہا ہے۔ مگر یہ بات دکھتا کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ وہ کچھ حیران ضرور

ہوئی۔ کہنے لگی۔

”تم مسلمان ہو۔ شاید اس لیے ناگ دیوتا تمہارے قریب نہیں جانا چاہتا۔“

اس نے سانپ کو اپنے منہ کے پاس لا کر کہا۔

”ناگ دیوتا مجھے اپنا سوم رس پکھاؤ۔ میں تمہاری دیوداسی دکھتا ہوں۔“

سانپ بار بار اپنی زبان باہر نکل رہا تھا۔ یہ سانپ کی عادت ہوتی ہے۔ دکھتا نے

اب اپنی زبان باہر نکل لی تھی۔ پھر اس نے سانپ کی زبان اپنی زبان کے ساتھ لگا دی۔

سانپ نے پھنکارتے ہوئے جیسے دکھتا کی زبان پر ڈس دیا تھا مگر دکھتا نے کسی قسم کی

تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی زبان سے سرخ خون کے تین چار قطرے

نکل کر اس کے ہونٹوں سے بہتے دیکھے۔ خوف کی سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

دکھتا اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر کر خون کے قطرے پی گئی۔ اس نے سانپ قریب کھڑی

عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”ناگ دیوتا کی بے ہو۔ اس کو لے جا کر اپنا دودھ پلاؤ۔“

عورت نے سانپ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جھک کر پرنام کرتی واپس چلی گئی۔

دکھتا پر کچھ نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ سر کو آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ میں

اسے ششدر سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ دکھتا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا

ہاتھ بہت گرم تھا۔ میں نے کہا۔

”دکھتا! تمہیں تو بخار ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

”یہ پریم کا بخار ہے میری پریمی۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں ناگ دیوتا کا رقص دکھاؤں گی۔“

وہ مجھے دالان سے گزارتی ایک کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں ناگ دیوتا کی مورتی دیوار میں لگی تھی۔ مورتی سانپ کی تھی جس کا پھن اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ مورتی کے آگے تھالی میں دیے روشن تھے۔ تھالی میں پھول بھی رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے سارے قالین یہاں کہاں سے آگئے ہیں۔ دیوار کے ساتھ تخت بچھا تھا جس پر گاؤں کی لگے تھے۔

”تم تخت پر بیٹھ جاؤ۔ میں ناگ دیوتا کا رقص کروں گی۔ ناگ دیوتا کی پوجا کروں گی۔“

میں بے دام غلام کی طرح اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے تخت پر آکر بیٹھ گیا۔ یہاں دیوار میں سے باہر نکلے ہوئے چھوٹے سے تختے پر تین دیے روشن تھے۔ اس کے سوا وہاں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ فضا بڑی خواب آلود تھی۔ فضا میں عجیب قسم کی سرکوبو جھل کر دینے والی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دکھتا ناگ کی مورتی کے آگے جا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ وہ کچھ منہ میں پڑھتی رہی۔ پھر اس نے مورتی کے آگے ہاتھ دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا لباس اتار کر ناگ مورتی کے آگے رکھ دیا اور جوڑا کھول کر بالوں کو ایک جھٹکے سے بکھرا دیا۔

یا اللہ خیر! یہ میرے ساتھ تقدیر کیا مذاق کر رہی ہے۔

دکھتا نے ناگ رقص شروع کر دیا۔ وہ عجیب و غریب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ کبھی ناگن کی طرح اس کے منہ سے پھنکار کی آواز نکلتی اور وہ مورتی کو ڈسنے کے لیے آگے بڑھتی۔ کبھی اپنے سر کو پیچھے کی طرف ڈھلکا لیتی۔ کبھی قالین پر لیٹ کر

سانپ کی طرح رینگنے لگتی۔ کبھی ایک دم سے دونوں بازو اوپر اٹھا کر ہاتھوں کو سانپ کے پھن کی طرح کھول لیتی۔ نہیں بت بنا اسے تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ عورت مجھے جس طلسمی دنیا میں لے آئی ہے۔ شاید یہ مجھے یہاں سے کبھی واپس نہیں جانے دے گی۔ مجھے وہاں ابھی تک کوئی دوسرا مرد نظر نہیں آیا تھا۔

اب دکھتا نے ناگن کی طرح رقص کرتے کرتے میری طرف پلٹ کر دیکھا مجھے دور ہی سے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی سرخ آنکھوں میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ میں اس عورت کی گردن توڑ کر اسے ہلاک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں جہاں آگیا ہوں یا پہنچا دیا گیا ہوں وہاں سے واپسی کا راستہ کون سا ہے۔ مجھے تو وہم ہونے لگا تھا کہ مجھ پر ظلم کر دیا گیا ہے اور میں واقعی بلوئوں میں تیر رہا ہوں۔ خدا جانے یہ وہاں کی فضا کا اثر تھا یا کیا تھا۔ دکھتا اٹھ کر سانپ کی طرح مل کھاتی میرے پاس تخت پر آگئی اور اس نے وحشیانہ انداز میں مجھے بالوں سے پکڑ کر زور سے نیچے کھینچا اور تخت پر گرا دیا۔ میں نے فوراً اس کے ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیا اور اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ دکھتا مسکرا رہی تھی۔ اس پر میرے تشدد کا الٹا اثر ہوا تھا۔



”یہاں سے باہر جانے کا راستہ بتاؤ نہیں تو میں ابھی تمہارا گلا دبا دوں گا۔“
وہ عورت رونے لگی۔ بولی۔

”پریمی جی! یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ہم آکاش پر ہیں۔“
وہ زارو قطار ہو رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر دروازے کے پاس
جا کر دیکھا کہ وہی عالم تھا۔ دروازے کے آگے بادل ہی بادل تھے اور بادلوں کے درمیان
سے نیچے دور زمین کے درخت اور کھیت اور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں خوف کے
مارے جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ میں کسی جیٹ ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہوں
اور کسی نے جہاز کا دروازہ کھول دیا ہے۔ میں جلدی سے واپس ہوا اور دیو داسی کو
بادلوں سے پکڑ لیا۔

”تم یہاں سے باہر کیسے جاؤ گی؟“
اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
”پریمی جی! ہم بادلوں میں چل کر آتے جاتے ہیں۔“
مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اسے کہا۔
”میرے سامنے کمرے سے باہر نکل کر دکھاؤ۔“

اس نے خالی گلاس ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے
پیچھے تھا۔ وہ دروازے کے پاس آئی اور یوں اطمینان سے دہلیز پار کر کے بادلوں میں چلتی
ہوئی ایک طرف جا کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باہر قدم
رکھا تو میرا پاؤں نیچے لٹک گیا۔ میں نے جلدی سے پاؤں اوپر کر لیا۔ یا خدا! یہ کیا جابو
ہے؟ صاف ظاہر تھا کہ اگر میں نے باہر قدم رکھا تو میں بادلوں میں لڑھکتا ہوا نیچے زمین
سے جا کر ٹکرائوں گا اور میری ہڈیاں بھی چورا بن جائیں گی۔ مگر وہ دیو داسی کیسے بادلوں
میں چل پڑی تھی؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں انتہائی باہوسی کے عالم میں
تخت پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کبھی میں اس جنم سے نکل سکوں گا؟
امید کی ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ مجھ پر اچانک دورہ پڑ جائے اور میں



اس منحوس کمرے میں بڑی ناگوار بو پھیل گئی تھی۔
اس ناگوار بو میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔
میری طاقت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں بازو اوپر اٹھاتا تو وہ تھوڑی دیر کے بعد
اپنے آپ نیچے گر پڑتا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ دشمن بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی
دکھشٹا کے ساتھ مل گئی۔ اب ان دونوں عورتوں نے مجھ پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ میں
نے تخت سے اٹھ کر باہر کو بھاگنے کی کئی بار کوشش کی لیکن میرے جسم نے جواب
دے دیا۔ دونوں عورتیں مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑی تھیں جیسے بھوکی لومڑیاں اپنے شکار
پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی اور
اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش اس وقت آیا جب ایک منحوس دیو داسی مجھے بازو سے ہلا کر جگنے کی کوشش
کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس عورت کے ہاتھ میں
ایک گلاس تھا۔ اس نے کہا۔

”پریمی جی! یہ پی لو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“
مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے گلاس لے کر منہ سے لگایا اور پی گیا۔ وہ
دودھ تھا جس میں خدا جانے کیا کچھ ملایا گیا تھا۔ دودھ پینے سے میرے ہوش و حواس کچھ
بہال ہو گئے۔ میں نے دیو داسی کو بازو سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کہا۔

انسان سے سانپ بن جاؤں اور ایسا ہونا نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ میرے اس دورے کو میری مصیبت یا خوشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ دورہ اندھا اور اتفاقیہ تھا۔ کبھی ہفتے میں دو دو بار پڑ جاتا تھا اور کبھی مینوں گزر جاتے تھے اور نہیں پڑتا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر ہوں، یا زمین اور آسمان کے درمیان لٹک رہا ہوں۔ کسی وقت لگتا یہ سب کچھ جاگتے ہیں میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ٹانگ کی منحوس مورتی کے پاس آکر میں نے اسے غور سے دیکھا، یہ سیاہ پتھر کی بنی ہوئی مورتی تھی۔ سانپ کی آنکھوں میں سرخ موتی جڑے ہوئی تھے۔ تھال میں دیے جل رہے تھے۔ میں نے دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ پھر میوس ہو کر تخت پر جا کر لیٹ گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہی دیوداسی ایک بار پھر غیب سے نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ اس نے گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے بڑی محبت کے ساتھ اس سے اس کا نام پوچھا۔

کنے لگی۔

”مجھے اپنا نام یاد نہیں۔ یہاں کسی بھی دیوداسی کو اپنا نام یاد نہیں ہے۔ ہمیں صرف دیوداسی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ یہی ہمارا نام ہے۔“

یہ سانولے رنگ کی بڑی تیکھی آنکھوں اور تیکھے نقش والی لڑکی تھی۔ ساڑھی اس نے بھی اس طرح سے باندھ رکھی تھی کہ اس کا ایک بازو اوپر تک نکلا تھا۔ میں دودھ پینے لگا اور اس سے کہا۔

”تم مجھے یہاں کی سب دیوداسیوں سے زیادہ سندر لگتی ہو تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“

اس نے کہا۔

”ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ دیے میں اسی سورگ میں پیدا ہوئی تھی۔“

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ سٹ گئی۔ میں نے کہا۔

”دیوی! میں تجھے دیوداسی نہیں دیوی کہوں گا۔ تم مجھے دیوی ہی لگتی ہو بلکہ تم اصل میں دیوی ہی ہو۔ سرسوتی دیوی۔“

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”نہیں، نہیں یہ پاپ ہے میں سرسوتی دیوی کے چرنوں کی پجاری ہوں۔ میں سرسوتی دیوی نہیں ہوں۔“

میں آہستہ آہستہ اس کے بازو پر بڑی محبت سے ہاتھ بھیر رہا تھا۔ وہ سنکتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”تم دیوی ہو۔ تم سرسوتی دیوی کی اوتار ہو۔ مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔ میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری برہمیکا ہو۔“

دیوداسی پر میری محبت بھری جھوٹی باتوں کا بالکل سچا اثر ہو رہا تھا۔ میں محبت کے نقلی ڈرامے میں اور زیادہ اصلیت کا رنگ بھرنے لگا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا۔

دیوی! کیا تم مجھ سے بیاہ کر لو گی؟“

وہ جذباتی آواز میں بولی۔

”مگر تم تو دیوی دکھتا سے پیار کرتے ہو۔“

میں نے کہا۔

”کہاں دکھتا اور کہاں تم! کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تلی! تم سندر تا میں تشنگنا کو مات کرتی ہو۔ تم ہیما مالینی اور مدھو بلا سے بھی زیادہ حسین ہو۔“

اس زمانے میں ان دونوں اداکاروں کا بڑا عروج تھا۔ وہ بولی۔

”دکھتا دیوی تو سب کے سامنے کہہ رہی تھی کہ تم سوائے اس کے اور کسی کی

طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔“

میں نے کہا۔

”وہ غلط کہتی تھی۔ میں تو صرف تمہارا دیوانہ ہوں، صرف تم سے پریم کرتا

ہوں۔ میں تم سے بیاہ کر کے تمہیں اپنا بیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ دیوی! بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر لو گی یا نہیں؟

وہ میرے ڈرائے کی تیز لہریں بہہ گئی تھیں یا شاید وہ پہلے ہی سے کسی محبت کرنے والے کی تلاش میں تھیں۔ کہنے لگی۔

”مگر یہاں کوئی دیو داسی کسی سے بیاہ نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا۔

”کیوں؟ یہاں بیاہ کرنا منع ہے؟“

وہ بولی۔ ”نہیں اس لیے کہ یہاں کوئی مرد ہے ہی نہیں۔ اس سوہگ میں صرف استریوں کا راج ہے۔ صرف عورتوں کی حکومت ہے۔ یہاں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”لیکن آکاش کے دیوتا تو آتے ہیں۔“

اس نے کہا۔

”دیوتا دیوتا ہوتے ہیں۔ وہ جب اور جس وقت چاہیں آ سکتے ہیں اور دیو داسیوں سے دل بہلا سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”تو پھر چلو ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ ہم زمین پر، دھرتی پر جا کر بیاہ کر کے سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ وہ کچھ غور کر رہی تھی، کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید اسے میری تجویز پسند آگئی تھی۔ میں نے گرم لہجے پر ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں اچھی اچھی سازشیاں لا کر دوں گا۔ ہم دوسرے شہروں کی سیر کریں گے۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔“

دیو داسی پر میرے نقلی مکالمے اثر کر چکے تھے۔ اس نے میری آغوش سے نکلنے

ہوئے کہا۔

”میں رات کو آ کر تمہیں بتاؤں گی۔“

میں نے کہا۔

”تو کیا یہ دن کا وقت ہے؟ یہاں تو دن کے وقت بھی رات ہی لگتی ہے۔“

اس کے بعد وہ گلاس طشت میں رکھ کر دوڑ کر دروازے میں سے نکل گئی۔ مجھے

ایسے لگا جیسے اس نے دروازے میں سے باہر بولوں میں چھلانگ لگا دی ہو۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا یہ لڑکی اپنے فیصلے کو تبدیل تو نہیں کر دے گی؟ کہیں یہ دکھشٹا یا وشلی کو تو نہیں بتا دے گی کہ میں وہاں سے فرار ہونے کا پلان بنا رہا ہوں؟ اگر اس نے ان دونوں میں سے کوئی حرکت نہ کی تو کیا اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مجھے یہاں سے باہر نکل سکے۔ وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ ہم یہاں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ وہ تو خود مجھے اپنی طرح بے بس لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔

وہ یہ کہہ گئی تھی کہ وہ رات کو آئے گی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ دن کا وقت تھا۔ میں اٹھ کر دروازے پر گیا۔ اسے کھول کر نیچے دیکھا۔ باہر اسی طرح بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے اور بولوں کے شکاف میں سے کہیں کہیں نیچے بہت دور زمین پر کھیتوں اور پہاڑیوں پر دھوپ چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا منظر ہوائی جہاز میں سے نظر آیا کرتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ میری نظر کا دھوکہ نہ ہو۔ کہیں ان لوگوں نے یہاں میری نظر بندی نہ کر دی ہو۔ میں دروازے کی دہلیز کے پاس ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ نیچے ڈال کر ہلایا۔ باہر واقعی خلا تھا کوئی فرش یا راہ داری وغیرہ نہیں تھی۔ مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے تخت پر سے ایک تکیہ اٹھایا اور اسے دروازے کے باہر گرا دیا۔ تکیہ نیچے زمین کی طرف جانے کی بجائے باہر اس طرح پڑا رہا جیسے فرش پر گرا ہو۔ میں نے ہاتھ آگے کر کے تکیے کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے۔ تکیے کو کیسے فرش میسر آگیا۔ میں نے ایک پاؤں باہر نکل کر فرش پر لگانا چاہا لیکن میرا پاؤں فرش پر گرنے کی بجائے نیچے خلا میں ٹک گیا۔ میں نے

جلدی سے اپنا پاؤں اوپر کھینچ لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اگر کوئی نظر بندی یا طلسم ہے تو صرف انسانی حواس کے لیے ہے۔ غیر محسوس مادی چیزوں پر اس طلسم کا اثر نہیں ہوتا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تخت پر آکر پڑ گیا۔ مجھے گلاس میں جو کچھ پلایا گیا تھا اس سے میرے جسم میں کافی تروتازگی اور توانائی آگئی تھی۔ میں نے نکتے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ جانے میں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو چار دیوڑیاں مجھے بڑی محبت سے جگا رہی تھیں۔ کوئی میرے ہاتھوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی، کوئی میرے بازو دبا رہی تھی، کوئی میری ہتھیلیوں پر اپنے ہاتھ سے مالش کر رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کس لیے آئی ہو؟“

ان میں سے ایک موٹی آنکھوں والی دیوڑاسی نے مسکرا کر کہا۔

”پریمی جی! ہم تمہیں لینے آئی ہیں۔“

”کہاں؟ کہاں لے جا رہی ہو مجھے؟ میں نہیں جاؤں گا۔“

میں پہلے ہی سے ان عورتوں کے تشدد سے ڈرا ہوا تھا۔ چاروں دیوڑاسیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ جھکی ناک والی دیوڑاسی نے کہا۔

”سمہاراج! آپ کو اشنن کوا کر نئے ریشی کپڑے پہنا کر آکاش کی سیر کرائی جائے گی۔ چلئے اٹھئے۔ آجائیں ہمارے ساتھ آپ کو آکاش کی سیر سے بڑی خوشی ہوگی۔“

اور وہ مجھے کھینچتے ہوئی دروازے کی طرف لے گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دروازے کے باہر بالوں کی طرف دوڑتی ہوئی جا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ دروازے سے باہر کھینچ لیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میرے حلق سے خوف کے مارے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ میں ایک نیم روشن راہ داری میں سے گزر رہا تھا۔ دیوڑاسیاں مجھے کھینچتے ہوئی ایک کشادہ ہال کمرے میں لے گئیں جہاں دیواروں پر کیسری رنگ کے ریشی پردے گرے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ ان پر گلاب اور گیندے کے پھولوں کے ہار بکھرے ہوئے تھے اور

پہلے ہی سے دس بارہ دیوڑاسیاں جیسے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے قالین پر گرا دیا اور آن کی آن میں مجھ پر بھوکی لومڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

اس کے بعد میرا کیا حال ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھ پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ میں بالکل ادموا ہو کر نیم بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد بھی ان لومڑیوں نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر اپنا تشدد جاری رکھا۔ وہاں بھی ناگ مورتی والے کمرے کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا تھا اور میرے حواس جواب دینے لگے تھے۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ نہ جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا ہوں گا کہ کسی نے مجھے کندھے سے ہلایا۔

”پریمی اٹھو۔ میرے پریمی اٹھو۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہی جھکی ناک والی دیوڑاسی مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھا تو میرا سر چکرا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیوڑاسی میرے سر کو دبانے لگی۔ پھر اس نے قریب رکھا ہوا گلاس والا دودھ میری طرف بڑھا کر کہا۔

”اس کو پی لو۔ پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔“

یہ سن کر میرے تن ہاتھوں میں جیسے جلن پڑ گئی۔ میں جلدی سے دودھ والا گلاس چڑھا گیا اور دیوڑاسی سے کہا۔

”جلدی چلو۔“

وہ اٹھ کر دروازے پر گئی۔ باہر جھانک کر راہ داری میں دیکھا۔ واپس آ کر کہنے لگی۔

”آ جاؤ۔ اس وقت سب سو رہے ہیں۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم نیم روشن راہ داری میں سے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ راہ داری ایک جگہ گھوٹی تو سامنے دیوار آگئی۔ دیوڑاسی نے آگے بڑھ کر فرش پر سے ایک تختہ اوپر اٹھا دیا۔ نیچے بیڑھیاں تھیں۔ میں اس کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ یہ

کوئی تہ خانے کا غار تھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ دیوداسی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ چلا رہی تھی۔ ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ ہم ایک اور راہ داری میں آ گئے۔ یہاں دیوار پر کہیں کہیں لالین روشن تھیں۔ دیوداسی نے آہستہ سے کہا۔

”خبردار! پاؤں کی آہٹ پیدا نہ ہو۔“

میں پاؤں دبا دبا کر چلنے لگا۔ راہ داری ایک دالان کے دروازے پر جا کر ختم ہو گئی۔ آگے دالان میں قالینوں پر جگہ جگہ عریاں اور نیم عریاں دیوداسیاں گہری نیند سو رہی تھیں۔ ہم دبے پاؤں ستونوں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمارے پیچھے کسی مڑکی آواز بلند ہوئی۔

”ان کو پکڑ لو۔“

اس کے ساتھ ہی سامنے سے چھ سات بڑے کٹے جھٹی ہاتھوں میں شین گنیں لیے نمودار ہوئے اور انہوں نے ہمیں اپنی حراست میں لے لیا۔ دیوداسی خوف کے مارے کانپنے لگی۔ یہ جھٹی اسی قسم کے جھٹی تھے جیسے میں نے شیطان صفت جاگیردارانی کی حویلی میں دیکھے تھے۔ پیچھے سے جس آدمی نے آواز دی تھی وہ بھی آگیا۔ ہٹا کٹا جھٹی تھا۔ سر پر طوطے کے پروں والی ٹوپی تھی۔ ایک برین گن کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ ایک شین گن اس کے ہاتھ میں تھی جس کا رخ ہماری طرف تھا۔

اسی وقت میرے اور دیوداسی کے ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیے گئے اور جھٹی سپاہی ہمیں کھینچتے ہوئے ایک کوٹھڑی میں لے آئے۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے ہمیں اندر دھکیل کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ ہم اندھیرے میں حیران پریشان اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے دیوداسی کے ہولے ہولے سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”دیوی! گھبراؤ نہیں۔ ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔“

میں نے یوں ہی اسے اور کچھ اپنے آپ کو تسلی دینے کے خیال سے یہ جملہ کہہ دیا

تھا، ورنہ وہاں سے فرار ناممکن تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا تھا۔ یہ بڑے کٹے جھٹی سپاہی دکھتا نے شاید اسی لیے وہاں رکھے ہوئے تھے کہ کوئی فرار نہ ہونے پائے۔ ہم اندھیرے میں بے بسی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ خدا جانے کتنا وقت گزر گیا ہو گا کہ باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ راہداری کی ہلکی سی روشنی اندر آئی۔ یہ چار جھٹی تھے۔ انہوں نے شین گنیں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔ ہمیں کوٹھڑی میں سے تھکیٹ کر نکالا گیا اور کھینچتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس کمرے میں دکھتا ایک شاندار بڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے دو دیوداسیاں کھڑی مور کے پروں کے مور چھل ہلا رہی تھیں۔ اس نے مجھے اور دیوداسی کو قہر بھری نظروں سے دیکھا اور جھٹی سپاہیوں سے کہا۔

”ان دونوں نے سو رگ کے اصولوں کو توڑا ہے۔ انہوں نے مہاپاپ کیا ہے۔ انہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔“

دیوداسی سجدے میں گر پڑی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

”مہامیا! مجھ پر رحم کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بھول ہو گئی، مجھ پر دیا کرو۔ میں معافی مانگتی ہوں۔“

دکھتا کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بھی نہیں پہچان رہی تھی۔ دکھتا نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر ہماری موت کا حکم صادر کر دیا۔ کہنے لگی۔

”ان دونوں کو مہاناگ کی عمارت میں پھینک دو۔ لے جاؤ ان کو۔“

دیوداسی کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ گڑگڑا، گڑگڑا کر دکھتا سے رحم کی اپیل کر رہی تھی مگر دکھتا نے جیسے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ اٹھ کر جا چکی تھی۔ مسلح جھٹی ہم دونوں کو کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ایک نیم تاریک راہداری میں سے گزرنے کے بعد سڑھیاں آ گئیں۔ سڑھیوں کے آگے ایک بند دروازہ تھا۔ یہاں آتے ہی دیوداسی نے چیل ماری اور گڑگڑا کر جھٹیوں سے کہا۔

خاص پوزیشن بنائی اور آگے بڑھا ہی تھا کہ سانپ نے اپنا پھن سمیٹ لیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنے پتاؤ کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اچانک سانپ نے اپنے منہ کو کھولا اور آگے کو جھٹک دیا۔ اس کے منہ سے سیاہ رنگ کا ایک موتی نکل کر میری طرف لڑھکتا ہوا آیا تو دیوداسی نے فرط مسرت سے گھبرا کر کہا۔

”مہاناگ نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا ہے۔ اس نے اپنا قیمتی مروہ تمہیں بخش دیا ہے۔ یہ مروہ مہاناگ نے آج تک رات دن پوجا کرنے والے اپنے پجاریوں کو بھی نہیں دیا۔“

میں نے سیاہ موتی جس کو دیوداسی نے مروہ کہا تھا اٹھا کر غور سے دیکھا۔ وہ ایک عام قسم کا سیاہ پتھر تھا مگر اس کے اندر سے جیسے ہلکی ہلکی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ نے اب اپنا پھن کھول لیا تھا۔ سانپ نے اپنے پھن کو یوں آگے پیچھے لہرایا جیسے کہہ رہا ہو۔

”ہاں۔ یہ مروہ تمہارے لیے ہے اسے رکھ لو۔“

میں نے سانپ کا مروہ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ دیوداسی کا خوف اب دور ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے بار بار سانپ کے آگے سر جھکا کر کوئی اشلوک پڑھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس مہاناگ کا یا جو کوئی سانپ بھی وہ تھا اس نے میرے جسم سے نکلنے والی سانپ کی مخصوص بو کو محسوس کر لیا ہے اور وہ سمجھ گیا ہے کہ میں وہ انسان ہوں جو سانپ بھی بن سکتا ہوں یا بن جاتا ہوں۔ اس مہاناگ نے میری عزت افزائی کی تھی۔ اس نے مجھے نہ صرف اپنی نسل کا سانپ سمجھا تھا بلکہ اپنے سے برتر سانپ بھی سمجھا تھا کیونکہ میں سانپ سے انسان کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔

مہاناگ نے اپنا پھن سمیٹا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف کو چلا گیا۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

”تمہارے مہاناگ نے تو ہمیں کچھ نہیں کہا۔ اب یہ بتاؤ کہ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ تمہیں معلوم ہے؟“

”مجھے مہاناگ کے غار میں نہ ڈالو۔ مجھے مہاناگ کے غار میں نہ پھینکو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

ایک جھٹی نے ہمارے ہاتھ کھول دیے۔ دوسرے جھٹی نے غار کے دروازے کی چھوٹی کھڑکی ذرا سی کھولی اور ہم دونوں کو باری باری دھکا دے کر اندر گرا دیا اور کھڑکی فوراً بند کر دی۔ اندر اندھیرے میں گرتے ہی دیوداسی کی گھٹلی بندھ گئی۔ اس پر موت کا خوف پوری طرح حلوٰی ہو چکا تھا۔ اتنے میں اندھیرے میں پھنکار کی آواز آئی۔ دیوداسی نے چیخ ماری اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ یہ پھنکار کسی بڑے سانپ کی تھی۔ میں نے پھنکار سے پہچان لیا تھا۔ غار میں اس بڑے سانپ کی ایک خاص قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں اگر سانپ کے روپ میں ہوتا تو اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا، لیکن میں انسانی روپ میں تھا اس لیے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس گھپ اندھیرے میں ایک طرف سے ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی۔ دیوداسی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ خوف کے مارے اس کا دل مجھے دھک دھک کرتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔

میری نگاہیں اس دھندلی سی روشنی کو دیکھ رہی تھیں جو غار میں ایک طرف نمودار ہوئی تھی اور پھلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا کم ہو رہا تھا۔ میں نے غار کے آخری سرے پر سے ایک بڑے سانپ کو دیکھا جس کا کلنی بڑا پھن کھلا تھا۔ یہ روشنی اس کی آنکھوں میں سے نکل رہی تھی۔ میں نے ایسا سانپ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ مجھ سے پانچ چھ قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ وہ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا پھن زمین سے کچھ نہیں تو چار فٹ ضرور بلند تھا۔ کلنی بڑا سانپ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو تقدیر یا حالات کے حوالے کرنے کی بجائے سانپ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سانپ کے منہ سے اب پھنکاریں نہیں نکل رہی تھیں۔ دیوداسی کی دہشت کے مارے آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ وہ میرے پیچھے کئی سکیں بھر رہی تھی۔ میں نے سانپ کی گردن دوپٹے کے لیے ایک

دیوداسی نے میرے پاؤں چھو لیے اور کہنے لگی۔
 ”ہمارا ج آپ مہانگ کے اوتار ہیں۔ مہانگ نے آپ کو اپنا مہو اہرن کیا
 ہے۔ آپ کے مدد سے میری جان بھی بچ گئی۔“
 میں نے اسے کہہ دیا۔

”ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلیں کیسے؟“
 سنپ کے چلے جانے کے بعد غار میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ دیوداسی کہنے لگی۔
 ”ہمارا ج! جدھر مہانگ جی گئے ہیں اسی طرف چلیں۔ شاید ادھر کوئی باہر جانے کا
 راستہ ہو۔“

میں اندھیرے میں دیوار کا سہارا لیے جس طرف سنپ گیا تھا اسی طرف چل پڑا۔
 دیوداسی نے میرے کندھے کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ یہ دیکھ
 کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ غار آگے جا کر ایک طرف کو مر گئی تھی۔ سنپ کے بارے
 میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ تھوڑا اور آگے گئے تو مجھے ایسی آواز
 آنے لگی جیسے پانی گر رہا ہو۔ دیوداسی بولی۔

”ہمارا ج! میں نے سنا ہے کہ اس کے نیچے ایک ندی بہتی ہے۔ شاید یہ وہی ندی
 ہے۔“

میرے کان پانی کے گرنے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ
 رہے تھے آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر دھندلی دھندلی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا
 دکھائی دینے لگا۔ پانی کی آواز زیادہ قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ پھینکی روشنی کے
 غبار میں ہم غار میں ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں ایک تنگ سی ندی پتھروں کے
 درمیان بہہ رہی تھی۔ ندی آگے جا کر ایک طرف کو گھوم گئی تھی۔ ندی کی ایک جانب
 دیوار تھی۔ دوسری جانب پتھروں پر چلنے کا فٹ پاتھ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں اندھیرا زیادہ
 نہیں تھا۔ روشنی کا غبار اس طرف سے آ رہا تھا جس طرف ندی گھوم جاتی تھی۔ ہم
 ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ مجھے تازہ ہوا کا بھی احساس ہوا۔ یہ ندی ضرور کسی

کھلی جگہ پر جا کر نکلتی تھی۔ ندی کے ساتھ ہم بھی مڑ گئے۔
 سامنے ایک بہت بڑا گول سوراخ دکھائی دیا جس میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی
 تھی۔ ہم اس سوراخ کی طرف بڑھے جو اس غار کا دہنہ تھا۔ وہاں سے ندی ایک جانب
 خلیب میں اتر گئی تھی۔ میں نے کھلی فضا میں آتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور اوپر آسمان
 پر نگا ڈالی۔ آسمان پر کوئی ستارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید بدل چھلے ہوئے تھے۔ ان
 بادلوں میں سے ستاروں کی روشنی دھندلے اجالے کی شکل میں باہر آ رہی تھی۔
 دیوداسی اپنے بھگوان کا شکر ادا کرنے لگی تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا۔

”تم لوگوں نے جو خیالی سورگ بنا رکھا تھا وہ محض ایک دھوکا تھا۔ ورنہ یہ ندی
 زمین پر کیسے آسکتی تھی۔“
 دیوداسی کہنے لگی۔

”ہمارا ج! ہمیں تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ دکھتا جی نے ہمیں یہی کہا تھا کہ یہ
 سورگ دیوتوں نے اپنے ہرام کے لیے آکاش کے بادلوں میں بنایا ہوا ہے۔“
 میں نے کہہ دیا۔

”ان فضول باتوں کو بھول جاؤ اور غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ کیا تم اس جگہ کو پہچانتی
 ہو؟“

میرا خیال تھا کہ یہ عورتیں اسی علاقے کی رہنے والی ہوں گی اور ہو سکتا ہے
 دیوداسی کو معلوم ہو کہ یہاں سے کسی دوسرے شہر کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ دیوداسی
 چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہہ دیا۔

”ہمارا ج! میں یہ جگہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

میں نے کہہ دیا۔

”تو پھر میرے ساتھ آ جاؤ۔“

میں اسے لے کر جنوب کی سمت چل پڑا۔ وہاں نہ کوئی کھیت تھا نہ کسی دیہات
 کی روشنی ہی نظر آ رہی تھی۔ لوہنی نیچی زمین چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھری ہوئی

تھی۔ میں نے صرف اتنی عقلندی کی کہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ آگے جا کر اس ندی کے کنارے کوئی نہ کوئی گاؤں وغیرہ ضرور ہوگا۔ میں نے دیوداسی سے پوچھا۔

”تم اب کہاں جانا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔

”مہاراج! میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں نے دکھتاجی کے سوگ میں ہی آنکھ کھولی تھی۔“

تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟ میں تمہیں اپنے ساتھ تو بالکل نہیں لے جاسکتا۔“

دیوداسی نے آہ بھر کر کہا۔

”راستے میں کوئی مندر آئے تو مجھے وہاں چھوڑ دیں، میں وہیں پوجا پاٹھ کر کے جیون گزار لوں گی۔“

ندی کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ رات کے دھندلکے میں مجھے کھیت نظر آنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی گاؤں وغیرہ ضرور ہوگا۔ گاؤں تو نہ آیا لیکن چلتے چلتے ایک جگہ اچانک ریلوے لائن آگئی۔ ریلوے لائن کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

”ریلوے لائن آئی ہے تو کوئی نہ کوئی سٹیشن بھی یہاں کہیں ضرور ہوگا۔“

اور ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری دونوں جانب کھیت تھے جن میں فصل اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں تاز اور ناریل کے درختوں کے خاکے بھی نظر آ رہے تھے۔ آخر دور سے مجھے ریلوے لائن کی ایک جانب روشنیاں چمکتی نظر آ گئیں۔ یہ ریلوے سٹیشن کی روشنیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ ان میں ایک سرخ رنگ کی روشنی بھی تھی جو ریلوے سٹیشن کی روشنی تھی۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

”یہاں سے ہم کسی گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔ گاڑی کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور

جائے گی۔ وہاں میں تمہیں کسی مندر میں پہنچا کر آگے نکل جاؤں گا۔“

مجھے یہ پریشانی بھی لگی تھی کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ ٹرین پر کسی طرف بھی سفر کرنے کے لیے ٹکٹ ضرور خریدنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو بغیر ٹکٹ بھی سفر کر سکتا تھا لیکن میرے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس کا بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے یونہی اس دیوداسی سے پوچھا کہ اس کے پاس کچھ پیسے ہوں گے۔ اس نے کہا۔

”ہاں مہاراج! میں ہر وقت اپنے پاس کچھ پیسے چھپا کر رکھتی ہوں۔“

اس نے ساڑھی کے اندر ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا روپل نکالا۔ اسے کھول کر تین مڑے مڑے نوٹ میرے حوالے کر دیے۔ میں نے رات کے دھندلکے میں انہیں آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھا تو وہ پچاس پچاس کے تین نوٹ تھے۔ میرے سر سے بہت دبا بوجھ اتر گیا۔ میں نے ایک نوٹ لے کر رکھ لیا۔ باقی اسے واپس کر دیے۔

”یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔“

ہم ریلوے لائن پر چلتے چلتے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر آ گئے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ یہ ناگ پور اور جبل پور کے درمیان کوئی سٹیشن ہے۔ اس سٹیشن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے بھوپال جانے والی گاڑی کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ بھوپال جانے کے لیے مجھے وہاں سے ناگ پور جانا ہوگا۔ ناگ پور سے بھوپال جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ جسے میں جادو کی مہماری سے نکل کر عہد حاضری جدید دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

”تم ایسا کرو کہ ناگ پور تک میرے ساتھ چلو۔ ناگ پور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں ناگ مندر بھی ہیں تم ناگ پور اتر جاؤ۔“

دیوداسی خوش ہو کر بولی۔

”مہاراج میں ناگ پور ہی جاؤں گی۔ وہاں مہاناگ کا ایک مندر ہے۔ میں وہیں

وہ کرناگ دیوتا کی پوجا کیا کروں گی۔“

میں نے ناگ پور کے دو ٹکٹ خرید لیے۔ باقی میرے پاس صرف پندرہ روپے بچے۔ میں نے دیوداسی سے کہل۔
”مجھے ناگ پور سے آگے بھوپال جانا ہے۔ اس واسطے میں نے ریل کے کرائے کے لیے یہ پیسے رکھ لیے ہیں۔“
وہ بولی۔

”مہاراج! آپ اور پیسے لے لیں۔ مجھے ناگ دیوتا کے مندر میں پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

میں اس سے زیادہ اس عورت کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ناگ پور سے بھوپال کا کتنا کرایہ لگتا ہے۔ اتنا ضرور اندازہ تھا کہ ناگ پور سے بھوپال کلنی دور ہے۔ دن چڑھے ایک ٹینجر ٹرین آ کر رکی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرین ناگ پور کی طرف چل پڑی۔ دو تین گھنٹے ٹرین کا سفر جاری رہا۔ آخر ناگ پور کے مضافات شروع ہو گئے۔ ناگ پور وسطی بھارت کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ یہاں بے شمار فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ ایک دریا بھی شہر کے قریب بہتا ہے۔ جب ٹرین ناگ پور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر ٹھہر گئی تو دیوداسی نے ہاتھ جوڑ کر میری طرف دیکھ کر پھر میرے پاؤں کو چھوا اور بولی۔

”مہاراج! مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو شاکر دیجئے گا۔ کوئی پتہ نہیں اب کب آپ کے درشن ہوں۔“
میں نے کہل۔

”کوئی بات نہیں۔ قسمت میں لکھا ہوگا تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جگہ ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ تم ناگ مندر اکیلی پہنچ جاؤ گی نا؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہل۔

”کیوں نہیں مہاراج! ناگ مندر تو یہاں کا بہت بڑا مندر ہے۔“

دیوداسی نے ایک بار پھر میرے چہرے چھونے اور ٹرین سے اتر کر چلی گئی۔ میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے تو یہاں سے بھوپال جانے والی گاڑی پکڑنی ہے۔ میں جلدی سے اتر گیا۔ ایک قلی سے دریافت کیا کہ بھوپال کی گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک گاڑی ابھی ابھی گئی ہے۔ اب دو گھنٹے بعد ایک پنجر ٹرین جائے گی۔ میں پلیٹ فارم سے نکل کر سٹیشن کی لابی میں اس جگہ آیا جہاں ساتھ ساتھ چار پانچ ٹکٹ گھروں کی کھڑکیاں تھیں۔ ایک ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے اوپر انگریزی میں اپ ٹرین لکھا تھا۔ وہاں مختلف سٹیشنوں کے نام بھی انگریزی اور ہندی میں درج تھے۔ ان میں بھوپال کا نام بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ بھوپال تک کا کرایہ پندرہ روپے سے زیادہ ہے۔ میرے پاس صرف پندرہ روپے ہی تھے۔ سوچنے لگا کیا کروں۔ آخر گاڑی میں بغیر ٹکٹ بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ میرا بھوپال پہنچنا بھی ضروری تھا۔ میں اوھر اوھر سے چکر لگا کر پلیٹ فارم پر واپس آ گیا۔ بھوپال جانے والی گاڑی آخری پلیٹ فارم سے چلتی تھی۔ میں وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ کونے میں ایک ٹی ٹال نظر پڑا۔ وہاں میں نے تھوڑا بہت جو کچھ ملا کھایا اور چائے بھی پی۔ جسم میں نئی تازگی آ گئی۔ بیچ پر بیٹھ گیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین جبل پور سے آ رہی تھی۔ وہ لیٹ تھی۔ بہر حال آ گئی۔ کافی رشن تھا ٹرین میں۔ بغیر ٹکٹ سفر کے لیے رشن والی ریل گاڑی بڑی محفوظ ہوتی ہے اور پنجر ٹرینوں میں ویسے بھی کم ٹکٹ چیکر آتے ہیں۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ناگ پور بڑا جگشن تھا۔ وہاں ٹرین کلنی دیر تک رکی رہی۔ پھر کہیں جا کر انجن نے وسل دیا اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر کھینکے گئی۔

میں نے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے جہنم سے نجات نکال دیا تھا۔ میری منزل میرے سامنے تھی۔ مجھے کلمتہ خالد اور جیلہ کا خیال آنے لگا۔ اس وقت کے تصور سے میری آنکھوں میں

خوشی کے آنسو آگئے جب میں جیلہ کے سامنے انسانی روپ میں موجود ہوں گا۔ وہ مجھے میری اصلی شکل میں دیکھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ مجھے ناگن درگا کا بھی خیال آیا۔ میں نے سوچ لیا کہ بھوپال پہنچنے ہی میں بھیروں جی کے مندر میں جاؤں گا اور ناگن درگا کو تلاش کر کے اس کا منہ چوم کر اسے سلتپ سے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ وہ بے چاری نہ جانے مجھے کس کس تلاش کرتی پھرتی ہوگی۔

ٹرین آہستہ آہستہ ناگ پور کے بہت بڑے ریلوے یارڈ میں سے گزری تھی۔ ناگ پور کے مضافات سے نکلنے ہی ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ وہ کوئی میل یا ایکسپریس ٹرین نہیں تھی۔ ایک خاص لگی بندھی رفتار سے جا رہی تھی۔ مجھے بھوپال پہنچنا تھا اور گاڑی مجھے بھوپال ہی کی طرف لیے جا رہی تھی۔ دوپہر کے تین بجے کے قریب گاڑی ناگ پور سے چلی تھی۔ پنجر گاڑی تھی۔ ہر دوسرے سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے رکتی۔ شام ہوگئی۔ اس دوران ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آیا تھا اور ڈبے کے رش کو دیکھ کر یقین بھی نہیں تھا کہ کوئی چیکر ٹکٹ چیک کرنے آئے گا۔ جیسے ہی رات پڑی بارش شروع ہوگئی۔ معلوم نہیں آپ کبھی ان علاقوں کی طرف گئے ہیں یا نہیں۔ یہ بھارت کے وسطی جنگلوں کا علاقہ تھا جسے ست پڑا ریج کہتے ہیں۔ یہ جنگل انتہائی گھنے، دشوار گزار اور دلدلوں، جوہڑوں، خونخوار درندوں، زہریلے سلتپ پھوسوں اور طرح طرح کے انسان دشمن حشرات الارض سے بھرے ہوئے ہیں۔ بھوپال سے ناگ پور کی طرف ہوشنگ آباد کے قریب تو یہ جنگل اتنے گھنے ہو جاتے ہیں کہ دن کے وقت بھی وہاں اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یہ بارانی جنگل ہیں اور تقریباً سارا سال ہی یہاں بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔

ٹرین اپنی نہی تلی رفتار سے جگہ جگہ رکتی چلتی رہی۔ یہ علاقہ کہیں پہاڑی تھا اور بڑے شیب و فراز تھے۔ کہیں ہموار زمین شروع ہو جاتی۔ ٹرین دریاؤں، ندی تالوں، گھنے تاریک جنگلوں میں سے رات کے اندھیرے اور بارش کے شور میں گزرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رات گزر گئی۔ دن نکل آیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی مگر آسمان

گھرے بلوٹوں میں چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے دن کی روشنی بہت مدھم تھی۔ ٹرین ست پڑا ریج کے جنگلوں میں رات کو ہی داخل ہو چکی تھی۔ میں اپنی دوسری مصیبتوں میں اس حقیقت کو تقریباً بھول ہی چکا تھا کہ میں جملہ کشمیر کا ایک کمائڈو بھی ہوں اور بھارت میں مقبوضہ کشمیر کی فوجی جارحیت کے جواب میں کئی دھماکے کرا چکا ہوں اور دلی بھوپال اور مشرقی پنجاب کی پولیس میری تلاش میں ہے۔ میں اس بات پر بڑا خوش تھا کہ جاگیردارانی کی قاتل حویلی اور دکھتا کے منحوس سورگ سے جان بچا کر بھاگ آیا ہوں۔ لیکن جب ایک سٹیشن پر گاڑی رکی اور پلیٹ فارم پر تین پولیس والوں کو ایک جگہ کھڑے دیکھا تو ایک دم چوکس ہو گیا اور یاد آ گیا کہ میں بھوپال پولیس کو بھی مطلوب ہوں اور آگے بڑا شر بھوپال ہی آ رہا ہے لیکن میرا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ پولیس کے پاس اگر میرا فوٹو بھی ہوتا تو وہ مجھے مشکل ہی سے پہچان سکتی تھی۔

میری ڈاڑھی مونچھیں کافی بڑھ چکی تھیں۔ سر کے بال بھی لمبے ہو گئے تھے۔ لباس وہی جیکٹ اور چٹون تھی جو کافی پرانا ہو گیا ہوا تھا۔ رنگ بھی تھوڑا سا نولا ہو گیا تھا۔ اس کے بلوٹوں میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ حالانکہ میرا چائے کو بہت جی لپٹا رہا تھا۔ مگر میں ڈبے سے باہر نہ نکلا۔ ٹرین وہاں کچھ دیر کے لیے رک کر آگے چل پڑی۔ پولیس کے آدمیوں کی شکلیں دیکھ کر میں خبردار ضرور ہو گیا تھا۔ دن کے ایک بجے کے قریب ٹرین ایک سٹیشن پر رکی تو معلوم ہوا کہ یہاں انجن بدلی کیا جائے گا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ یہ کوئی اچھا خاصا شہر لگتا تھا۔ تین چار پلیٹ فارم تھے سٹیشن کے۔ یہاں ایک سٹل پر کھڑے ہو کر میں نے کھانا کھایا، چائے پی اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ یہاں بھی پولیس کے کچھ سپاہی نظر آ رہے تھے مگر وہ مجھ سے دور تھے۔ میں محتاط ہو چکا تھا۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر ٹہلنے رہنے کی بجائے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین کافی دیر وہاں رکی پھر آگے روانہ ہو گئی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک سٹیشن آیا جس کا نام چندواڑہ تھا۔ یہ بھی کافی بارونق اور بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ معلوم ہوا کہ ناگ پور اور بھوپال کے درمیان یہی ایک بڑا

شر اور ریلوے کا جنکشن ہے۔ وہاں سے آگے بھوپال ہی بڑا شہر تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بڑا خوش ہوا کہ اپنی انسانی وضع قطع اور انسانی روپ کو برقرار رکھتے ہوئے میں بھوپال کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ خدا نے چلا تو میں اپنی انسانی شکل میں ہی جیل سے جا کر ملوں گا۔ جیل سے ملنے کے خیال سے میرا دل بے حد مسرور تھا۔ چند واڑہ کے شیش پر نرین نے کافی دیر لگا دی۔ میں نے پلیٹ فارم پر دو بار چائے پی۔ وہاں مسافروں کا اس قدر ہجوم تھا اور ان کی نقل و حرکت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ چند واڑہ سے نرین چلی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے اپنے ساتھ والے مسافر سے پوچھا کہ بھوپال گاڑی کس وقت پہنچے گی۔ اس نے کہا۔

”بھائی صاحب پہنچنے کو تو یہ اپنے ٹائم پر ہی پہنچے گی مگر ریلوے کا ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ آگے ہارشوں کی وجہ سے ایک ہل ٹوٹا ہوا ہے۔ وہاں دیر لگ جائے گی۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”اگر ہل ٹوٹا ہوا ہے تو گاڑی آگے کیسے جائے گی؟“

وہ بولا۔

”ارے بھائی صاحب ہل کے ایک طرف گاڑی کڑی ہو جائے گی۔ نرین کے سارے مسافر اتر کر ہل کی دوسری طرف جائیں گے۔ ہل کی دوسری طرف مسافروں کو لینے ایک دوسری گاڑی آئے گی اور ہم لوگ اس گاڑی میں بیٹھ کر بھوپال جائیں گے۔ کیا سمجھے؟“

میں نے پوچھا۔

یہ کسی دریا کا ہل ہے کیا؟

”نہیں بھائی صاحب یہ دریا کا ہل نہیں ہے کسی برساتی ٹالے کا ہل ہے۔ کہتے ہیں کہ کافی لمبا ہل ہے۔ پچھلے دنوں ادھر بڑی بارشیں ہوئی تھیں، ان بارشوں کی وجہ سے ہل کے دو ستون بیٹھ گئے ہیں۔“

مجھ پر ایسی سی چٹائی۔ پھر سوچا کہ چلو جہاں سارے مسافر نرین سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے ہل کی دوسری طرف جائیں گے میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں گا اور دوسری طرف جو نرین آئے گی اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ آخر ریلوے والے مسافروں کو بچ جنگل میں تو نہیں چھوڑ دیں گے۔ دوسری نرین تو ضرور آئے گی۔ کمند دو گھنٹے اور لگ جائیں گے پھر کیا ہوا۔

چند واڑہ بت پیچھے رہ گیا تھا اور نرین ست پڑا ریل کے گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔ آخر وہ ہل آگیا جو بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بت پہلے ہی ہلکی ہو گئی۔ ڈبے میں مسافر کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ میرے ساتھ جو مسافر بیٹھا تھا اس نے بھی باہر جھانک کر دیکھا اور کہنے لگا۔

”لیجئے بھائی صاحب وہ کم بخت ٹوٹا ہوا ہل آگیا ہے۔ اب چند واڑہ کے جنگل میں سے پیدل گزرنے کی تیاری شروع کر دیں۔“

میں نے یونسی کہہ دیا۔

”سنا ہے ان جنگلوں میں شیر چیتے اور سانپ بست ہوتے ہیں۔“

اس نے کاتوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”ابھی صاحب ایسے ایسے آدم خور درندے ہوتے ہیں کہ سوئے ہوئے آدمی کو جمو پڑوں کے اندر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”ہمیں نرین سے اتر کر ہل کی دوسری طرف ریلوے لائن تک تو جنگل میں پیدل ہی چلنا ہو گا۔“

وہ بولا۔

”بس آپ دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی رہیں ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ آدمیوں کے ہجوم کو دیکھ کر شیر چیتے قریب نہیں آتے۔ ہل سانپوں کا خطرہ ضرور ہو گا۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ساتپوں کی مجھے پروا نہیں ہے۔“

وہ آدمی جو پڑھا لکھا نوجوان تھا میری طرف حیرت سے نکتے لگا۔

”کیوں بھائی صاحب! کیا آپ سپرے ہیں؟“

میں نے فوراً ”سنبھل کر کہا۔

”ارے نہیں بھائی جان۔ میرا مطلب تھا کہ آدمی ساتپ کو دیکھ کر ذرا ادھر ادھر

ہو جائے تو بچ سکتا ہے مگر شیر چیتے سے تو نہیں بچ سکتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”لیکن جناب ہم نے سنا ہے کہ ست پڑا کے

جنگلوں میں ایسے ایسے ساتپ ہوتے ہیں کہ جو دور سے آدمی پر زہر کی پککاری بھیجتے

ہیں اور آدمی وہیں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔“

ساتپوں کے معاملے یہ آدمی بھی عام آدمیوں کی طرح اناڑی تھا۔ اسے یہ بھی

معلوم نہیں تھا کہ دنیا کا کوئی بھی ساتپ کیوں نہ ہو اگر وہ آدمی کو ڈس لے تو آدمی کبھی

نہیں تڑپتا۔ ساتپ کا زہر سرد ہوتا ہے اور اس کا اثر سیدھا اعصاب پر جا کر ہوتا ہے۔

ساتپ کے ڈسنے سے آدمی کے اعصاب مفلوج ہونے لگتے ہیں اور اس پر غنودگی طاری

ہو جاتی ہے۔ زیادہ زہریلا ساتپ ہو تو آدمی کے منہ، ناک، کان سے خون جاری ہو جاتا

ہے۔ اس سے بھی زیادہ زہریلا ساتپ ہو تو آدمی کا جسم ٹرخنا شروع ہو جاتا ہے مگر آدمی

تڑپتا بالکل نہیں۔ میں ساتپوں کے خیال سے اس لیے پریشان نہیں تھا کہ ساتپ کا زہر

مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا تھا۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ

میرے بدن سے بار بار ساتپ کا روپ بدلتے رہنے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی

ساتپ کی بو خارج ہوتی رہتی ہے۔ جس کو آدمی محسوس نہیں کر سکتا مگر ساتپ فوراً

محسوس کر لیتا ہے اور اس بو کی وجہ سے وہ مجھے اپنی نسل کا سمجھ کر مجھ پر حملہ نہیں

کرتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اس کا زہر مجھے کچھ نہیں کہتا۔

ٹرین اب آہستہ آہستہ ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ وہ ایک جگہ رک گئی۔ ٹرین کی دونوں جانب جنگل ہی جنگل تھا۔

اونچے اونچے پھرتیوں والے درخت تھے۔ بھاڑیاں تھیں، اونچی اونچی گھاس تھی۔ بانس

کے گھن دار درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ ایک آدمی باہر سے آواز لگاتا گزر گیا کہ یہاں

سب مسافر اتر جائیں۔ آگے پل کے پار دوسری ٹرین کھڑی ہے۔ وہ ٹرین آگے جائے

گی۔ یہ ٹرین ہمیں سے واپس چلی جائے گی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرے ساتھی

نے کہا۔

”بیجے بھائی صاحب آگیا وہ محسوس پل۔ اب آجائے بیجے۔ خدا کرے کہ پل کی

دوسری طرف ٹرین پہلے سے موجود ہو۔“

ٹرین کے مسافر اپنا اپنا سامان لیے نیچے اتر رہے تھے اور ریلوے کو گالیاں دے

رہے تھے۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ میرا ساتھی مسافر بھی میری طرح اکیلا تھا اور اس کے

پاس بھی کوئی سامان نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

”بھائی صاحب بغیر سامان کے سفر کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔ جہاں جی چاہا اتر

جاؤ۔“

یہ بھی غنیمت تھی کہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل ضرور جھکے ہوئے

تھے۔ دن کا وقت تھا ابھی سورج غروب ہونے میں بھی کافی دیر تھی۔ مسافر ریلوے

لائن سے اتر کر پکڑ پکڑی پر ٹریک کی دونوں جانب آگے کو چلے جا رہے تھے۔ جنہوں نے

سامان اٹھا رکھا تھا۔ ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ میرا مسافر ساتھی میرے ساتھ ساتھ

چل رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے ان مسافروں پر فقرے چست کر رہا تھا

جو اتنا سامان لے کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ ریلوے لائن کی دونوں طرف جنگل دن

کے وقت بھی سنسنی تھا اور ایک عجیب قسم کا آبی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرا ساتھی کہنے

لگا۔

”آدمی ان جنگلوں میں آجائے تو پھر زندہ باہر نہیں نکل سکتا۔“

میں نے کہا۔

”لیکن ان جنگلوں میں شکاری بھی تو شیر کا شکار کرتے آتے ہیں۔ میں نے ان کے

بڑے قلعے کتبوں میں پڑھے ہیں۔“

وہ بولا۔

”اجی ان جنگوں میں شکاری بھی پھونک پھونک کر چلتے ہیں۔ یہاں کے شیروں نے بڑے بڑے نامور شکاریوں کو پھاڑ کھلایا ہے۔ خدا ان جنگوں میں کسی دشمن کو بھی نہ لائے۔“

کچھ دور چلنے کے بعد ہم ریلوے لائن کو چھوڑ کر نیچے خشک برساتی ٹالے میں اتر گئے۔ یہاں سے گزر کر مسافروں کو دوسری طرف لوہے ریلوے لائن پر جانا تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں، گھاس، لور درختوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آگے جانے والے مسافروں نے ایک سمت کا راستہ بنا دیا تھا باقی سارے مسافر اسی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ یہاں جگہ جگہ زنگ آلود بڑے بڑے پتھر لور زنگ آلود چٹانیں زمین سے نکلی ہوئی تھیں۔ میرا ساتھی چلتے ہوئے کبھی کبھی زور سے زمین پر پاؤں مارتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ کہنے لگا۔

”پاؤں کی دھمک سن کر اگر آس پاس کہیں سبب ہو تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ بھائی صاحب سانپ آدمیوں سے گھبراتا ہے۔“

یہ بات اس شخص نے سولہ آنے سچ کہی تھی۔ مسافروں کو برساتی ٹالے میں گزرتے ایک ٹھنڈے لگ گیا۔ جب ہم چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف ریلوے لائن پر پہنچے تو یہ دیکھ کر سب مسافروں میں ہلچل مچ گئی کہ وہاں کوئی ٹرین نہیں کھڑی تھی۔ میرے ساتھی نے کہا۔

”بھارت کی ریلوے کا محل بھی یہاں کی حکومت جیسا ہی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ ہل کی دوسری طرف تو آگئے ہیں ٹرین بھی آئی جائے گی۔“

مسافروں نے ریلوے ٹریک کی دونوں جانب اپنے اپنے سٹیشن کی ڈھیریاں لگا دیں اور ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے۔ میں بھی اپنے ریل گاڑی کے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ بڑا باتونی آدمی تھا اور بڑی طرح دار اردو بولتا تھا۔ اتنے میں بھوپال کی طرف سے

ریلوے لائن پر چلتی ہوئی ایک ٹرلی آئی جس کو دو مزدور ٹریک پر دھکیل رہے تھے۔ ٹرلی میں دو ریلوے کے کرم چاری بیٹھے تھے۔ ٹرلی ہمارے قریب آ کر لائن پر رک گئی۔ انہوں نے مسافروں کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ پیچھے ہو چکے آبلو کے قریب ہی ریلوے ٹریک اکٹڑ گئی ہے جس کی وجہ سے اب ٹرین کل دوپہر کے وقت ہی یہاں آ کر مسافروں کو بھوپال کی جانب لے جائے گی۔ مسافروں میں مرنی سی چھا گئی۔ کئی مسافروں نے بھارتی ریلوے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ریلوے کے افسروں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ابھی ایک بڑی ٹرلی آپ کے لیے کھانے پینے کا سٹیشن لے کر آ رہی ہے۔ یہ کھانا چنا آپ کو ریلوے کی طرف سے مفت دیا جائے گا۔ ہمیں آپ کی تکلیف کا احساس ہے لیکن یہ سب کچھ بارشوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہم معافی چاہتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا۔

”بھائی صاحب رات بسر کرنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔

”بندوبست کیا کرنا ہے۔ یہیں زمین پر پڑ رہیں گے۔“

وہ بولا۔

”آگ ضرور جلتی ہوگی۔ آگ کو دیکھ کر درندے ادھر نہیں آئیں گے۔“

رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ مسافروں نے ریلوے لائن کی دونوں جانب آگ کے الاؤ روشن کر لیے۔ اس دور میں کھانے پینے کا سٹیشن لے کر ریلوے کی ایک بڑی ٹرلی پہنچ چکی تھی۔ مسافروں نے دیکھتے دیکھتے سارا سٹیشن لوٹ لیا۔ ہمارے حصے میں کیلے کے بتوں میں بندھے ہوئے بریانی کے دو پیکٹ آئے تھے۔ ہم نے وہی کھائے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ رات گزر گئی۔ ساری رات ریلوے لائن کی دونوں جانب جنگل میں سے کسی شیر کے بولنے کی آواز آتی رہی۔ میرا ساتھی بار بار مجھے تسلی دیتا۔

”بھائی صاحب! فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ شیر آدم خور نہیں لگتا۔ میں آدم خور شیر کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ ویسے بھی ہم نے الاؤ روشن کر رکھا ہے۔ شیر ادھر

نہیں آئے گھ۔

رات گزر گئی۔ خوش قسمتی سے رات کو بارش نہ ہوئی۔ دن کے وقت آسمان صاف ہو گیا اور دھوپ نکل آئی۔ ریلوے لائن کے آس پاس میلہ سا لگ گیا تھا۔ عورتیں آگ جلا کر بیٹھ تیار کر رہی تھیں۔ بچے لائن کے ساتھ ساتھ پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں کوئی سپیرا مین بجاتا تھا دکھانے لوہر آگیا۔ اس نے پٹاری میں سے سٹپ نکالا اور بین بجاتے ہوئے تلاش دکھانے لگا۔ بچے اور کچھ بڑے بھی سپیرے کے ارد گرد دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ میں بھی یونہی دل بہلانے کے خیال سے وہاں چلا آیا۔ سپیرے کا رنگ سیاہ تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ داڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ گل پھلائے بین بجا رہا تھا۔ سامنے ایک سٹپ کنڈل مار کر بیٹھا اپنے پھن کو دائیں بائیں لہرا رہا تھا۔

جیسے ہی میں مجمع میں پہنچا سٹپ نے اپنے پھن کا رخ میری طرف کر دیا اور مجھے ٹنگلی ہاندھ کر نکلنے لگا۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن جب سپیرے نے بھی بین بجاتے ہوئے میری طرف گھوم کر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ سٹپ نے میرے جسم سے خارج ہونے والی سٹپ کی بو کو محسوس کر لیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گزشتہ دنوں اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میرے دونوں جانب کچھ دوسرے مسافر بھی کھڑے سٹپ کا تلاش دیکھ رہے تھے۔ سپیرے نے سٹپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سٹپ برابر ٹنگلی ہاندھے مجھے گھورتا رہا۔ سپیرے نے بین بجائی بند کر دی اور سٹپ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کرنے کی کوشش کی مگر سٹپ اس کے ساتھ سے نکل گیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔ سٹپ کو آتے دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو کر اوپر اوپر بھاگ گئے۔ میں بھی دوڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔ سپیرے نے لپک کر سٹپ کو دم سے پکڑ کر اٹھا لیا اور اسے زبردستی پٹاری میں بند کر دیا۔

اب سپیرا اس طرف بار بار دیکھنے لگا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی

موجود تھا۔ سپیرے نے پٹاری میں سے دوسرا سٹپ نکل کر تلاش دکھانے کی کوشش کی مگر وہ سٹپ بھی پھنکارتا ہوا میری طرف پرحال سپیرے نے اسے بھی پٹاری میں بند کر دیا اور مجمع کو غائب کر کے کہا آج کا تلاش ختم۔ سب لوگ واپس ریلوے لائن کے پاس اپنے اپنے ٹھکانوں پر آگئے۔ میں بھی اپنے ساتھی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ بولا۔

”کیوں بھائی صاحب! دیکھ آئے سٹپ کا تلاش؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں۔“

وہاں جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ باتنی نوجوان ساتھیوں اور سپیروں کے بارے میں کچھ اظہار خیال نہ کرتے۔ کتنے لگا۔

”بھائی صاحب اس علاقے کے سپیرے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کے گھروں میں جا کر عورتوں کے پرانے کپڑے مانگ کر لے جاتے ہیں۔ پھر اپنے کسی سٹپ کو عورت کا بلاؤز سٹھا کر اسے عورت کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ وہ ایسے سٹپ کا انتخاب کرتے ہیں جس کے ڈسنے سے عورت کم از کم اڑتالیس گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہو جائے۔ عمرے نہیں۔ بس پھر وہ اس عورت کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور علاج کرنے کے بہانے چار پانچ سو روپے ہتھیا کر عورت کو ہوش میں لاتے ہیں اور چل دیتے ہیں۔“

میرے کان اس باتنی مسافر کی طرف تھے اور آنکھیں جنگل کی طرف جانے والی ایک گھنڈی پر لگی تھیں۔ گھنڈی پر درختوں کے نیچے وہی سیاہ قلم سپیرا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا اور توڑی توڑی دیر بعد میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ شاید اسے میری پر اسرار شخصیت کا تھوڑا سا علم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے ساتھی سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے جنگل والی گھنڈی پر نگہ ڈالی۔ سپیرا غائب ہو چکا

تھ۔ وہ وہیں نہیں تھ۔ کلن دن نکل آیا تھا۔ جب مسافروں میں شور مچ گیا کہ گاڑی آگئی، گاڑی آگئی۔ دور سے انجن کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ پھر گاڑی کے دسل کی جھین بار بار سنائی دینے لگیں۔ مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ ٹرین بار بار دسل دے رہی تھی کہ ریلوے لائن پر کوئی نہ آئے۔ مسافروں نے لائن خلل کر دی تھی۔

ٹرین آکر رک گئی اور مسافر اس میں سوار ہونے لگے۔ میں اور میرا ساتھی بھی ایک ڈبے میں چڑھ گئے۔ ریلوے ٹریک کے آس پاس ایک بھی مسافر نہ رہا۔ اس کے بلجود انجن ایک منٹ تک کھڑے کھڑے دسل دتا رہا کہ اگر کوئی مسافر رہ گیا ہو تو وہ بھی آجائے۔ اس کے بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”ہم بھول کتنی دیر میں پہنچیں گے؟“

وہ بولا۔

”بھائی صاحب۔ چار پانچ گھنٹوں میں تو گاڑی ہو شنگ آبلو پہنچے گی۔ اس کے آگے

بھول مزید تین گھنٹوں کا سفر ہے۔“

اس کا مطلب تھا یہ ٹرین رات کے وقت بھول پہنچے والی تھی۔ لیکن چونکہ اب سفر بغیر کسی رکھٹ کے شروع ہو گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ میں بھول پہنچ جوں گ۔ راستے میں کئی ندی نالے، دریا اور جنگل آئے اور گزرتے چلے گئے۔ شام ہو چکی تھی جب ٹرین ہو شنگ آبلو کے سٹیشن پر رکی۔ میں اور میرا ساتھی ہم دونوں پلیٹ فارم پر اتر آئے اور ایک ٹی ٹبل پر جا کر چائے پینے لگے۔ دو پولیس والے پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ ٹبل رہے تھے۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا تاکہ وہ مجھے شناخت نہ کر سکیں۔ دوسری طرف پلیٹ فارم پر کچھ مسافر بیچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک بیچ کے قریب ہی زمین پر بیٹھا ہوا مجھے وہی جنگل والا سیاہ قام سپرانا نظر آیا۔ اس نے ساتھیوں کی پٹاری والا جھولا اپنے آگے رکھا ہوا تھا اور بیزی پی رہا تھا۔

میرا ہاتھ ٹھک کہیں یہ شخص میرا بیچا تو نہیں کر رہا۔ آخر اس کو میری پر اسرار شخصیت کی نشان دہی اس کے سٹپ لے کر دی تھی۔ میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے کئی بار سپرے میرا تعاقب کر چکے تھے۔ صرف اتنا خیال ضرور تھا کہ کہیں اس سپرے کے پاس کوئی خطرناک منتر نہ ہو اور وہ یہ منتر مجھ پر پھونکنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دوں گا۔ بس مجھے اس سپرے سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں ان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں پولیس کے سپاہی میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔

”تم کھل سے آئے ہو، کھل جا رہے ہو؟“

میرا ساتھی میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ چونکہ ہاتھی نوجوان تھا کہنے لگا۔

”تحقیدار صاحب ہم ناگ پور سے آ رہے ہیں۔ بھول جائیں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

پولیس کے سپاہی نے اس کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔

”تم سے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ تم خاموش رہو۔“

سپاہی دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔

”کیوں بھی کھل سے آ رہے ہو؟“

میں نے اپنے حواس کو قطعی منتشر نہ ہونے دیا۔ بڑے اطمینان سے کہا۔

”ناگ پور اپنے بڑے بھائی سے ملنے گیا تھا۔ اب بھول والیں جا رہا ہوں۔“

”بھول میں کیا کرتے ہو؟“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”گورنمنٹ کلج کی لائبریری میں کام کرتا ہوں۔“

”بھول میں کھل رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”وہیں کلج کے کوارٹروں میں رہتا ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ ان سپاہیوں میں سے ایک حوالدار تھا۔ مجھ سے پوچھ گچھ وہی کر رہا تھا۔ اس نے دوسرے سپاہی سے کہا۔

”اس کی تلاشی لو۔“

تب میرا باتونی ساتھی بیچ میں بول پڑا۔

”جناب آپ کے پاس تلاشی کے وارنٹ ہیں؟ ہم بھارت کے ٹارک ہیں۔ آپ بغیر وارنٹ کے کسی کی تلاشی نہیں لے سکتے۔“

اس پر حوالدار نے میرے ساتھی کو گریبن سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

”تم چپ رہو گے یا نہیں؟“

میرا باتونی دوست وہیں دبک گیا۔ سپاہی میرے تلاشی لینے لگا۔ میرے پاس کچھ نقدی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میری جیکٹ کی جیب میں عار والے سناپ کا دیا ہوا سیاہ مہو بھی ہے۔ سپاہی نے مرے کو نکال کر غور سے دیکھا۔ پھر حوالدار کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ کالا پتھر اس کی جیب سے نکلا ہے۔“

حوالدار نے مرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”پتھر ہے۔ ریلوے لائن پر سے اٹھایا تھا۔ مجھے اچھا لگا۔ آپ کو اچھا لگتا ہے تو لے لیں۔“

حوالدار نے مرے کو دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”یہ گرم کیوں ہے؟“

میں نے کہا۔

”یہ پتھر ہے ہی ایل۔“

اس نے مہو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں پولیس والے آگے بڑھ گئے۔ میرا باتونی ساتھی بڑا غصے میں تھا۔ اس نے دہلی زبان میں پولیس کے سپاہیوں کو گللی دی اور کہنے لگا۔

”یہ سارے محض پیسے بٹورنے کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ تمہاری جیب میں صرف

چار پانچ روپے تھے اس لیے تمہیں چھوڑ دیا۔“

لیکن میں چوکس ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کو مجھ پر شک پڑ سکتا ہے۔ ورنہ یہ سپاہی کبھی میرے پاس نہ آتے۔ اگر انہیں محض پیسے ہی بٹورنے تھے تو میرے ساتھی سے پوچھ گچھ کرتے۔ کیونکہ اس کی وضع قطع مجھ سے زیادہ بہتر تھی۔ لیکن پولیس نے مجھے مشتبہ سمجھ کر مجھ سے ہی پوچھ گچھ کی تھی۔ ٹرین ہو شنگ آباد سے چل پڑی۔ رات ہو گئی تھی۔ ٹرین تاریک جنگلوں میں سفر طے کرتی رہی۔ رات کے ساڑھے دس بجے بھوپال شہر کی روشنیں دکھائی دینا شروع ہو گئیں۔ ٹرین میں ہوا کے تیز جھونکے آرہے تھے جس کی وجہ سے کوشش کے باوجود مجھے جیلہ اور کمانڈو خالد کی بو محسوس نہ ہوئی۔ ویسے بھی جب انسانی شکل میں ہوتا تھا تو ان لوگوں کی خوشبو مدھم پڑ جاتی تھی اور سناپ کے روپ میں مجھے کافی فاصلے سے ان کی خوشبو آ جاتی تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو میں نے اپنے باتونی ساتھی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”اچھا بھائی صاحب! خدا حافظ۔“



گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ جگہ شر سے باہر تھی۔ میری دائیں جانب کھلی فاصلے پر بھوپل شر کی لوہی نیچی روشنیوں جھلماقی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے فضا میں جیلہ اور کمانڈو خلد کی خوشبوئیں سونگھنے کی کوشش کی مگر مجھے ان کی ہلکی سی خوشبو بھی محسوس نہ ہوئی۔ جب میں سٹپ سے اسٹپنی روپ میں آ جاتا تھا تو میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا کہ کبھی دور سے اپنے کسی خاص ساتھی کی ہلکی سی خوشبو آتی تھی اور کبھی بالکل نہیں آتی تھی۔ جبکہ سٹپ کے روپ میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا اور کمانڈو خلد اور دوسرے مجاہدوں کی خفیہ کمین گھ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ آ کر میں رک گیا اور ایک درخت کی لوٹ میں چھپ کر پیچھے دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں درخت کی آڑ سے نکل کر کمین گھ کی طرف چلنے لگا۔ مجھے رات کے اندھیرے میں کمین گھ کے نیلے کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ میں ایک جگہ سے نیلے کی دیوار کے قریب نشیب میں اتر گیا۔ فوراً ہی مجھے دو مجاہدوں نے ایک جانب سے نکل کر روچ لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے آدمی ہیں اور اب وہ یہ تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کا ہی آدمی ہوں یا کوئی اور ہوں۔ بہت جلد انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ان سے خلد کے بارے میں پوچھا تو ایک مجاہد نے کہا۔

”کمانڈر اندر ہی ہے۔“

اور وہ دونوں اندھیرے میں روپوش ہو گئے۔

کمانڈر خلد کمین گھ میں ہی تھا مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گلے لگ کر ملا اور بولا۔

”کرم دادا! خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ سلامت ہمارے پاس آ گئے۔ میں تو ہانکل نا

امید ہو چکا تھا۔“

میں نے درمی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“



اس نے کہا۔

”ارے بھائی صاحب میں بھی بیس اتر رہا ہوں۔ چلئے باہر تک تو چلئے۔ شیشن سے باہر خدا حفظہ کیں گے۔“

پلیٹ فارم پر اتار دیا تھا کہ میرا ہتھیار ساتھی مسافروں میں کسیں گم ہو گیا۔ میں نے بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ شیشن سے باہر آ کر میں نے ہوا کر سونگھل۔ مجھے فضا میں رہتی ہوئی جیلہ اور کمانڈو خلد کی ہلکی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں بڑا خوش ہوا کہ رات کو نہیں تو صبح اپنی پیاری بیوی جیلہ سے اسٹپنی شکل میں ملاقات کر سکوں گا۔ اس وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں نکلنے کی طرف نہیں جاؤں گا اور کمانڈو خلد سے کہوں گا کہ وہ مجھے اور جیلہ کو پاکستان پہنچا دے۔ ارادہ یہی تھا کہ جیلہ کو پاکستان چھوڑ کر خود بارڈر کراس کر کے کمانڈو خلد کے پاس واپس آ جاؤں گا اور جیلہ کشمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں گا اور کشمیری مجاہدین کے شانہ بشانہ بھارتی جارحیت کے خلاف لڑوں گا۔

شیشن کے باہر آ کر میں نے رکشالے لیا اور اسے ایک خاص جگہ چلنے کو کہا۔ میں رکشے کو کمانڈو خلد کی کمین گھ کے آس پاس بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں کمین گھ والے نیلے سے کھلی پیچھے ایک سڑک پر اتر گیا۔ رات کا وقت تھا سڑک پر اندھیرا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ دور کسی سڑک پر سے کسی وقت کسی ٹرک وغیرہ کے

”وہ بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔
”یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ تم اپنی اصلی شکل میں میرے سامنے بیٹھے ہو۔
یہ بتاؤ اتنے دن کمال رہے؟ تم پر کیا گزری؟“

میں نے مکناؤ خلد کو اپنی ساری داستان سنا ڈالی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ مجھ سے
پھجنے کے بعد اس پر کیا گزری۔ میں نے جیل کا پوچھا تو کہنے لگا۔

”بھائی تو اس بار تمہارے لیے سخت پریشان رہی ہے۔ میری بہن نے مجھے بتایا ہے
کہ وہ تمہاری جدائی میں آنسو بھی بہاتی رہی ہے۔“
میں نے مکناؤ خلد سے کہا۔

”مکناؤ! اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جیل کو پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ اس
کا یہاں رہنا ہمارے لیے کسی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ جبکہ اس پر بھی کوئی
مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔“
خلد بولا۔

”اگر تم فیصلہ کر چکے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ بھائی کے واپس جانے
سے تم زیادہ آزادی اور یکسوئی سے کام کر سکو گے۔“
میں نے کہا۔

”پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں بھی جیل کے ساتھ ہی پاکستان جاؤں اور اسے خود
اس کے والدین کے حوالے کر کے آؤں۔ لیکن اگر تمہارا کوئی عہدہ اس کی ذمہ داری
لے لے کہ وہ جیل کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ آئے گا تو مجھے ساتھ جانے کی
ضرورت نہیں رہے گی۔“

خلد کہنے لگا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہمارا جو عہدہ بھائی کو لے کر پاکستان جائے گا وہ اسے اس
کے گھر چھوڑ کر ہی آئے گا بلکہ جیل بھائی سے پرچہ نکھوا کر ساتھ لائے گا کہ میں
خبریت سے گھر پہنچ سکیں۔“

میں بالکل مطمئن ہو گیا۔ میں نے کہا۔
”مج جیل سے مل کر اسے یہ خوشخبری سنائیں گا۔“
خلد نے کہا۔

”کیا بھائی تمہارے بغیر پاکستان جانے پر راضی ہو جائے گی؟“
میں نے احمق سے کہا۔

”وہ ضرور راضی ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں یہاں انڈین فلمیں دیکھنے
کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔ میں جیل کشمیر کا ایک اہم سپاہی ہوں اور ہندوستان کے
مسلمانوں کے لیے ان حقوق کی خاطر جدوجہد کر رہا ہوں جن سے بھارتی حکومت نے
انہیں محروم کر رکھا ہے۔ وہ کبھی اعتراض نہیں کرے گی۔“

دوسرے روز جیل مجھ سے ملنے کہیں گے میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی صحت
خراب تھی اور وہ پہلے سے کمزور ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے
حوصلہ دیا اور کہا۔

”جیل! تمہاری مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ اب تم بہت جلد پاکستان اپنے
باپ کے پاس واپس چلی جاؤ گی۔“

اس نے میرے سینے پر سے سرفٹھا کر کہا۔

”میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی۔ تمہیں بھی میرے ساتھ پاکستان جانا ہو گا۔“
میں نے کہا۔

”جیل! یہاں میرے کچھ فرائض ہیں، یہاں کے مسلمانوں کے، خاص طور پر
کشمیری مسلمانوں کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں جو مجھے یہاں رہ کر ادا کرنے ہیں۔ میں
تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ اپنا مشن مکمل
کرنے کے بعد فوراً تمہارے پاس پاکستان واپس آ جاؤں گا۔“

مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور یہی کہتی رہی کہ وہ میرے بغیر پاکستان نہیں جائے

ہمیں بھلی کو لے کر یہاں سے کب جانا ہو گا۔“

دیر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسی دن شام کے وقت جیلہ روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے رخصت ہو گئی۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنا خیال رکھوں گا اور جتنی جلدی ہو سکے گا میں پاکستان اس کے پاس واپس آ جاؤں گا۔

جیلہ کو مجاہدوں کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کی طرف روانہ کرنے کے بعد کمانڈر خالد اور میں بیٹھ گئے اور چائے گرم کروا کر پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ کمانڈر خالد کہنے لگے۔

”کشمیر کے علاقے پر بھارتی ہائی کمان نے تازہ دم یونٹیں بھیجی شروع کر دی ہیں کیونکہ وہاں گورکھے، مرہٹے، ڈوگرے اور مدراہی فوجی اپنے اپنے حریت پسند مجاہدوں کے ہاتھوں بری طرح مر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے مجاہدوں کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ جبکہ اب جو انڈین آرمی کی یونٹیں کشمیر بھیجی جا رہی ہیں ہماری اطلاع کے مطابق انہیں جدید ترین اسلحہ دیا جا رہا ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ یونٹیں اور ان کا اسلحہ کس روٹ سے بھیجا جا رہا ہے؟“

کمانڈر خالد نے کہا۔

”ہمیں سے کشمیر کی وادی میں پہنچنے کا ایک ہی روٹ ہے۔ اسی روٹ سے یہ

سب کچھ جا رہا ہے۔“

میں نے اپنی پیالی میں گرم چائے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بھارت کے کس سپلائی سنٹر سے یہ جدید ترین

اسلحہ مقبوضہ کشمیر کو سپلائی ہوتا ہے۔“

خالد کہنے لگے۔

”یہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن یہ سپلائی انتہائی سخت سیکورٹی میں کی جا

گی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور بڑے آرام سے سمجھانا شروع کیا کہ میرا ہندوستان میں رہنا اور کشمیریوں کی جنگ آزادی میں حصہ لینا کس قدر ضروری ہے۔ وہ میری باتیں غم آلود آنکھوں سے سنتی رہی۔ آخر میں نے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے مجاہدوں کے ساتھ اگلی ہی پاکستان جائے گی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے کہا۔

”جان من! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

وہ کہنے لگی۔ ”مجھے تمہارے بارے میں بڑا فکر لگا رہا ہے گا جو مصیبت تمہارے

ساتھ لگ گئی ہے کہ تم کسی بھی وقت انسان سے ملتے ہو اس نے تو میری جان نکل کر رکھ دی۔ پاکستان میں مجھے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہا ہے گا کہ خدا جانے تم کس حالت میں ہو اور تم پر کیا گزری ہے۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ نہیں ہو گا جیلہ۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے

لیے بہت دیر تک زندہ سلامت رکھے گا۔“

جیلہ رات تک کمین گاہ میں میرے پاس رہی۔ ہم نے اکٹھے مل کر کھانا کھلیا۔

اس کے بعد وہ چلی گئی۔ کمانڈر خالد نے دوسرے ہی روز اپنے خاص آدمیوں کو بلوا کر

ان سے کشمیر میں جنگ بندی لائن کی صورت حال کے بارے میں تازہ ترین معلومات

حاصل کیں۔ اپنے خاص دو مجاہدوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ جیلہ بھلی کو پاکستان پہنچا

دیں گے۔ انہیں خاص خفیہ راستوں کا علم تھا۔

کمانڈر خالد نے ان میں سے ایک مجاہد سے کہا۔

”شہباز خان! میں یہ تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ تم جیلہ بھلی کو اس کے والدین

کے پاس خود چھوڑ کر آؤ گے۔ کیا تم یہ ذمے داری قبول کرتے ہو؟“

مجاہد شہباز خان نے کہا۔

”کمانڈر! میں یہ ڈیوٹی بڑی ذمے داری اور خوشی کے ساتھ ادا کروں گا۔ حکم کریں

رہی ہوگی۔ اس لیے یہ احتمالی حساس اور اہم سپلائی لائنیں ہیں۔
میں نے کہا۔

”کمانڈر! ہم تو اللہ اور اس کے نئی پاک کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔ اگر سپلائی لائن پر انڈین آرمی نے ایٹم بم بھی لگا رکھے ہوں گے تو ہمیں اس سے کیا؟“

خالد بولا۔ ”وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ لیکن صرف اپنی جان پر کھیل جانے سے مقصد حل نہیں ہو جاتا۔ اپنے مشن میں کامیاب ہونا بھی بہت ضروری ہے۔“

میں نے چائے کی پیالی کا آخری گھونٹ طاق میں اتارنے کے بعد کہا۔
”خالد بھائی! تم یہ تو معلوم کرو کہ مقبوضہ کشمیر کے علاقہ پر بھارتی یونٹوں کو جدید ترین اسلحہ کی سپلائی کس روٹ سے ہوتی ہے۔ ان کا سپلائی سنٹر بھارت میں کس جگہ پر ہے اور وہاں سیکورٹی کی کیا صورت حال ہے۔“
خالد کہنے لگا۔

”یہ کل ہی معلوم ہو جائے گا۔ اب تم بھی آرام کرو۔ رات کٹنی ہو گئی ہے۔“
کمانڈو خالد دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں وہیں دوی پر سو گیا۔ اگلے روز صبح خالد نے اپنے دو خاص آدمیوں کو مقبوضہ کشمیر میں تعینات بھارتی یونٹوں کی سپلائی لائنیں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس دوران میں خفیہ کمین گاہ کے اندر ہی رہا۔ میں نے خالد سے ناگن درگا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔
”بھائی! وہ تو سانپ کی شکل میں ہوگی اور جب سے تم گئے ہو یہاں ہم نے کسی سانپ کو نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری یہ ناگن درگا بھوپال شہر میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو تمہاری بو پا کر اب تک یہاں پہنچ چکی ہوتی۔“

یہ کمانڈو خالد نے بالکل صبح کہا تھا۔ کیونکہ میں انسانی روپ میں ناگن درگا کی بو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ سانپ کی شکل میں تھی۔ اسے میری بو دور سے آ

سکتی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح خفیہ کمین گاہ میں پہنچ سکتی تھی۔ اگر وہ اب تک میرے پاس نہیں پہنچی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی بھوپال میں نہیں ہے۔ اب بھیروں جی کے مندر میں بھی اسے دیکھنا فضول تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ آخر وہ سانپ کی شکل میں ہے۔ کہیں کسی نے اسے دیکھ لیا تو لوگ تو اس کو ہلاک کرنے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔

ناگن درگا کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشے پیدا ہو رہے تھے۔ مگر میں اس کی تلاش میں نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک اہم ترین مشن میرے سامنے آنے والا تھا اور یہ مشن مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹوں کی اسلحہ کی سپلائی کو تباہ کرنے کا مشن تھا۔ جو اپنے کم ترین اور محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے بڑا نازک مشن تھا۔ اپنے جس مجاہد کو اسلحہ کی سپلائی لائن معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا اس نے دو دن لگا دیے۔ تیسرے دن وہ خفیہ کمین گاہ میں آیا تو فقیر کے بھیس میں تھا۔ کہنے لگا۔
”مقبوضہ کشمیر کی انڈین یونٹوں کو جھانسی کے سپلائی سنٹر سے اسلحہ سپلائی ہوتا ہے۔ یہ اسلحہ بھارتی فوجی ٹرکوں میں لوڈ کر کے دایا گوالیار، آگرہ، دلی، انبالہ، پٹنن کوٹ جہوں کشمیر پہنچایا جاتا ہے۔“

”سیکورٹی کا کیا انتظام ہوتا ہے؟“ کمانڈو خالد نے پوچھا۔

مجاہد شباز نے کہا۔

”ان ٹرکوں کے آگے پیچھے آرمڈ گاڑیاں ہوتی ہیں جن پر مشین گنیں لگی ہوتی ہیں۔ درمیان میں بھی اس قسم کی بکتر بند گاڑیوں کو حفاظت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ پٹنن کوٹ سے آگے لوپر پہلی کلچر بھی ان ٹرکوں کی دیکھ بھال کے لیے آ جاتے ہیں۔“
کمانڈو خالد خاموش ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ میں نے مجاہد سے پوچھا۔
”اندازاً یہ کتنے فوجی ٹرک ہوتے ہیں؟“

مجاہد نے کہا۔

”میری اطلاع کے مطابق ہفتے میں تین بار جھانسی کے اسلحہ سپلائی سینٹر سے بارہ

روانہ ہو جاؤں گا۔“

اگلے دن صبح صبح مجاہد شہباز فقیر کے بھیس میں ہی بھوپال سے جھانسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمانڈو خالد کسی کام سے اپنی کزن سسٹر کے ہاں چلا گیا۔ میں ناشتہ کر کے کمین گاہ میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر سو کر آرام کیا۔ پھر پور ہونے لگا تو سوچا باہر نکل کر تھوڑی سیر کرنی چاہیے۔ میں نے گاڑ ڈیوٹی پر متعین مجاہد سے کہا کہ میں ذرا باہر ٹہلنے جا رہا ہوں، تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا، اور میں کمین گاہ کے خفیہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو ہلکی بارش بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے باہر بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ خفیہ کمین گاہ کی پہاڑی شہر سے باہر ویران جگہ پر تھی۔ پیچھے ایک اجاڑ سامیان تھا جہاں ایک طرف کوئی خانقاہ تھی جہاں سے کسی کسی وقت قوالی کی آواز آیا کرتی تھی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے خانقاہ کے قریب چلا آیا۔ پتھرلی چار دیواری کے اندر ایک پرانا گنبد ابھرا ہوا تھا۔ گنبد پر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ خانقاہ کے دروازے کے باہر دو فقیر بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر شاید کسی بزرگ کا مزار تھا۔ ان دو فقیروں کے سوا وہاں اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے خانقاہ میں جانا مناسب نہ سمجھا اور پیچھے سے ہو کر ٹہلتا آگے جا کر ایک درخت کے نیچے پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ موسم بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ میں جیلہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یقین تھا اور تسلی بھی تھی کہ کمانڈو خالد کے مجاہد اسے اپنی حفاظت میں جنگ بندی لائن عبور کروا کر پاکستان پہنچا دیں گے۔ جیلہ کی طرف سے میرا ذہن بڑا مطمئن ہو گیا تھا۔ اب میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اپنی توجہ پوری طرح کشمیر کی طرف لگا دوں گا اور محاذ پر جا کر خود بھی مقبوضہ کشمیر میں انڈین آرمی کے خلاف لڑوں گا۔

اتنے میں مجھے کسی سپیرے کی ٹین کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میدان کی طرف سے ایک سپیرا مین بجاتا خانقاہ کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میں خانقاہ سے کافی ہٹ کر درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ سپیرا مزے مزے سے چلتا خانقاہ کے باہر آ کر بیٹھ گیا۔

ٹرک مقبوضہ کشمیر کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔“

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”کرم دلو! ان فوجی ٹرکوں کو ہم کہاں تک تباہ کرتے رہیں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اصل مدعا ختم کیا جائے۔ یعنی جھانسی کا اسلحہ ڈپو ہی اڑا دیا جائے۔“

میں نے کہا۔

”کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو۔ میری بھی یہی رائے ہے لیکن اس کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت ہوگی۔“

کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وسائل کیلئے ہوتے ہیں کرم دلو! تم خود کہا کرتے ہو کہ مسلمان کم سے کم وسائل کے ساتھ بھی پوری دلیری سے لڑتا ہے اور فتح حاصل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہماری جائیں چلی جائیں گی، ہم مرجائیں گے۔ ہم تین چار مجاہدوں کے مرنے سے کشمیری حریت پرستوں کو کس قدر فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ سوچو، ہماری جانوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کو تقریر پہنچائی جائے اور اس کے دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ تباہ و برباد کیا جائے۔“

پھر کمانڈو خالد نے مجاہد شہباز سے پوچھا۔

”جھانسی کا اسلحہ سپلائی سینٹر شہر کے کون سے حصے میں واقع ہے؟ کیا تم یہ معلوم کر سکتے ہو؟“

مجاہد نے کہا۔

”کیوں نہیں سر۔ مجھے کل کا دن دے دیجئے میں اس اسلحہ سپلائی سینٹر کے بارے

میں آپ کو پوری معلومات فراہم کر دوں گا۔“

”تم بے شک دو دن لے لو مگر پوری تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔“

مجاہد شہباز نے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا کمانڈر! انشاء اللہ! میں منہ اندھیرے کی گاڑی پکڑ کر جھانسی کی طرف

دور سے مجھے ایسے لگا جیسے یہ وہی سپیرا ہے جو مجھے چند واڑہ اور ہو شنگ آباد کے جنگل میں ملا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی سیاہ فام سپیرا تھا مگر اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی حالانکہ اس نے خانقاہ کی طرف آتے ہوئے مجھے دور سے دیکھا تھا۔

میں نے بھی یہ سوچ کر اسے کوئی اہمیت نہ دی کہ ہو سکتا ہے اسے بھی اسی گاڑی میں بھوپال آنا ہو اور وہ بھوپال آ گیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے تعاقب میں وہیں آیا ہو۔ غار والے سانپ کا دیا ہوا سیاہ مہو میری جیب میں ہی تھا۔ میں نے کمانڈو خالد سے اس مہرے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ محض اس خیال سے کہ کہیں وہ میرا مذاق نہ اڑائے۔ کمانڈو خالد بنیادی طور پر حقیقت پسند انسان تھا اور اس قسم کی باتوں کو دل سے کبھی نہیں مانتا تھا اور ان کا تبصرہ اڑایا کرتا تھا۔ یہ مہو بظاہر میرے بھی کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس خیال سے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ شاید اس کی کبھی کسی جگہ ضرورت پڑ جائے۔

سیاہ فام سپیرا اپنی دھن میں بین بجا رہا تھا۔ اس نے پٹاری اپنے سامنے رکھ لی تھی اور ابھی تک پٹاری میں سے سانپ نہیں نکلا تھا۔ اس بات پر مجھے ضرور حیرانی ہو رہی تھی کہ وہیں سانپوں کا تلاش دیکھنے والا کوئی نہیں ہے پھر یہ سپیرا کس لیے بیٹھ کر بین بجا رہا ہے۔ وہاں دو فقیر ضرور بیٹھے تھے مگر ان سے سپیرے کو کیا مل سکتا تھا۔ سپیرا مجھ سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بین بجاتے بجاتے اس نے پٹاری کا منہ کھول دیا۔ اندر سے ایک سانپ پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر سانپ پٹاری سے باہر آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سانپ نے پھن میری طرف گھما کر مجھے دور سے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ ریٹکتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

سانپ کو میری طرف آتے دیکھ کر سپیرے نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور پٹاری میں بند کر دیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پٹاری جھولے میں ڈال کر اٹھا۔ جھولے کو کندھے سے لٹکایا اور بین بجاتا ہوا مجھ سے کوئی سات قدم کے فاصلے پر سے گزر گیا۔ قریب

سے گزرتے ہوئے اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں بھی اسے دیکھتا رہا۔ سپیرا میدان کی پرلی جانب والے درختوں کی طرف نکل گیا۔ یہ سپیرا میرے لیے بڑا پر اسرار بننا جا رہا تھا۔ کبھی مجھے احساس ہوتا کہ اسے کس طرح پہنچا چلا گیا ہے کہ میرے پاس مٹاگ کا مہو ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور میری نگرانی کر رہا ہے۔ سپیرا میری نگاہوں سے اوچل ہو چکا تھا مگر میں کچھ دیر وہیں درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اگر وہ کسی جگہ چھپ کر مجھے دیکھ رہا ہے تو میرا پیچھا کرتے خفیہ کمین گاہ تک پہنچ جائے۔

جب مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے کلنی دیر ہو گئی تو میں اٹھ کر خانقاہ کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ میں سپیرے کو یہ تاثر ضرور دینا چاہتا تھا کہ میں خانقاہ پر فاتحہ خوانی کے لیے آیا ہوں۔ خانقاہ میں بیٹھے بیٹھے جب مجھے آدھا پون گھنٹہ گزر گیا تو میں اٹھا اور واپس کمین گاہ کی طرف جانے کی بجائے شر کو جانے والی سڑک پر آ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ابھی کمین گاہ کی طرف نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے شک تھا کہ سپیرا کمین نہ کہیں چھپ کر میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔ سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی گاڑی، یکہ اور رکشا گزر جاتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ بھیروں جی کے مندر چلا جاؤں۔ شاید وہاں سے ناگن درگا کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ مندر میں نے دیکھا ہوا تھا۔ جس سڑک پر میں جا رہا تھا وہاں سے ایک کپا راستہ لال پہاڑی کی طرف نکلتا تھا۔ بھیروں جی کا مندر اسی لال پہاڑی کے پیچھے واقع تھا۔

میں نے کچھ راستے پر آتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا، مجھے سپیرا کمین دکھائی نہ دیا۔ لیکن مجھے شک تھا کہ اگر وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے تو چھپ کر ضرور میرا تعاقب کر رہا ہو گا۔ سی آئی ڈی والوں کو بھی سانپ کی طرح اپنے اندر چھپا لیتی ہے اور وہ ہلکے جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بھیروں جی کا مندر لال پہاڑی کے پیچھے ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ پتھر کی دیوار کے اندر ایک چوکور چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ صحن میں کچھ سادھو بیٹھے سلفے کے دم لگا رہے تھے۔ مندر کے دروازے پر ایک بھاری دہلیز کے اندر مورتی

کے پاس بیٹھا بھجن کیرتن کر رہا تھا۔ میں نے گھرے گھرے سانس لے کر فضا میں ناگن درگا کی بوسختی کی کوشش کی مگر مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ یا تو ناگن درگا وہاں موجود نہیں تھی اور یا پھر اگر موجود تھی تو مجھے اس کی بوسختی محسوس ہو رہی تھی۔

مندر کے پیچھے کئی چھوٹی چھوٹی موربتیاں پرانی دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان دیواروں میں خشک گھاس اگی ہوتی تھی۔ اچانک مجھے کسی سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک خیالے رنگ کا چھوٹا سا سانپ پھن اوپر اٹھائے مجھے گھور رہا ہے۔ یہ ناگن درگا نہیں تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے سانپ کے روپ میں تھی۔ میں نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ اپنی طرف سے میں مطمئن تھا کہ سانپ نے اگر مجھے ڈس بھی دیا تو مجھ پر اس کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں نے مسکرا کر سانپ سے کہا۔

”یار! تو کیا میری طرف گھور کر دیکھ رہا ہے اگر تجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں کبھی کبھی انسان سے سانپ بن جاتا ہوں تو بھائی اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اصل میں انسان ہی ہوں۔ ہاں اگر تو مجھے ناگن درگا کے پاس لے چلے تو میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔“

اچانک سانپ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

وہ سیدھا میری گردن پر آیا اور اس نے مجھے ڈس دیا۔ میں نے اسے پکڑ کر پرے پھینک دیا اور گھلی دے کر کہا۔

”آخر تو بھی میرا دشمن ہی نکلا۔ دفع ہو جاہیل سے، نہیں تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔“

سانپ مجھ سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف ہنسنے لگا۔ میں نے وہاں سے واپس چلنے کے لیے پاؤں اٹھایا تو مجھے اپنا پاؤں بھاری محسوس ہوا۔ میں نے دوسرا پاؤں اٹھانے کی کوشش کی تو وہ پہلے پاؤں سے زیادہ بھاری تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا سارا جسم پتھر کی طرح بھاری لگنے لگا۔ پھر میرا حلق

خٹک ہو گیا۔ کیا میں سانپ ہو گیا تھا؟ مجھے خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں نے کسی کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن میری آواز بند ہو گئی تھی۔ جسم بالکل سن ہو چکا تھا۔ یا خدا ایسا کیوں ہوا؟ ضرور یہ کوئی خطرناک سانپ تھا جس کے زہر نے مجھ پر مسلک اثر کیا تھا۔

مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ نہ ہاتھ ہلا سکتا تھا نہ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ قدموں کی چاپ میرے قریب آ کر رک گئی۔ ایک آدمی مجھ پر جھکا۔ یہ وہی سیاہ فام سپیرا تھا۔ اس نے سانپ کو اٹھا کر اپنی پٹاری میں بند کر کے پٹاری کو جھولے میں ڈالا اور میرے کپڑوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس چیز کی تلاش میں تھا۔

آخر اسے میری جیکٹ کی جیب میں سے مائٹنگ کا مہولہ مل گیا۔ مہولے کو غور سے دیکھنے کے بعد سپیرے نے اسے چوم لیا۔ میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ مہولہ اپنی صدر کی جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ میں بے بسی کی حالت میں وہیں زمین پر پڑا تھا۔ مندر کی جانب سے اب کسی پجاری کے بھجن گنگنائے کی آواز آنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ تقدیر کیا کھیل کھیلنے والی تھی۔ نہ میں اٹھ سکتا تھا نہ جسم ہلا سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ صرف سن سکتا تھا۔ ایک دم سے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے۔ مجھے دوسرا اور پھر تیسرا جھٹکا لگا اور میرا بدن ہلکا ہوتا شروع ہو گیا۔ میرے جسم کا احساس غائب ہو گیا تھا۔ میں جیسے اپنے جسم سے الگ ہو کر اپنے جسم کو زمین پر پڑے دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا انسانی جسم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک سانپ لینا ہوا تھا۔ میرا شعور واپس آ چکا تھا۔ میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

میں نے سانپ کے روپ میں آتے ہی انسانی آواز میں بولنے کی کوشش کی تو میری قوت گویائی واپس آ چکی تھی۔ میں انسانی آواز میں بول سکتا تھا۔ میں نے اتنی بات بھی بہت غنیمت جانی کہ میں سانپ بن گیا ہوں تو کیا ہوا۔ یہ تو میرے ساتھ نہ جانے

کب تک ہوتا ہی رہے گا لیکن کم از کم میں انسانی آواز میں بول تو سکتا ہوں۔ آخر میں انسان سے سانپ میں تبدیل ہو کر ہی رہا۔ خدا جانے یہ دورہ پڑنا کب میری جان چھوڑے گا۔ میرا ذہن ناامیدی اور مایوسی کے احساس سے بو جھل ہو رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں سانپ ہوں اور کھلی جگہ پر پڑا ہوں۔ کسی انسان کی نگاہ پڑ گئی تو وہ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دن کا وقت تھا۔ میں دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ جان بچانے کی خاطر میں مندر کی دیوار کے پاس پتھروں کے نیچے چھپ گیا۔ سانپ کے روپ میں آجانے کی وجہ سے مجھے کمانڈو خالد کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ کمانڈو خالد مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے کمین گاہ میں چھوڑ کر کسی کام سے اپنی کزن کے گھر گیا تھا۔ خفیہ کمین گاہ بھی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ جیلہ کی خوشبو مجھے نہیں آ رہی تھی۔ وہ جموں کشمیر کی طرف سے مجھ سے کافی دور جا چکی تھی۔ میں نے زبان باہر نکال کر چاروں طرف فضا کو سونگھا کہ شاید کسی طرف سے ناگن درگا کی بو بھی آجائے مگر اس کی بو فضا میں موجود نہیں تھی۔

ناگن درگا اس علاقے میں شاید نہیں تھی۔

میں وہاں سے خفیہ کمین گاہ میں جانا چاہتا تھا۔ مگر دن کی روشنی میں اتنا سا فاصلہ طے کرنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے بھیروں جی کے مندر سے نکل کر ایک آبادی والے علاقے سے گزرنا تھا۔ ویسے بھی دن کے وقت سانپ کھلی جگہ پر نکلے تو اس کا زندہ بچنا مشکل ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کی اس پر نظر ضرور پڑ جاتی ہے اور پھر لوگ اسے ہلاک کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔ میں نے یہی سوچا کہ ذرا شام کا اندھیرا ہو جائے تو خفیہ کمین گاہ کی طرف چل پڑوں گا۔ میں پتھروں کے نیچے سر ڈال کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ یہ تو اب آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ سانپ کو انتظار کی کوفت نہیں ہوتی۔ وہ کئی کئی دن چھپ کر بیٹھا انتظار کر سکتا ہے۔ آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی۔ پھر شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا اترنا شروع ہو گیا۔ میں پتھروں میں سے باہر آ گیا اور

دیور کے ساتھ ساتھ ریٹینگے لگا۔ مجھے بھیروں جی کے مندر کے سامنے سے ہو کر دوسری طرف کچے راستے پر جانا تھا۔ وہاں سے سڑک پار کرنی تھی جہاں سے موٹریں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ سڑک کی بٹیاں روشن ہو گئی تھیں۔

بھیروں جی کے مندر کے دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے ناگن درگا کی خاص بو محسوس ہوئی۔ میں دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر رینگ رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ منہ اٹھا کر زبان باہر نکال کر چاروں طرف لہرائی۔ ناگن درگا کی بو بہت ہلکی تھی اور اس طرف سے آ رہی تھی جس طرف بھوپال کے جنگل شروع ہوتے تھے۔ ناگن درگا کی بو برابر آ رہی تھی۔ میں سب کچھ بھول بھلا کر ناگن درگا کی بو کے تعاقب میں چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مجھے ناگن درگا کی بو آئی ہے تو اسے بھی میری بو ضرور محسوس ہو گئی ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ بھی میری تلاش میں اسی طرف آ رہی ہو۔ شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے جلدی گہرا ہو گیا تھا۔ میں مندر کی چار دیواری کو چھوڑ کر اجاڑ میدان میں سے گزرنے لگا۔ میں ٹھیک اس سمت کو جا رہا تھا جس سمت سے مجھے ناگن درگا کی بو آ رہی تھی۔ میں اس حقیقت سے باخبر تھا کہ میں ناگن درگا کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا اور اسے سانپ کی شکل سے عورت کی شکل میں واپس نہیں لاسکوں گا۔ کیونکہ میں خود سانپ کے روپ میں تھا۔ ناگن درگا کو عورت کی شکل میں واپس لانے کے لیے ضروری تھا کہ میں انسان کی شکل میں آ کر اس کے منہ کو چوم لوں۔ اس کے بعد ہی ناگن درگا عورت کی شکل میں واپس آ سکتی تھی لیکن میں ناگن درگا کے پاس جا کر اس سے ملنا بھی چاہتا تھا اور اسے اپنے ساتھ خفیہ کمین گاہ میں لے آنا چاہتا تھا اور اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا تاکہ جس وقت بھی میں سانپ سے انسان کی شکل میں واپس آؤں تو اس کا منہ چوم کر اسے سانپ کے روپ سے نجات دلا دوں۔ میں میدان میں سے نکل گیا۔

آگے کھیت شروع ہو گئے۔ میں کھیتوں میں سے بھی نکل گیا۔ شام کا اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا اور تقریباً رات ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے

میں بڑی بے فکری کے ساتھ تیزی سے ٹانگن درگا کی بو کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا۔ کھیت بھی ختم ہو گئے۔ پھر ایک سوکھی جھاڑیوں والا میدان سا آگیا۔ وہاں سے بھی گزر گیا۔ آگے ریلوے لائن آگئی۔ میں ریلوے لائن کی طرف بڑھا تو دور سے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ پھر ریل کی پنڑی پر انجن کی روشنی پڑنے لگی۔ میں ریلوے لائن کے قریب آ کر رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین گزرنے لگی۔ ٹرین کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ زمین ریل کے دوڑتے ہوئے پیسوں کی دھمک سے ہل رہی تھی۔ ریل کے گزر جانے کے بعد میں ریلوے لائن پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آگیا۔ ریلوے لائن کے پار بھوپال کے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شہر کے قریب جنگل اتنے گھنے نہیں تھے۔ میں نے کچھ فاصلے پر درختوں کے سیاہ جھنڈ دیکھے۔ اندھیرے میں اب مجھے ہر شے صاف دکھائی دے رہی تھی۔

دور درختوں کے سیاہ جھنڈ جنگل کے شروع کے درخت تھے۔ ٹانگن درگا کی بو ان درختوں کی طرف سے ہی آ رہی تھی اور اب زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹانگن درگا ان درختوں میں کسی جگہ موجود ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بھی میری طرف بڑھی چلی آ رہی ہو اور راستے میں ہی ہماری ملاقات ہو جائے۔ میں رینگتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ قریب آ گئے۔ ٹانگن درگا کی بو زیادہ کھری ہو گئی۔ وہ ضرور ان درختوں میں کسی جگہ چھپی ہوئی تھی۔ میں درختوں کے درمیان آ کر رک گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ درختوں کے عقب میں گھٹا جنگل تھا۔ اچانک ٹانگن درگا کی بو آنا بند ہو گئی۔ میں نے پھن کھول کر اٹھالیا اور اسے چاروں طرف مھمایا۔ بالکل ریڈار کی طرح میں ٹانگن درگا کی بو کے متکثر پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کی بو کسی طرف سے نہیں آ رہی تھی۔ اچانک اس طرح سے بند ہو گئی تھی جیسے کسی نے اسے اٹھا کر لوہے کے صندوق میں بند کر دیا ہو۔ جب سناپ کو لوہے یا شیشے کے صندوق یا بوتل میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس کی بو شیشے اور لوہے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔ پتھروں کی دیوار میں سے بو پھر بھی باہر نکلتی رہتی ہے۔

تو کیا ٹانگن درگا کسی سپرے کی قید میں ہے؟

میں نے بست کو شش کی لیکن ٹانگن درگا کی بو ایسے غائب ہو گئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں پریشن ہو گیا۔ میری پریشنل قدرتی تھی۔ حیران بھی تھا کہ اچانک ٹانگن درگا کی بو کھل چلی گئی۔ لیکن میں واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر ایک بار ٹانگن درگا کی بو قریب سے مجھے آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس جنگل میں کہیں نزدیک ہی موجود ہے۔ اب مجھے اسے تلاش کرنا تھا کہ وہ کسی مشکل میں تو گرفتار نہیں ہے۔ میں نے اس طرف رینگنا شروع کر دیا جس طرف سے اس کی بو آتی ہوئی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ پیچھے رہ گئے۔ ایک چھوٹی سی پکی سڑک دکھائی دی۔ یہ فائر لائن تھی۔ جنگل میں محکمہ جنگلات کی طرف سے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنادی جاتی ہیں تاکہ اگر جنگل میں آگ لگ جائے تو وہ زیادہ نہ پھیلے اور ایک یا دو ہلاکوں تک ہی محدود رہے۔ ان سڑکوں کو محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں سناپ لائن بھی کہا جاتا ہے۔

میں ایک سناپ لائن سے گزر کر جنگل کے دوسرے ہلاک میں آگیا۔ یہاں رک کر ٹانگن درگا کی بو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ بو بالکل نہیں آ رہی تھی۔ جنگل کی فضا میں اور بست سی ہوئیں تھیں۔ مگر جس بو کی مجھے تلاش تھی وہ نہیں تھی۔ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں جنگل میں کھل تک اسے تلاش کرتا چلا جاؤں گا۔ جنگل تو بے حد وسیع تھا۔ واپس جانے کو دل بھی نہیں مانتا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ٹانگن درگا ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہے، اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں کچھ دیر وہیں گرے پڑے سوکھے پتوں کے درمیان کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ مجھے ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی۔ پھر میرے اوپر پانی کی بوند گری۔ آسمان پر گھرے ہوئے ہلالوں نے ہلکی بوند یا بادی شروع کر دی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ واپس چلا جاتا ہوں۔ ان جنگلوں کی بارش بڑی موسلا دھار ہوتی ہے۔ کبھی خیال آتا کہ اب اتنی دور تک آگیا ہوں تو تھوڑا اور آگے جا کر دیکھ لینا چاہیے، شاید ٹانگن درگا کا کوئی سراغ مل جائے۔ ایک

طرف سے ہوا کا جھونکا آیا تو میں چونک پڑا۔ ہوا کے جھونکے میں ناگن درگا کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس کو پوری طرح سے بیدار کرتے ہوئے بو کی سمت معلوم کی اور اس کی طرف تیزی سے ریٹکنا شروع کر دیا۔ ناگن درگا کی بو نہ گھری ہو رہی تھی کہ مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں اور نہ دور ہی ہو رہی تھی۔ ایک خاص سطح پر بو اسی طرح برقرار تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا کہ یہ کیا معنی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔ جنگل کا اصل اور انتہائی گھٹا اور خطرناک علاقہ شروع ہو گیا تھا جہاں سناپ لائن کی بھی کوئی سڑک نہیں تھی۔ مجھے بندروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر کوئی بھاری بھر کم جانور تیزی سے پاؤں زمین پر مارنا قریب سے نکل گیا۔ شاید یہ کوئی لکڑ بگڑ تھا۔ بوندا باندی باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔ میرے اوپر چونکہ گھنے درختوں کی چھت تھی اس لیے مجھ پر کسی کسی وقت بارش کی کوئی بوند گرتی تھی۔ سامنے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ چھوٹی سی ندی تھی۔ میں اس کی سطح پر تیزی سے تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ یہ بڑا گنجان جنگل تھا۔ جگہ جگہ گرے پڑے درختوں کے تنے پڑے تھے۔ اونچی اونچی گھاس تھی۔ جھاڑیاں تھیں اور درختوں پر جنگلی بیلین لگ رہی تھیں۔ ناگن درگا کی بو ایک خاص سطح پر اسی طرح برابر مجھے آ رہی تھی۔ جنگل میں ایک کھلی جگہ آئی تو بو اچانک ایک بار پھر رک گئی۔ میں بھی وہیں رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چاروں جانب سے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی جہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں اور پتھر زمین سے ابھرے ہوئے تھے۔ میں اپنے انسانی ذہن سے غور کرنے لگا کہ یہاں آکر بو کیوں غائب ہوئی ہے۔ یہ معنی میری انسانی سمجھ سے بھی باہر تھا۔ بوندا باندی نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجھے سامنے والے اونچے درختوں کے تنوں میں سے ایک عمارت سی دکھائی دی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ سوچا بارش سے بچنے کے لیے اس عمارت میں چلا جائے۔ ہو سکتا ہے وہاں ناگن درگا کے معنی کا

کوئی حل بھی مل جائے۔ میں جلدی جلدی ریٹکنا سامنے والے درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں سے نکلتا عمارت کے پاس آ گیا۔ یہ کوئی ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ اونچے چبوترے پر ایک کوٹھڑی سی بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ چبوترے پر چڑھنے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں تھیں جو مٹی میں دب چکی تھیں اور ان پر گھاس لگی ہوئی تھی۔ میں ان پر سے رینگ کر چبوترے کے اوپر پہنچ گیا اور دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھڑی ہے جس کا کوئی دروازہ وغیرہ نہیں ہے۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں جلدی سے کوٹھڑی میں گھس گیا۔ کوٹھڑی میں اتنا گھرا اندھیرا تھا کہ مجھے سانپ ہوتے ہوئے بھی زیادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ کونے میں اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے اوپر نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ غور سے دیکھا تو اوپر ایک چھوٹا سا طاق تھا جو کھلا تھا۔ طاقے کا بھی کوئی دروازہ نہیں تھا۔

مجھے تجسس ہوا کہ دیکھنا چاہیے اس طاق میں کیا ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر مٹی اور گرد جمی ہوئی تھی۔ طاقے کے پاس آ کر اندر سر ڈال کر دیکھا تو وہاں بھی ایک کوٹھڑی نظر آئی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ یہ کوٹھڑی بھی خالی تھی۔ اس کی دیوار کے اوپر بھی ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے کوئی سیڑھی نہیں بنائی گئی تھی۔ میں دیوار پر سے ریٹکنا ہوا طاق میں آ گیا۔ یہ طاق شاید کسی زمانے میں چراغ وغیرہ رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے والی کوٹھڑی میں آ کر دہلیز کے پاس کھڑی مار کر بیٹھ گیا اور باہر جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بار بار فضا کو سوگھ لیتا کہ شاید ناگن درگا کی بو کسی طرف سے آ جائے۔ لیکن اس کی بو بالکل نہیں آ رہی تھی۔ باہر بارش اب موسلا دھار ہونے لگی تھی۔ جنگل میں رات کے وقت بارش کا شور گونج رہا تھا۔ ایک طرف سے پانی کی آہٹا گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔ بارش کی پھوار کوٹھڑی کے اندر تک آ رہی تھی۔ میں نے اچھا کیا تھا کہ یہاں کھنڈر میں آ گیا تھا۔ اگر واپس چلا جاتا تو راستے میں یہ بارش مجھے کافی پریشان کر سکتی تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر دیوار کے طاق میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں مرد عورت کو غمزدی میں آ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ مرد نے ایک تھیلہ کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بین بھی تھی۔ دونوں سپیرن اور سپیرا لگتے تھے۔ مرد نے تھیلہ اتار کر اپنے سامنے رکھ دیا۔ تھیلے میں سے ایک موم جی نکال کر جلائی۔ موم جی کو ایک اینٹ پر جمادیا۔ موم جی کی روشنی میں دونوں مجھے صاف نظر آنے لگے۔

دونوں اوجھڑ عمر تھے۔ سپیرے کے سر کے ٹھنکھریالے بل سفید ہو رہے تھے۔ ٹانگن درگا کی بو بڑی تیز ہو گئی تھی۔ عورت سپیرن نے سپیرے سے کہا۔

”نکل کر مجھے دکھاؤ تو سہی مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟“

سپیرے نے بین اپنے پاس ہی رکھ دی اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

”اری مری کیوں جاتی ہے۔ ابھی نکل کر دکھاتا ہوں مگر اسے ہاتھ مت لگائے۔“

سپیرن نے کہا۔

”میں کیوں ہاتھ لگانے لگی بھلا؟ پر تم جو کچھ کہہ رہے ہو مجھے یقین نہیں آتا۔“

سپیرا بولا۔

”جب تو خود اپنے کانوں سے اس کی آواز سنے گی تو پھر تو تمہیں دشاوش آ جائے گا۔“

سپیرن بولی۔

”پہلے میں اس کی آواز تو سنوں۔“

سپیرے نے تھیلے میں سے کپڑے میں لپی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ کپڑا کھولا۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی مٹی کی ہنڈیا نکلی۔ اس نے سپیرن سے کہا۔

”خبردار ہو کر بیٹھ جا۔ میں اسے نکالنے لگا ہوں۔“

سپیرن بولی۔

”مجھے کیوں ڈراتا ہے۔ آخر میں بھی سپیرن ہوں۔ کوئی اتاری عورت نہیں

ہوں۔“

میں خاموش بیٹھا باہر جنگل میں موسلا دھار بارش کو دیکھ رہا تھا۔ کلنی دیر تک بارش زور شور سے ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ بارش کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد بارش بالکل رک گئی۔ اب درختوں سے بارش کے رکے ہوئے پانی کے ٹپکنے کی آواز ہی آ رہی تھی۔ جنگل پر گمراہ سا جم گیا۔ درختوں سے پانی کے ٹپکنے کی آواز پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایسی خاموشی اور سکوت طاری ہو گیا کہ شاید قبر کے اندر بھی ایسی خاموشی اور سکوت نہیں ہو گا۔ میں اب یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ وہیں بیٹھا رہوں اور ٹانگن درگا کی بو کا انتظار کروں یا وہاں سے واپس خفیہ کمین گاہ کی طرف چلا جاؤں۔ میں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھے واپس ہی جانا تھا تو ابھی رات کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے وہاں سے نکل پڑنا چاہیے تھا تاکہ دن کی روشنی ہونے سے پہلے پہنچنے میں خفیہ کمین گاہ تک پہنچ سکوں۔ ٹانگن درگا کی بو فضا میں بالکل نہیں تھی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے واپس ہی چل دینا چاہیے تاکہ صبح ہونے سے پہلے خفیہ کمین گاہ میں پہنچ جاؤں۔ راستہ لمبا تھا اور بارش کی وجہ سے جنگل میں پانی بھی جگہ جگہ بھرا ہوا ہو گا۔ مجھے کئی چکر لٹ کر جانا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں ریٹکتا ہوا کھنڈر کی دہلیز پر آیا ہی تھا کہ اچانک مجھے ٹانگن درگا کی بو محسوس ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔

اس کی بو سامنے کی طرف سے آئی تھی اور اسی کو غمزدی کی طرف قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا سر کو غمزدی کے اندر کر لیا اور غور سے جنگل کی تاریکی میں دیکھنے لگا۔ بو قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ٹانگن درگا اسی کو غمزدی کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ضرور اس نے میری بو بھی محسوس کر لی ہوگی اور وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ٹانگن درگا سانپ کے روپ میں بھی عورت کی آواز میں بات کر لیتی تھی۔ میں نے اسے اپنی انسانی آواز دینی چاہی لیکن فوراً رک گیا۔ اندھیرے میں میں نے دو انسانوں کو کو غمزدی کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ دونوں ذرا قریب آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک عورت ہے اور دوسرا مرد ہے۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے

سپیرے نے ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے ایک سانپ پکڑ کر باہر نکال لیا۔ نامن درگا کی بو ایک دم تیز ہو گئی۔ میں نے سانپ کو غور سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ سانپ نامن درگا تھی۔ خدا جانے وہ اس سپیرے کے قبضے میں کیسے آگئی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ایک دم نیچے چھلانگ لگا کر ان دونوں کو ڈس کر ہلاک کر کے نامن درگا کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ کوئی زبردست سپیرا ہے جس نے نامن درگا کو اپنے قبضے میں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس پر میرے ڈسنے کا کوئی اثر نہ ہو۔ یا پھر اس کے پاس سانپ کا مرہ ہو جس کی مدد سے میرے زہر کے اثر کو زائل کر دے اور انا مجھے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ میں وہیں طاق میں بیٹھا دونوں سپیرے سپیرن کو دیکھنے لگا کہ یہ یہاں نامن درگا کو لے کر کیا کرنے آئے ہیں۔ نامن درگا کو اس نے گردن سے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ اسے ڈس نہیں سکتی تھی۔ سپیرے نے اپنی سپیرن سے کہا۔

”یہ ہے وہ ناگ۔ اس کو منش ناگ کہتے ہیں مگر یہ نامن ہے منش نامن۔ یہ اصل میں عورت ہے مگر دسمہ پلٹ کر نامن کے روپ میں آگئی ہے۔“
سپیرن بڑے غور سے نامن درگا کو دیکھ رہی تھی۔ کسنے لگی۔
”تو کتنا تھا کہ یہ عورت کی طرح بولتی ہے۔ اسے بلا کر رکھا۔“
سپیرے نے نامن کو اپنے سامنے لا کر کہا۔

”منش نامن۔ میں جانتا ہوں تو عورت ہے، نامن بن گئی ہے۔ میری عورت سے بات کر۔ بتا تیرا نام کیا ہے اور تو کہاں کی رہنے والی ہے؟“

میرا خیال تھا کہ شاید نامن درگا منہ سے کچھ بولے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنا جسم سپیرے کی کلائی سے لپیٹ لیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ زور لگا کر اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتی ہے۔ لیکن سپیرے نے اس کی گردن کو سختی سے دبا رکھا تھا۔ سپیرن نے کہا۔

”یہ تو نہیں بولتی۔“

سپیرا بولا۔

”ابھی بولے گی۔“

اس نے ایک بار پھر نامن درگا سے اس کا نام پوچھا اور کہا۔
”دیکھ ناری! میں جانتا ہوں کہ تو منش نامن ہے۔ اگر تو مجھے اپنا نام پتہ بتا دے اور یہ بھی بتا دے کہ ممان نامن کون سے جنگل میں رہتی ہے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“

اس کے جواب میں نامن درگا خاموش رہی۔ تب سپیرے نے اسے دوبارہ ہنڈیا میں بند کر کے اوپر ڈھکن رکھ دیا اور بولا۔

”یہ جان بوجھ کر چپ ہو گئی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ منش نامن ہے۔ اس میں وہ ساری نشانیوں موجود ہیں جو میرے گورو نے بتائی ہیں اور ایک عورت نامن میں ہوتی ہے۔“

سپیرن نے پوچھا۔

”تو اب اس کو کہاں لے جائے گا؟“

سپیرے نے کہا۔

”میں اسے اپنے گورو کے پاس لے جاؤں گا وہ اس سے ممان نامن کے جنگل کے خزانے کا راز معلوم کر لے گا۔ اسے ایسے منتر آتے ہیں جس کے پھونکنے سے یہ نامن اپنے آپ خزانے کا راز بتا دے گی۔ اس کے بعد ہم اس کے دو ٹکڑے کریں گے۔ ایک ٹکڑا میرے گورو کھا جائے گا۔ دوسرا ٹکڑا میں کھا جاؤں گا۔ جانتی ہو اس کا کیا اثر ہو گا؟“

”کیا اثر ہو گا؟“ سپیرن نے پوچھا۔

سپیرے نے کہا۔

”اس کے اثر سے میں اور میرا گورو ہمیشہ کے لیے امیر ہو جائیں گے۔ ہم کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ اگر بوڑھے ہیں تو جوان ہو جائیں گے اور کم از کم ایک ہزار

سب تک زندہ رہیں گے۔“

سپیرن نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

”اپنے نکلے میں سے ٹھوڑا سا سناپ مجھے بھی کھلا دیتا۔ میں بھی پھر سے جوان

بنا جاتی ہوں۔“

سپیرے نے ہنڈیا کو کپڑے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”پہلے اپنے گورو کے پاس تو پہنچ جانے دو پھر تمہیں بھی کھلا دیں گے۔“

اب میں طاق میں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ ناگن درگا کی جان خطرے میں تھی۔

میں نے وہیں سے سپیرے پر چھلانگ لگا دی اور اس کی گود میں گرا۔ گرتے ہی میں

نے اس کے بازو پر ڈس دیا۔ سپیرن جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ سپیرا بالکل نہیں گھبرا

تھا اس نے فوراً مجھے گردن سے دبوچ لیا اور سپیرن سے کہا۔

”جھولے میں سے مہو نکالو جلدی کرو۔“

سپیرن نے جھولے میں سے مہو نکال کر سپیرے کو دیا۔ اس نے مہو اپنے بازو پر

اس جگہ لگا لیا جہاں میں نے اسے ڈسا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے مہو کو تھام رکھا تھا

اور دوسرے ہاتھ سے مجھے گردن سے اس بری طرح سے دبوچا ہوا تھا کہ مجھے سانس

لینا مشکل ہو رہا تھا۔ سناپ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی گردن ہوتی ہے۔ اگر آپ

اس کی گردن کو دبوچ لیں اور گھبراہٹیں بالکل نہ تو سناپ آپ کو کبھی نہیں ڈسے گا اور

دم گھٹنے سے مر بھی جائے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنا جسم آپ کی کلائی

سے لپیٹ کر آپ کی کلائی کی ہڈی توڑنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایک عام سائیز کے

سناپ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ سناپ کے مہو نے سپیرے کے جسم سے وہ سارا

زہر چوس لیا تھا جو میں نے ڈس کر اس کے خون میں شامل کیا تھا۔ سپیرے نے مہو

نچوڑا تو اس میں سے سیاہ زہر کے قطرے گرنے لگے۔

اس نے سپیرن سے کہا۔

”یہ کوئی زبردست ہتھی والا سناپ ہے۔“

سپیرن نے کہا۔

”یہ موڈی سبیل کمل سے آگیا تھا۔“

سپیرا بولا۔

”ایسے ہتھی والے سناپ بھوپال کے ان خطرناک جنگلوں میں ہی مل سکتے ہیں۔“

”اس کو مار ڈالو۔“ سپیرن نے کہا۔

سپیرے نے کہا۔

”یہ سناپ تو خوش نصیب سپیروں کو ہی ملتا ہے۔ میں اسے بھی اپنے گورو کے

پاس لے جاؤں گا۔“

اور اس نے مجھے بھی اسی ہنڈیا میں ڈال کر جلدی سے اوپر ڈھکن دے دیا اور کپڑا

لپیٹ کر ہنڈیا جھولے میں ڈال دی۔ ہنڈیا میں آتے ہی مجھے ناگن درگا کی خوشبو نے

اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں ناگن درگا اور ناگن درگا میرے ساتھ گئی ہوئی تھی۔

ناگن درگانے مجھے اور میں نے ناگن درگا کو پہچان لیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”بھگوان کی مجھ پر کتنی کہا ہوئی ہے کہ اس نے تمہیں مجھ سے ملا دیا۔“

میں نے کہا۔

”لیکن ہم موت کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سپیرا ہمیں اپنے گورو کے پاس لے جا

رہا ہے جو ہم دونوں پر منتر پھونک کر ہم سے کچھ باتیں معلوم کر لے گا اور پھر یہ

دونوں سپیرے گورو اور چیلہا ہمارے نکلے کر کے کھا جائیں گے۔“

اس دوران ہمیں سپیرے کی آواز آئی۔

”چلو بھاگ دان گورو کے ڈیرے پر چلتے ہیں۔“

سپیرن نے پوچھا۔

”تمہارے گورو جی کا ڈیرا تو میل سے بہت دور ہے۔“

سپیرے نے جھولا کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہم لاری پر جائیں گے۔ پیدل تھوڑے جائیں گے۔“

دونوں کو غمزدی سے نکل کر جنگل میں کسی طرف چل پڑے۔ میں اور درگا ناگن ہنڈیا کے اندر بند ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور انسانی سرگوشیوں میں کسی کسی وقت کوئی بات کر لیتے تھے تاکہ سپیرا ہم دونوں میں سے کسی کی آواز نہ سن سکے۔ ناگن درگا نے کہا۔

”اس کم بخت ہنڈیا کا ڈھکن زور سے بند کیا ہوا ہے۔ ہم کوشش کر کے بھی اسے نہیں اٹھا سکتے۔“
میں نے کہا۔

”ڈھکن اٹھا بھی لیا تو ہنڈیا کے گرد کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ ہم کپڑے سے کیسے باہر نکلیں گے۔“

”پھر اب کیا کریں۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں اور کس طرف چلے گئے تھے۔ جب ہمارے پیچھے ہمیں مارنے کو آدمی دوڑے تھے تو میں تو اوھر اوھر سے چھپتی چھپاتی شام کو بھیروں جی کے مندر میں آگئی تھی اور کئی دن تھکرا دیا وہیں انتظار کرتی رہی۔“
میں نے سرگوشی میں کہا۔

”درگا! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ پہلے اس مصیبت سے جان چھوٹے تو پھر ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستان غم بھی سنا دیں گے۔“
وہ بولی۔

”اس سے پہلے کہ یہ دھشت اپنے گورو کے پاس پہنچے، ہمیں کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“
میں نے کہا۔

”یہ کوئی بڑا کئی والا“ تجربے کار پرانا سپیرا ہے۔ اس سے جان بچانے کے واسطے کوئی انوکھی ترکیب سوچنی پڑے گی۔“

ہم باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ ہمیں باہر سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آئی تھی۔ خدا جانے یہ سپیرا اور سپیرن جنگل کے کس شارٹ کٹ سے ہو کر کسی

سڑک پر نکل آئے تھے۔ پھر ہمیں ایسے لگا جیسے کوئی لاری ہمارے پاس ہی آ کر رک گئی ہے۔ کسی نے آواز دی۔

”چلو چلو، بیٹھو جلدی کرو۔“

”بیٹھ گئے، پاؤ، بیٹھ گئے۔ آؤ بھاگوان۔“

یہ سپیرے کی آواز تھی۔ دونوں کی لاری پر بیٹھ گئے تھے۔ ”ی چل پڑی۔ کتنی دیر تک لاری چلتی رہی۔ ایک جگہ رکی پھر آگے روانہ ہو گئی۔ جھولے کے اندر ابھی تک اندھیرا تھا۔ کیونکہ سپیرا اور سپیرن ہمیں لے کر رات کے وقت جنگل سے چلے گئے۔ لاری کا سفر کافی لمبا تھا۔ آہستہ آہستہ ہنڈیا کے اندر صبح کی سفیدی جھلکنے لگی۔ میں نے درگا سے کہا۔

”درگا دن نکل آیا ہے۔“

ہنڈیا کے اندر اس کے ڈھکن کے سوراخوں میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ وہ بولی۔

”بھگوان جانے یہ ہمیں کہاں سے کہاں لے آیا ہے۔“

میں نے درگا سے پوچھا کہ وہ اس سپیرے کے قابو کیسے آگئی؟ اس نے بتایا کہ وہ چھندواڑہ کے جنگل میں میری تلاش میں بھوپال کی طرف آ رہی تھی کہ ایک جگہ وہ جنگل سے نکل کر ایک نہر کے کنارے پر ہو گئی۔ بس وہیں کہیں سے اس سپیرے نے درگا کو دیکھ لیا اور اس کی بو سے پہچان گیا کہ یہ ناگن سانپ نہیں ہے، بلکہ عورت ہے اور وہیں سے وہ اس کے پیچھے لگ گیا اور آخر ایک جگہ اسے قابو کر لیا۔ لاری کسی جگہ رک گئی۔ باہر سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی لاری اڑھ تھا۔ یہاں سے سپیرا اور سپیرن پیدل ہی کسی طرف روانہ ہو گئے۔ دیر تک دونوں پیدل چلتے رہے۔ پھر کسی جگہ بیٹھ گئے۔ سپیرن کہنے لگی۔

”ارے ہنڈیا کھول کر دیکھو تو سبھی دونوں زندہ بھی ہیں کہ ایک دوسرے کو ڈس کر مرے پڑے ہیں۔“

سیرے نے کہا۔

”اری سورکھا کبھی ایسا ہوا ہے بھلا۔“

سیرن نے کہا۔

”پھر بھی ایک دفعہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گورو جی کے پاس جا کر تم ہنڈیا کھولو تو دونوں مرے پڑے ہوں اور گورو جی کے آگے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔“

سیرا بولا۔

”اگر تو کہتی ہے تو کھول کر دیکھ لیتا ہوں۔“

یہ مکالمے ہم دونوں نے سنے تھے۔ میں نے ناگن درگا سے سرکوشی میں کہا۔

”درگا! بس یہی موقع ہے جیسے ہی سیرا ہنڈیا کا ڈھکن اٹھائے اسے فوراً ڈس دینا اور پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ باہر کو اچھل کر نکل جانا اور جس طرف منہ اٹھے بھاگ جانا۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا اور تمہارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔“

سیرا جھولے میں سے کپڑے میں لپیٹی ہوئی ہنڈیا نکل رہا تھا۔ اس نے کپڑے کو کھولا۔ پھر ہنڈیا کو کسی جگہ رکھ دیا۔ وہ اس کا ڈھکن اٹھانے لگا تھا کہ ناگن درگا سے غلطی ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ سیرا ڈھکن اٹھا کر اندر ہاتھ ڈالتا اور درگا اسے ڈستی اس نے اسی وقت پوری طاقت سے اپنا سر اوپر کو اچھلا۔ اس کا سر زور سے ہنڈیا کے ڈھکن سے ٹکرایا۔ ہنڈیا کا ڈھکن تو نہ گرا لیکن سیرا اپنے ہاتھ کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ہنڈیا اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ ہم دونوں ابھی تک ہنڈیا کے اندر تھے۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ جیسے ہی ہنڈیا زمین پر گر کر ٹوٹے گی سیرا وہیں ہم دونوں کو دبوچ لے گا، مگر نہ ہنڈیا زمین پر گری اور نہ کسی نے ہمیں دبوچا۔ ہمیں ایسی آواز آئی جیسے ہنڈیا اوپر سے نیچے کو لڑھکتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا ڈھکن علیحدہ ہو گیا تھا اور پھر وہ پانی میں گر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ہم دونوں ایک بہت بڑے دریا میں گرے ہیں۔ ہنڈیا

اوپر دریا کے پل سے گری تھی جس نے مجھے سیرا اور سیرن گھبرائے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے نظر آئے۔ میں نے ناگن درگا کو آواز دی۔ ہم ہنڈیا سے باہر نکل کر دریا میں الگ الگ گرے تھے اور دریا کی تیز رفتار موجیں ہمیں بہا کر آگے ہی آگے لے جا رہی تھیں۔ سانپ دریا میں ڈوبتا نہیں، وہ دریا میں تیرتا ہے۔ مگر دریا چوڑا ہو اور لہریں تیز رفتار ہوں تو پھر اس کے ڈوب کر مرنے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے۔ میں نے ناگن درگا کو دو تین بار زور زور سے پکارا۔ مگر نہ مجھے درگا کی آواز ہی آئی نہ وہ خود مجھے دریا کی لہروں پر کہیں دکھائی دی۔ دریا کی لہریں بالکل سمندر کی طرح اوپر کو اچھل رہی تھیں۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور دریا کی رولنی بھی تیز تھی اور وہ خلیب میں تیزی سے لہروں کو اچھل اچھل کر بہتا چلا جا رہا تھا۔ دریا کا بہلو مجھے بالکل سیدھا لے جا رہا تھا۔ کنارے کئی دور نظر آ رہے تھے۔ اتنے تیز بہلو میں دریا کے کناروں کی طرف جانا تقریباً ناممکن تھا۔ میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ آخر مجھے ناگن درگا کی آواز آئی۔ اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ میں نے فوراً جواب میں اسے آواز دی۔ دریا کی لہروں کا شور آگے جا کر کم ہو گیا تھا۔ میں نے ناگن کو دیکھ لیا۔

میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے اس کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ میں بڑی جدوجہد کے بعد اس کے پاس پہنچ گیا۔ درگا نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”کرم دان! کنارے کی طرف جانے کی کوشش کرو۔“

ہم دونوں ایک دوسرے سے قاصطے پر تھے اور دونوں کنارے کی طرف جانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ انتہائی ہمت شکن جدوجہد کے بعد ہم دریا کے کنارے پانی میں گرے ہوئے ایک درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم درخت کے ایک بڑے ٹن پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے۔ ناگن درگا میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”کنارے پر آ جاؤ، کنارہ زیادہ دور نہیں ہے۔“

ہم درخت کے تنے پر سے ہو کر دریا میں اتر گئے۔ یہاں دریا کی روانی بہت دھیمی تھی۔ ہم بڑی جلدی تیرتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔ کنارے پر جھاڑیاں سرکندے اور گھنے درخت ساتھ ساتھ کھڑے دور تک چلے گئے تھے۔

ہم جھاڑیوں میں سے نکل کر درختوں کے درمیان آ گئے۔ یہاں ایک راستہ تھا جس پر نل گاڑیوں کے چلنے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ ارد گرد کوئی آہلوی نظر نہیں آتی تھی۔ ناممکن درگا نے پوچھا۔

”یہ کون سی جگہ ہے کرم داد؟“

میں نے کہا۔

”تم ادھر کی رہنے والی ہو۔ تمہیں زیادہ معلوم ہونا چاہیے۔“

وہ بولی۔

”میرا خیال ہے کہ یہ تاپتی دریا ہے اور ہم ہوشنگ آبلو کے علاقے میں کہیں ہیں۔“

میں نے کہا۔

”پھر تو ہم بھوپال سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہم یہاں سے بھوپال واپس جا سکتے ہیں۔“

درگا نے کہا۔

”تم تو بھوپال ضرور جاؤ گے۔ وہاں تمہاری بیوی جو ہے مگر میرا تو اب تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس امید پر زندہ ہوں کہ کب تم انسانی شکل میں آ کر میرا منہ چومو اور میں عورت کی شکل میں واپس آ جاؤں۔“

میں نے درگا سے کہا۔

”درگلا میں جب انسانی شکل میں تھا تو تمہاری تلاش میں در بدر مارا پھرتا رہا۔ مگر تم مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تم مجھے اس وقت ملو گی جب میں بھی انسان سے سانپ بن چکا ہوں۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب

بھوپال میں میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے اسے پاکستان واپس بھجوا دیا ہے۔ اب میں بھوپال میں اپنے ساتھی خالد کے پاس ہی جاؤں گا۔“

درگا نے گہرا سانس بھرا اور بولی۔

”کرم داد! میں نے یہ سوچا تھا کہ ہم دونوں عورت اور مرد کے روپ میں زندگی کے کچھ خوبصورت سال ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر بسر کریں گے لیکن ایسا لگتا ہے کہ بھگوان کو یہ منظور نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہاں سے کس طرف چلیں؟“

درگا نے درختوں میں جاتے کچے راستے کو دیکھا اور بولی۔

”اس راستے پر چل پڑتے ہیں کوئی گاؤں یا شہر آئے گا تو معلوم کریں گے کہ ہم

کہاں پر ہیں اور بھوپال یہاں سے کتنی دور ہے۔“

ہم دریا کے کنارے سے اتر کر کچے راستے سے ایک طرف ہو کر روانہ ہو گئے۔



کہیں اس علاقے کے کسان کام کرتے نظر آنے لگے تھے۔ پھر دور سے مجھے کسی کارخانے کی چنی نظر پڑی۔

میں نے ناگن درگا سے کہا۔
 ”آگے کوئی شہر ہے۔ وہ دیکھو کارخانے کی چنی۔“
 اس نے چنی کو دیکھا اور بولی۔

”اب ہمیں بڑی احتیاط برتنی ہوگی۔ کسی انسان کی ہم پر نظر پڑ گئی تو ہم دونوں مارے جائیں گے یا پھر دونوں ایک دوسرے سے ایک بار پھر بچھڑ جائیں گے۔“
 میں نے کہا۔

”ہم شہر سے باہر رہیں گے اور ریلوے لائن ڈھونڈ کر دین کسی جگہ چھپ جائیں گے۔ جب رات کا اندھیرا پھیل جائے گا تو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے سٹیشن پر پہنچ کر بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کریں گے۔“
 شہر کی آبادی شروع ہو گئی۔ ہم ایک ملاؤن کالونی کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر رہ کر آگے گزر گئے۔ یہ کوئی بہت بڑا شہر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی کافی آبادی والا شہر تھا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں پر بھی مکان بنے ہوئے تھے۔ ہم شہر کی آبادی سے دور رہ کر کھیتوں اور میدانوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے ریلوے کا سٹنل دکھائی دیا۔ میں نے درگا کو سٹنل کا کھبا دکھایا اور کہا۔

”خدا کا شکر ہے ہمیں ریلوے لائن کا سراغ مل گیا ہے۔ اس طرف چلتے ہیں۔“
 ہم کھیتوں، میدانوں اور تلاءوں کے قریب سے ہوتے ہوئے ریلوے لائن کے اونچے بند پر چڑھ گئے۔ ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ درگانے کہا۔
 ”جس طرف سٹنل کا کھبا ہے، سٹیشن اسی طرف ہوگا۔“

ہم سٹنل کے کھبے کی جانب ریلوے لائن کے پہلو میں چلتے گئے۔ جب دور سے ہمیں سٹیشن کی ڈھلانی چھتیں اور سٹنل کے دوسرے کھبے بھی نظر آنے لگے تو ہم ریلوے ٹریک سے اتر کر ایک درخت کے نیچے گھاس میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ناگن



ایک بات نہ میری سمجھ میں آ رہی تھی نہ ناگن درگا کی۔

پھر وہ بات یہ تھی کہ ہم دونوں ہی سانپوں کے روپ میں تھے۔ ہم یہ کس طرح اور کیسے معلوم کریں گے کہ آگے جو شہر آئے گا وہاں سے بھوپال کی طرف گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم سے جائے گی۔ یہ بڑا وقت طلب مسئلہ تھا اور یہ مشکل مجھے کئی بار پڑ چکی تھی۔ ناگن درگا بھی یہی سوچ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی بلکہ رینگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”میرا اندازہ یہی تھا کہ ہم چند واڑہ اور ہو شنگ آباد کے درمیان کسی شہر کے آس پاس ہیں۔ دن کا وقت ہے۔ اگر کوئی شہر آگیا تو ہمیں کسی جگہ چھپ کر رات کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ بھوپال کی گاڑی کون سے پلیٹ فارم سے روانہ ہوگی۔ اس کے بعد ہمیں اس گاڑی کی چھت پر کسی طرح پہنچنا ہوگا۔“

میں نے کہا۔

”یہ پریشانی تو ضرور پیش آئے گی لیکن پہلے کوئی شہر تو آئے اور یہ معلوم ہو کہ یہ کون سا شہر ہے۔“

ہم کچے راستے پر کنارے کی طرف ہو کر گھاس اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب اب کھیت شروع ہو گئے تھے۔ کھیتوں میں کہیں

درگا بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ عورت کی انسانی آواز میں اور میں مرد کی انسانی آواز میں بات کر رہا تھا۔ درخت کی وجہ سے ہم ریلوے لائن کی اوٹ میں تھے اور ریلوے لائن ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں ہمیں اس وقت تک چھپے رہنا تھا جب تک کہ رات کا اندھیرا نہیں پھیل جاتا۔ تاگن درگا نے میرا نام لے کر کہا۔

”کرم دادا! کیا تم بھی اپنی بیوی کے پاس پاکستان چلے جاؤ گے؟“

تاگن درگا ہندو عورت تھی اور بھارتی شہری تھی۔ وہ کسی بھی وقت عورت کی شکل میں واپس آ سکتی تھی یا میں انسانی روپ میں آ کر اسے عورت کے روپ میں واپس لا سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں اسے بھارت میں اپنے عزائم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا“ ہو سکتا ہے ابھی کچھ دیر بھارت میں ہی رہنا پڑ جائے۔“

وہ بولی۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بیشہ کے لیے بھارت میں ہی رہ جاؤ۔“

”درگا! اس سے تمہیں کیا ملے گا؟“

اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

”مجھے تم مل جاؤ گے“ مجھے اور کیا چاہیے۔“

تاگن درگا جذباتی ہو رہی تھی۔ یہ مجھے بہت پہلے احساس ہو چکا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن چونکہ میرا مشن اس قسم کی انسانی جذباتی کمزوریوں سے بہت بلند تھا اس لیے میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ جس تک محبت کے جذبات کا تعلق تھا تو میں ان جذبات سے محروم نہیں تھا۔ لیکن مجھے صرف اپنی بیوی جیلہ سے ہی محبت تھی۔ میں ایک سیدھا سلا فوجی ٹائپ کا شریف اور سلا مسلمان تھا۔ بیوی ملی تو اس سے محبت کرنے لگا۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ آتی بھی تو میں اپنی بیوی سے ہی محبت کر سکتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ

ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے صرف اور صرف اپنی بیوی سے ہی محبت کرتے ہیں وہ دنیا میں بڑے سکھی رہتے ہیں۔

تاگن درگا مجھ سے محبت کی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ کہنے لگی۔

”کرم دادا! جب میں نے حمیس پہلی بار دیکھا تھا تو تم اسی وقت میرے دل میں اتر گئے تھے اور مجھے تم سے پریم ہو گیا تھا۔ مجھے بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے پریم کرتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”درگا! مجھے پریم کی باتیں بالکل نہیں سوجھ رہیں۔ اس وقت تو ہمیں اپنی پڑی ہے۔“

وہ بولی۔

”لیکن میں تو اس وقت بھی تم سے پریم کی باتیں کر رہی ہوں۔ بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے پریم کرتے ہو کرم دادا؟“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”اگر تم مجھ سے پریم کرتی ہو تو پھر میں تم سے پریم کیسے نہیں کر سکتا۔“

تاگن درگا نے اپنا سٹپ کا جسم میرے سٹپ کے جسم کے بالکل ساتھ لگا دیا اور ہلکی سے آہ بھر کر بولی۔

”کرم دادا! تم نے میری آتما کو بڑی شانتی دی ہے۔ مجھ سے اسی طرح پریم کرتے رہنا یاد رکھنا اگر کبھی ایسا وقت آ گیا تو میں تمہارے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔“

ہمیں درخت کے چھپے ریلوے لائن کی جانب کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔

”ارے لڑکی لڑکا ہیں“ ضرور گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔“

ہم دونوں جھاڑیوں میں سٹ گئے۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

”مجھے تو دونوں بد معاش معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کرتے

ہیں۔

اور دو آدمی اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ دونوں نوجوان تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جس لڑکی اور لڑکے کی وہ آوازیں سن رہے تھے ان میں سے کوئی بھی وہاں نہیں ہے تو ان کے چہروں پر دہشت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میں ان کو جھاڑیوں کے اندر سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے رنگ اڑ گئے تھے۔ ایک لڑکے نے بڑی مشکل سے کہا۔

”وہ وہ کہاں چلے گئے؟“

دوسرے نے سسکی ہوئی آواز میں کہا۔

”راسوا بھاگو یہاں بھوت رہتے ہیں۔“

اور دونوں تیزی سے کھیتوں کی طرف بھاگے کہ ان میں سے ایک لڑکا ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب دوڑ پڑا اور دیکھتے دیکھتے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تاہم درگاہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”اگر ہم عورت مزدکی شکل میں ہوتے تو مشکل پڑ سکتی تھی۔“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ وہ دونوں تو اتنے ڈر گئے تھے کہ ان سے بات نہیں ہو رہی تھی۔“

تاہم درگاہ میرے بالکل ساتھ ہلکی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

”کرم دانا! مجھے بتاؤ، تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے؟“

میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

”درگاہ! تم خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو، حوصلہ رکھو میں ابھی کہیں نہیں جاؤں گا۔“

دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر کچھ دیر بعد ایک ریل گاڑی دھڑدھڑاتی ہوئی گزر گئی۔ تاہم درگاہ جھاڑی میں سے نکل کر گاڑی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی گزر گئی تو بولی۔

”یہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی۔ بھوپال کی طرف سے آئی ہوگی۔ بھوپال جانے والی

گاڑی دوسری طرف سے آئے گی۔“

میں نے کہا۔

”کیوں نہ ہم چھپ چھپا کر اس وقت سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کریں؟“

تاہم درگاہ واپس میرے پاس جھاڑی میں آ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

”دن کی روشنی میں باہر نکلنا خطرناک ہو گا۔ ہمیں کم از کم شام کا اندھیرا ہونے

تک اسی جگہ چھپے رہنا ہو گا۔“

چنانچہ ہم شام ہونے تک اسی جگہ جھاڑی میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد شام کا دھندلا رات کے پہلے اندھیروں میں تبدیل ہو گیا تو ہم جھاڑی میں سے نکل کر ریلوے لائن پر آ گئے اور سٹیشن کی طرف ریگنا شروع کر دیا جس کی روشنی ہمیں کچھ فاصلے پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم بڑے اطمینان سے سٹیشن کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح ہم سٹیشن کے قریب آ گئے۔ جو ٹرین بھوپال کی طرف سے آئی تھی وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں کا رش بھی تھا۔ میں نے درگاہ سے کہا۔

”ہمیں دوسری طرف سے ہو کر پلیٹ فارم پر کسی جگہ چھپنا ہو گا۔ پھر جب دوسری

طرف سے کوئی گاڑی آئے گی تو اس کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔“

درگاہ نے کہا۔

”بھگوان کرے کہ وہ گاڑی بھوپال کی طرف ہی جا رہی ہو۔“

ہم ریلوے لائنوں کو عبور کر کے آگے کی طرف ریگتے ہوئے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر پلیٹ فارم کے عقب کی جانب ہو گئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر سٹیشن پڑا ہوا تھا۔ زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ ہم سٹیشن کے کونوں کے پیچھے چپ کر بیٹھ گئے۔ اس طرف کوئی مسافر یا کوئی دوسرا شخص نہیں آتا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ٹرین کے گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے دھڑ دھڑا کر اور ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے تاہم درگاہ سے کہا۔

”پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سٹیشن کا نام لکھا ہو گا۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں

آگے جا کر معلوم کرتا ہوں کہ اس شیش کا نام کیا ہے۔“

درگاہ نے کہا۔

”اپنا خیال رکھنا کرم داد۔“

میں سلن کے ڈھیر میں سے نکل کر پلیٹ فارم کے آخری کنارے کی طرف ریٹگنے لگا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں بورڈ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں اوپر کھجے کے ساتھ تو بلب روشن تھا۔ میں نے شیش کا نام پڑھا جو ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہی لکھا ہوا تھا۔ میں اسی طرح ریٹگتا ہوا درگاہ کے پاس واپس آ گیا اور اسے کہا۔

”شیش کا نام دھری داڑھ ہے۔“

نامن درگاہ نے فوراً کہا۔

”میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا کرم داد۔ ہم چند داڑھ اور ہوشنگ آبلو کے درمیان ہی ہیں۔ جو ٹرین ابھی ابھی گئی ہے وہ ٹاگ پور ہی کی طرف جا رہی تھی۔ ادھر سے اب جو ٹرین آئے گی وہ ہوشنگ آبلو سے ہوتی ہوئی بھوپال جائے گی۔“

مجھے بھی تسلیم ہو گئی تھی کہ ہم بھوپال پہنچ جائیں گے۔ اب ہمیں ٹاگ پور کی طرف سے آنے والی ٹرین کا انتظار تھا۔ آخر کئی دیر انتظار کرنے کے بعد ایک ٹرین ٹاگ پور کی طرف سے آکر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ہم دونوں سلن کے پیچھے سے نکلے اور پلیٹ فارم کی ڈھلان اتر گئے۔ پھر ریلوے لائنوں کو عبور کیا اور جس پلیٹ فارم پر ٹرین کھڑی تھی اس کی دوسری طرف سے آکر ایک ڈبے کے پیلوں پر سے ریٹگتے ہوئے ڈبے کی چست پر چڑھ گئے۔ یہ بہت بڑا مرحلہ تھا جس کو ہم نے طے کر لیا تھا۔ میں نے درگاہ سے کہا۔

”درگاہ! اب یہ سمجھ لو کہ ہم بھوپال پہنچ گئے۔“

درگاہ کہنے لگی۔

”یہ گاڑی آدھی رات کے بعد بھوپال پہنچے گی۔ اس وقت ہم کھل جائیں گے؟“

میں نے کہا۔

”بھوپال میں میرا جو دوست ہے میں اس کے گھر جانے کی کوشش کروں گا۔“

وہ بولی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔“

میں درگاہ کو کسی حالت میں بھی بھوپال کے سر فروش عبادوں کی خفیہ کمین گاہ میں نہیں لے جاسکتا تھا۔ میں نے کہا۔

”درگاہ! مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرا دوست اپنے گھر پر ہوگا یا نہیں ہوگا۔ تم میرے ساتھ اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیتی ہو۔ میں بھی یہ نہیں چاہتا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بھیروں جی کے مندر میں جا کر کسی جگہ چھپ جانا۔ رات گزر جائے گی تو میں صبح تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ اس کے بعد سوچ لیں گے کہ ہمیں کھل جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔“

درگاہ راضی نہیں ہوتی تھی مگر میں نے اسے راضی کر لیا۔ اتنی دیر میں ٹرین چل پڑی۔ ہم دونوں پہلے تو کنڈلی مار کر ڈبے کی چست کے بالکل درمیان بیٹھے تھے۔ جب ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی اور ہوا بھی تیز چھینڑوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی تو ہم چست پر بالکل ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں تاریک جنگلوں میں سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ گاڑی دیر تک چلتی گئی۔ پھر کوئی شیش آیا۔ ٹرین وہاں تھوڑی دیر کے لیے رکی اور آگے روانہ ہو گئی۔ اسی طرح کئی شیش آئے اور گزر گئے۔ ایک شیش پر ٹرین رکی تو درگاہ کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے آگے ہوشنگ آبلو کا شیش آئے گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ نامن درگاہ کا اندازہ درست لگا۔ اگلا شیش ہوشنگ آبلو کا شیش تھا۔ یہ بڑا شر تھا۔ شیش بھی کئی کشادہ تھا اور روشنیوں سے جھلکا رہا تھا۔ ٹرین ایک بار رونق پلیٹ فارم پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں اور نامن درگاہ ڈبے کی چست سے چپے ہوئے تھے۔ ہم نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ ہمارا ڈبہ پچھلے ڈبے سے ایک دو ڈبے آگے تھا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی بھی نظر آ رہے تھے اور ایک نکت چکر بھی

ایک طرف کھڑا مسافروں کو ڈبے میں سوار ہوتے اور ڈبے سے اترتے دیکھ رہا تھا۔

ہم ڈبے کی چھت سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے درگا سے پوچھا۔

”کسی کی ہم پر نظر نہ پڑ جائے۔ یہ بتاؤ کہ گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرتی ہے؟“

میں نے بڑی دھیمی آواز میں درگا سے پوچھا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”کچھ معلوم نہیں“ ہو شنگ آبلو بڑا شیش ہے۔ یہاں گاڑی دیر تک رکتی ہے۔

خاموشی سے لیٹے رہو۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔“

اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ٹرین چل پڑی ہے مگر ٹرین اپنی

جگہ پر کھڑی تھی۔ یہ جھٹکا صرف مجھے ہی لگا تھا۔ میں ایک دم سے ہوشیار ہو گیا۔ میرے

ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی مجھے اپنا جسم

بوجھل اور بھاری محسوس ہونے لگا۔ میری کلیا پلٹ ہو رہی تھی۔ میں سانپ سے واپس

انسانی شکل میں آ رہا تھا۔ میں نے درگا سے کہا۔

”درگا! میں اپنی شکل میں واپس آ رہا ہوں۔“

درگا نے خوش ہو کر کہا۔

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو کرم دلو؟“

میں نے کہا۔

”ہاں، مگر انسانی شکل میں آتے ہی مجھے چھت پر لینا لوگ دیکھ لیں گے۔“

درگا نے جلدی سے کہا۔

”تم نیچے اتر جاؤ کرم دادا! ڈبے کی دوسری طرف سے نیچے اتر جاؤ۔“

لیکن قسمت نے مجھے اتنی مہلت نہ دی۔ مجھے دو تین اور جھٹکے لگے اور پھر میں

ایک دم سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ گیا۔ میں چھت پر لینا ہوا تھا۔ یہاں کافی

روشنی تھی۔ لوگوں نے ایک آدمی کو چھت پر لینے دیکھا تو وہاں جمع ہو گئے۔ کسی نے

کہا۔

”یہ کوئی پاگل آدمی ہے، پولیس کو بلاؤ۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں شور مچ گیا۔ پولیس کے سپاہی اور نکٹ چیکر دوڑ کر ڈبے

کے پاس آ گئے۔ پولیس کے سپاہی نے کڑخت آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟ اوپر کیوں بیٹھے ہو؟ نیچے اترو۔“

ناگن درگا میرے پاس ہی ڈبے کی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

”کرم دادا! بھگوان کے لیے میرا منہ چوم لو، میرا منہ چوم لو۔“

لیکن دونوں پولیس کے سپاہی ڈبے کے اوپر چڑھ آئے۔ ان کی نظر میرے پاس ہی

ڈبے کی چھت پر ایک سانپ پر پڑی تو شور مچا دیا۔

”ارے سانپ ہے سانپ۔“

اور ایک سپاہی ڈنڈا مارتا ہوا ناگن درگا کی طرف بڑھا۔ میں نے جلدی سے ناگن

درگا کو اٹھا لیا اور کہا۔

”یہ میرا سانپ ہے۔ میں نے اسے پال رکھا ہے۔ ڈبے کے اندر رش تھا اس

لئے چھت پر چڑھ گیا۔“

سپاہی کچھ خوف زدہ سے ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

”اے اس سالے سانپ کو پھینک دو۔“

میں نے ناگن درگا کو اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کہا۔

”سنتری جی! یہ میرا پالتو سانپ ہے۔ کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے اس کا زہر

نکال دیا ہے۔“

پولیس نے مجھے ڈبے کی چھت سے نیچے اتار لیا۔ مسافر جمع ہو گئے تھے اور مجھے

بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ آدمی ڈبے کی چھت پر ستر کر رہا تھا۔

نکٹ چیکر بھی آ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”نکٹ دکھاؤ، کمل سے ٹرین پر چڑھے تھے؟“

میرے پاس نکٹ کمل تھا۔ میں نے کہا۔

”مہاراج! بت یہ ہے کہ میں غریب آدمی ہوں۔ یہ میرا پالتو سانپ ہے اور میں

اسے بھیروں جی کے مندر کی یاترا کرانے بھوپال لے جا رہا ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی مجھے بھوپال چلے جانے دیں۔“

نکٹ چیکر بڑا سخت مزاج ہندو تھا۔ کہنے لگا۔

”یہ کتنا کمائی کسی اور کو سنا۔ نکٹ کے پیسے نکلاؤ۔ تمہیں ناگ پور سے ہو شنگ آبلو کا کرایہ بھی ادا کرنا ہوگا اور جرمانہ بھی بھرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔

”ہمارا بچہ میرے پاس تو پھونٹی کوڑی نہیں ہے، پیسے کہاں سے نکالوں۔“

نکٹ چیکر نے پولیس کے سپاہیوں سے کہا۔

”اے میرے دفتر میں لے آؤ۔ اسے بغیر نکٹ سفر کرنے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ ان لوگوں نے انڈین ریلوے کو اپنے ہاپ کامل سمجھ رکھا ہے۔ چلو۔“

دونوں سپاہیوں نے مجھے بازوؤں سے دبوچ لیا اور کھینچتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے جہاں دو تین کلرک بیٹھے کام کر رہے تھے۔ نکٹ چیکر نے سپاہیوں سے کہا۔

”اے اندر بند کر دو۔“

اسی کمرے میں ایک حوالات سی بی ہوئی تھی۔ جس پر سلاخوں والا دروازہ لگا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے حوالات کے اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ نکٹ چیکر نے میز کی دراز میں سے ایک تالا نکالا اور دروازے پر لگاتے ہوئے بولا۔

”تم لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، یاترا کا بھلنا بنا کر ریل گاڑیوں میں مفت سفر کرتے رہتے ہو۔ آج کی رات تو حوالات میں گزار دو صبح تمہیں ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“

میں واقعی پریشان ہو گیا۔ اس لیے میں بھوپال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پولیس میری تلاش میں تھی۔ میں کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اگر میرا راز کھل جاتا ہے اور پولیس کو علم ہو گیا کہ میں ہی وہ کمانڈو ہوں جس نے علاقے میں کئی دھماکے کئے تھے تو پھر میرا بچنا عمل تھا اور میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا

تھا۔ ناگن درگا سناپ کی شکل میں میری جیب میں تھی۔ میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہندو خواہ کتنا ہی لٹرن اور پڑھا لکھا کیوں نہ ہو وہ بنیادی طور پر توہم پرست ہوتا ہے اور دیوی دیوتیوں کے شرمپ یعنی بد دعوؤں سے بے حد ڈرتا ہے۔ میں نے دل میں طے کر لیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نکٹ چیکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے ساتھی کلرکوں سے بغیر نکٹ سفر کرنے والوں کی سرزنش کے بارے میں باتیں کرنے لگا تھا۔ اتنے میں بھوپال کی طرف جانے والی ٹرین روانہ ہو گئی۔ میں بڑی حسرت بھری نظروں سے اسے دفتر کے دروازے کے باہر پلیٹ فارم پر سے گزرتے دیکھتا رہا۔

جب ٹرین چلی گئی اور پولیس کے سپاہی بھی چلے گئے اور پلیٹ فارم پر کسی حد تک خاموشی چھا گئی تو میں نے اپنے پلان پر عمل کرتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں نعرہ لگایا۔

”جے شو شکر۔“

نکٹ چیکر اور دوسرے دونوں کلرکوں نے میری طرف دیکھا۔ نکٹ چیکر نے سخت لہجے میں کہا۔

”دیکھو آرام سے بیٹھے رہو۔ یہ تمہارے ہاپ کا مندر نہیں ہے۔ ریلوے کی حوالات ہے۔ تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

میں نے دوسری بار جے شو شکر کا نعرہ بلند کیا تو بد دماغ نکٹ چیکر نے غصیلی آواز میں کہا۔

”سالے! اب تیری ایسی مرمت کراؤں گا کہ غلی یاد آ جائے گی۔“

میں نے اپنی آواز میں سلوہ سنیا سیوں والا اعلو پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”مورکھا! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں اور جس ناگ کو میں بھیروں جی کے مندر

کی یاترا کرانے لے جا رہا ہوں وہ دیوتا شیو شکر کی دیوتا ہی ہے۔“

نکٹ چیکر اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گیا اور انتہائی غصے میں اس نے سلاخوں میں

ہاتھ ڈال کر مجھے پیچھے دھکیلا اور بولا۔

”میں تم فراڈ لوگوں کے سب چرتر جانتا ہوں۔ ارے میں گولیاری کا براہمن ہوں۔

تمہاری ان مکاری کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ چپکے سے بیٹھ جا۔“

اور وہ بڑبڑاتا ہوا واپس اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچی سمجھی سکیم کے

مطابق جب میں ہاتھ ڈال کر ناگن درگا کو نکل کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بلند آواز

میں کہلا۔

”اے مہاراج! بھو شیو شکر کی دیوداسی درگا دتی یہ سورکھ بھیروں جی کی یاترا سے

روک رہے ہیں۔ ان کو بتا کہ تو کون ہے؟“

اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ناگن درگا کو باہر نکل لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ

وہاں جو باتیں ہوئی ہیں وہ ناگن درگانے باقاعدہ سن لی ہیں اور وہ اس ڈرامے میں اپنا

کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں نے

ناگن درگا کو اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔ ناگن درگانے عورت کی آواز میں کہا۔

”ان سورکھوں کو بتا دو کہ میں شیو جی مہاراج کی دیوداسی درگا ہوں۔ اگر انہوں

نے مجھے بھیروں جی کی یاترا نہ کرنے دی تو میں انہیں ایسا شرمپ دوں گی کہ ان کی

ساری سنتیں اگلے ایک لاکھ ہنسون میں کتوں کی شکل میں پیدا ہوگی۔“

میں نے جو ڈرامہ کھیلا تھا یہ اس کا کلائمیکس تھا۔ میں نے دیکھا کہ نکت چکر اور

دونوں کلرک اپنی سینوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے رنگ اڑ گئے تھے اور

ان کے جسم جیسے تھر تھر کلپ رہے تھے۔ بات ہی ایسی تھی۔ ان کے سامنے ایک

سائپ عورت کی آواز میں بول رہا تھا یہ دیکھ کر تو ایک عام آدمی یہاں تک کہ کوئی

انگریز سائنسدان بھی ایک بار تو ضرور حیران پریشان ہو جاتا اور وہ لوگ تو ہندو تھے اور

آواگون ان کا جنم جنم کا عقیدہ تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ تیر بالکل ٹھیک نشانے پر بیٹھا

ہے تو میں نے نکت چکر سے کہلا۔

”کیا اب بھی تم ہمیں حالات میں قید رکھو گے؟“

نکت چکر نے جلدی سے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”شما کر دیں مہاراج! شما کر دیں۔“

دوسرے ہندو کلرک بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے۔ نکت چکر نے جلدی سے میز

کی دراز میں سے چابی نکلی اور سلاخوں کے پاس آ کر کاپتے ہوئے ہاتھوں سے آٹا کھول

دیا اور لوب سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

”مہاراج! مجھے معاف کر دیں۔ شما کر دیں۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں آپ کا

داس ہوں۔“

میں بڑی شکن سے ناگن درگا کو اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹتے ہوئے حوالات سے باہر

آ گیا۔ نکت چکر نے لپک کر کرسی آگے کر دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ نکت چکر نے

ایک کلرک سے کہلا۔

”بھولا رام جلدی سے مہاراج کے لیے جل پان لے آ۔“

بھولا رام کلرک جلدی سے دروازے کی طرف بڑھل مجھے معلوم تھا کہ یہ ہندو

کلرک باہر جا کر سب کو بتا دے گا کہ اس نے بھگوان شیو کی دیوداسی کے درشن کیے

ہیں۔ وہ ناگ کی شکل میں عورت کی طرح بات کرتی ہے اور وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو

جلے گا جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھولا رام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بھولا رام! خبردار باہر کسی سے نہ کہنا کہ اندر بھگوان شیو کی دیوداسی اور اس کا

لوتار موجود ہیں۔ اگر تم نے کسی سے بات کی تو وہیں جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔“

بھولا رام کلرک نے وہیں ہاتھ جوڑ دئے اور کہلا۔

”ہرگز نہیں کموں گا مہاراج! ہرگز نہیں کموں گا۔“

اور وہ باہر نکل گیا۔ نکت چکر اور دوسرا کلرک میرے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔

میں یہ تلاش بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں کرسی پر بیٹھا ہوں اور ریلوے کا ایک نکت

چکر جو اپنی وردی میں تھا میرے سامنے فرش پر بیٹھا رہے۔ یہ منظر دیکھ کر بھی لوگ

متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں نے نکت چکر اور دوسرے کلرک سے کہلا۔

”زمین سے اٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔“

انہوں نے اس طرح میرا حکم مانا جیسے میرے غلام ہوں۔ فوراً اٹھے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ناگن درگا میری کلائی کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ میں ناگن درگا کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں۔ خدا جانے پھر یہ موقع کب ملے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آگیا کہ اگر میں درگا کو عورت کی شکل میں واپس لے آیا تو کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ پھر یہ لوگ ہو سکتا ہے مجھے جلوگر سمجھنے لگیں اور ڈرا سے کا جو ہندووانہ دیو لٹائی پر اسرار سہل بندھا ہوا ہے وہ نہ بگڑ جائے۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ اب جبکہ میں انسانی شکل میں واپس آ چکا ہوں تو کم از کم دو چار گھنٹے تو ضرور اسی شکل میں رہوں گا۔ یہاں سے دوسری گاڑی میں بھوپال کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور پھر کسی بھی جگہ ناگن درگا کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ ناگن درگا بھی بے چین ہوگی کہ میں جلدی سے اس کا منہ چوم کر اسے انسانی شکل میں واپس لاؤں۔ چنانچہ میں نے اس کو تسلی دینے کی خاطر ذو معنی انداز میں کہا۔

”اے مہادیوی درگا دتی۔ میں جانتا ہوں تو کیا سوچ رہی ہے۔ بڑی جلدی تیری خواہش پوری ہو جائے گی اور تو پھر سے وہی بن جائے گی جو تو پہلے تھی۔“

میری ان باتوں کو وہ لوگ بھی دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی زبان کے پر اسرار اشارے ہی سمجھے اور ادب سے ہاتھ جوڑ کر بیٹھے رہے۔ ناگن درگا نے میری تسلی کی خاطر کہا۔

”مہاراج! جیسی آپ کی اچھیا ہوگی ویسے ہی ہوگا۔ میں تو آپ کی بھی داسی ہوں۔“

دوسری بار اتنے قریب سے ایک سناپ کو عورت کی آواز میں بولتے سن کر دونوں ہندوؤں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”جے شیو شکر! جے شیو شکر۔“

سناپ کی شکل میں آنے کے بعد مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

”بالکل ہمارے بھوجن پانی کے لیے کچھ لایا جائے۔ تاکہ تیرا پیٹ نہ۔“

اسی وقت ہمارے لیے ہو شنگ آبلو کے فرسٹ کلاس ریفرشمنٹ روم سے مرغ بریانی اور کھیر آگئی جسے میں نے خوب سیر ہو کر کھلیا۔ میں نے ان لوگوں پر مزید رعب جمائے کے لیے ناگن درگا سے پوچھا۔

”مہا ناگ کی دیوداسی! کیا تجھے بھی جل پٹن کرنا ہے؟“

مجھے معلوم تھا کہ ناگن درگا چونکہ سناپ کے روپ میں ہے۔ اسے بھوک پیاس اتنی نہیں لگی ہوگی۔ ناگن درگا نے عورت کی آواز میں کہا۔

”نہیں گورو دیو! بھجوعے بھوک نہیں ہے، ہاں پیاس ضرور لگی ہے۔“

تینوں ریلوے کرم چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناگن درگا کو عورت کی آواز میں باتیں کرتے سن رہے تھے۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

”بالکل! دیوداسی درگا میا کے لیے دودھ کا کنورا لایا جائے۔“

اسی وقت پالے میں دودھ آگیا جسے ناگن درگا نے بھی سیر ہو کر پیا۔ اس کے بعد میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

”ہمارے بھوپال جانے کا بندوبست کیا جائے۔“

ٹکٹ چیکر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

”مہاراج! ایک گھنٹے بعد ناگ پور سے مدھیہ پردیش ایکسپریس آرہی ہے۔ آپ کو

میں خود اس میں بٹھائوں گا۔ وہ آپ کو بھوپال پہنچا دے گی۔“

میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

”سنو پچہ! ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تم بڑے بھاگ وان ہو کہ تمہیں مہامیا کے

درشن ہوئے ہیں مگر یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“

پھر میں نے دوسرے کھڑکوں سے بھی مخاطب ہو کر کہا۔

”تم بھی دھیان سے سنو۔ اگر تم میں سے کسی نے کسی دوسرے کو یہ راز بتا دیا تو تمہیں مہاسی کی بد دعا لگے گی اور تمہارا سارا خاندان، مل مرادہ جلا ہو جائے گی۔“
تیوں یک زبان ہو کر بولے۔

”ہرگز نہیں مہاراج! ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔“

انہوں نے میرے لیے چائے بھی ریفرشمنٹ روم سے منگوائی۔ ایک گھنٹے تک وہ میری مثل سیدھا کرتے رہے۔ اس کے بعد بھوپال جانے والی گاڑی آگئی۔ انہوں نے خود مجھے ٹرین کے گارڈ سے کہہ کر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ جب تک ٹرین نہیں چلی تینوں ریلوے کے کرم چاری پلیٹ فارم پر ہاتھ بندھے کھڑے رہے۔ ناگن درگا کو میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ ٹرین ہو مشنگ آبلو سٹیشن سے چلی تو میں نے بھی سکھ کا سنس لیا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد میں نے ناگن درگا کو جیب سے نکالا تو وہ بولی۔

”کرم دادا! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے ایکٹر بھی ہو۔ تمہیں تو بہی کی فلموں میں ہیرو کا کام مل سکتا ہے۔“
میں نے اس سے کہا۔

”درگا! اگر میں یہ ایجنٹ نہ کرتا تو ہم اس وقت جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے۔ یہ اداکاری مجھے کرنی ہی پڑی۔“

ناگن درگا نے بے چینی سے کہا۔

”کرم دادا! اب جلدی سے میرا منہ چوم کر مجھے انسانی شکل میں واپس لے آؤ۔“

میں اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈبے میں کوئی مسافر نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”درگا! خدا کرے کہ میرے منہ چومنے سے تمہاری انسانی شکل واپس آ جائے۔“

ویسے مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

ناگن درگا بولی۔

”تم ہمارے خفیہ منتروں کی طاقت کو نہیں جانتے۔ تم میرا منہ چومو۔“
ناگن سنپ کے روپ میں تھی۔ میرا دل اس کا منہ چومنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے ناگن درگا کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کا منہ اپنے ہونٹوں کے قریب لا کر سب سے پہلے اپنا سنس روکا۔ پھر بڑی ہی بے دلی کے ساتھ اس کے منہ کو چوم لیا۔ مگر ناگن درگا ابھی تک سنپ کے روپ میں تھی۔ میں نے کہا۔
”دیکھا درگا! میں نے کہا تھا میں کہ مجھے شک ہے۔ میرے منہ چومنے پر بھی تم ویسی سنپ کی سنپ ہی رہی ہو۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”مجھے سامنے والی سیٹ پر رکھ دو۔ میں اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔“

میں نے جلدی سے اسے سامنے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے بھوپال کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہل کھلنے لگی تھی۔ کبھی وہ اپنا پھن کھول کر لہراتی، کبھی پھن سکینڈ کر سیٹ کے گدیے پر لوٹ پوٹ ہونے لگتی۔ میں نے پوچھا۔

”درگا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

اس نے بت ہی دھیمی آواز میں کہا۔

”میں ٹھیک ہوں کرم دادا! تم خاموش رہو، خاموش رہو۔“

پھر وہ ایک دم جیسے پر سکون ہو گئی اور سیٹ پر لیٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک سسکار کی آواز نکلی اور دوسرے لمحے سیٹ پر سے سنپ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ درگا عورت کے روپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خمار سا تھا۔ کہنے لگی۔

”کرم دادا! ایک بار پھر میرا منہ چومو۔ تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ وہ بھی پوری ہو

جانے دو۔“

میں نے جھک کر درگا کے ہونٹوں پر آہستہ سے اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ درگا تو مجھ سے وحشیانہ انداز میں لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھڑایا اور کہا۔
”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو درگا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
”پریم کرنا پاگل پن تو نہیں ہے کرم دادا! میں نے تم سے پریم کیا ہے۔ کوئی پاپ نہیں کیا۔ میں ہمیشہ تم سے پریم کرتی رہوں گی۔“

اور وہ اٹھ کر میری سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی اور مجھ سے پریم کرنے لگی۔ میں اس سے پریم نہیں کرنا کرتا تھا اور پریم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ کوئی شیئین آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی اور درگا مجھ سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”درگا! میں اپنی بیوی جیلہ سے پریم کرتا ہوں۔ میں اس کی محبت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“

درگانے میرے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

”میں تمہیں کب کہتی ہوں کہ اپنی بیوی سے پریم نہ کرو۔ تم اپنی بیوی سے ضرور پریم کرو۔ مگر مجھے پریم کرنے سے تو نہ روکو۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں اور ہمیشہ پریم کرتی رہوں گی۔ تم ضرور میرے پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہے ہو۔“
میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے جنم و نم کو بالکل نہیں مانتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے پریم کا اظہار نہ کرو۔ مجھے یہ باتیں کسی دوسری عورت کی زبان سے اچھی نہیں لگتیں۔“
ناگن درگا خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ گاڑی ایک شیئین پر رک گئی۔ وہ مجھ سے ذرا الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔
”تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟ تمہیں ضرور بھوک لگی ہوگی۔“

خلاف توقع درگانے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پجاریوں نے مجھے دودھ پلا دیا تھا اب بالکل بھوک نہیں ہے۔“

میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔

”یہ کونسا شیئین ہے۔ خدا جانے بھوپال ابھی کتنی دور ہے۔“

درگا بھی اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ معمولی سا شیئین تھا۔ کہنے لگی۔

”بھوپال زیادہ دور نہیں ہے۔“

درگا بھی اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ معمولی سا شیئین تھا۔ کہنے لگی۔

”بھوپال زیادہ دور نہیں ہے۔“

بھوپال ہم رات گئے پینچے شیئین سے باہر نکل کر میں نے درگا سے کہا۔

”اب تم ناگن کے روپ میں نہیں ہو، عورت بن چکی ہو۔ میرا خیال ہے تمہارا

اکیلے بھروسہ جی کے مندر میں جانا ٹھیک نہیں۔“

وہ میری طرف عجیب انداز سے دیکھ کر بولی۔

”تو کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”یہ چاہنے یا نہ چاہنے کی بات نہیں ہے۔ صورت حل ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ

تمہارا اتنی رات گئے بھروسہ جی کے مندر میں جانا مناسب نہیں لگتا۔“

”تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

لیکن میں ناگن درگا کو کسی حالت میں بھی بھوپال کے سرفروش مبلدوں کی خفیہ

کیمین جگہ کا راستہ نہیں دکھاتا چاہتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ناگن درگانے

مجھے ابھمن میں جلا دیکھا تو کہنے لگی۔

”تم میری فکر نہ کرو۔ بھروسہ جی کے مندر میں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں۔

میں ان کے پاس رہ لوں گی۔ تم مجھے بھروسہ جی کے مندر میں چھوڑ آؤ۔“

میں نے کہا۔

”اگر وہاں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔“

اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے ایک خلی رکشے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے رکشے والے کو بھروسہ جی کے مندر جانے کو کہا اور رکشا روانہ ہو گیا۔ رات کلنی بھیک چلی تھی۔ بھوپال کے بازار تقریباً ”خلی پڑے“ تھے۔ بھروسہ جی کا مندر شہر کے مشرقی حصے میں واقع تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ نامن درگا نیچے اتری تو میں نے اسے کہا۔

”میں کل رات کو ہی آسکوں گا۔“

وہ بولی۔

”تم چاہے جس وقت آجانا۔ میں تمہیں مندر کے میلا آشرم میں ہی ملوں گی۔“

وہ مندر کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ میں نے رکشے والے کو ایک خاص چوک کی طرف چلنے کو کہا۔ یہ چوک مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ والے نیلے سے کلفی جیسے تھا۔ میں وہاں جا کر اتر گیا۔ میرے پاس اتنے ہی پیسے رہ گئے تھے جتنا رکشے کا کرایہ تھا۔ وہاں سے میں رات کے اندھیرے میں نیلے کی جانب پیدل چل پڑا۔ نیلے پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ میں خفیہ راستے سے ہوتا ہوا کمین گاہ میں آ گیا۔ کمانڈو خالد سو رہا تھا۔ ہمارے ایک مجاہد نے اسے جگا دیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تمہاری انسانی صورت نظر آئی۔ کرم دادا! اس طرح ہمارا مشن کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔ تم اچانک غائب ہو جاتے ہو اور پھر اچانک ظاہر ہو جاتے ہو۔“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”خالد بھائی! لگتا ہے میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ یہ جو مجھ پر انسان سے سنبھ اور سنبھ سے انسان بن جانے کا دورہ پڑتا ہے اس پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے اس عذاب سے نجات دلائے۔“

اس کے بعد ہم نے جھانسی والے آرپی ایمو نیشن ڈپو کی باتیں شروع کر دیں۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

”ہمارا مجاہد اس ایمو نیشن ڈپو کی ایک ایک تفصیل معلوم کر کے لے آیا ہے۔ گولہ بارود کا یہ ڈپو ایک نیلے کے لوہے پر ہے۔ وہاں سیکورٹی بہت سخت ہے۔ پہاڑی کی چاروں جانب ڈھلان پر مشین گنوں کے چار مورچے ہیں۔“

”کیا رات کو سنتری گشت بھی لگاتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

خالد نے کہا۔

”یہ بات میں نے اپنے مجاہد سے خاص طور پر معلوم کی تھی۔ چونکہ کوئی ایمر جنسی والی بات نہیں ہے، اس لیے رات کو یا دن کے وقت وہاں کوئی پٹرول پارٹی گشت نہیں لگاتی۔“

ایمو نیشن ڈپو میں اندر جانے کا گیٹ کس طرف ہے؟“

کمانڈو خالد نے مجھے کالی کے ایک صفحے پر اس کا پورا نقشہ بنا کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

”بھتے میں دو بار میل سے فوجی ٹرکوں میں گولہ بارود اور جدید ترین اسلحہ بھر کر متبوضہ کشمیر میں تعینات بھارتی فوجوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”اس جگہ سولین مزدور بھی ضرور کام کرتے ہوں گے۔ تم صرف یہ معلوم کرو کہ اگر وہاں سولین مزدور بھی کام کرتے ہیں تو وہ کون ہیں اور جھانسی میں کہاں کہاں پر رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ یہ ذخیرہ شہر کے اندر ہے اس لیے روز میل سے اسلحہ وغیرہ ٹرکوں میں لاوا جاتا ہے کم از کم اس روز چار پانچ سولین مزدور فوجیوں کا ہاتھ بنانے ضرور آتے ہوں گے۔“

خالد نے کہا۔

”میں کل ہی معلوم کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ تم اب تو کیس نہیں جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔

پھر خود ہی کہنے لگا۔

”ہو سکتا ہے پولیس کسی مفرور مجرم کی تلاش میں ہو۔“

جو مجاہد یہ خبر لے کر آیا تھا کہنے لگا۔

”سر! مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ کرم داد صاحب کی تجویز مجھے مناسب لگتی

ہے۔ ہمیں کچھ دنوں کے لیے یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جانا چاہیے۔“

مگر کمانڈر خالد نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”ہماری خفیہ جگہ جس مقام پر ہے وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ آج تک کسی کو کلن

کلن اس کی خبر نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھوپال پولیس میں ہمارے دو چار

آدی ایسے موجود ہیں جو ہمیں ہنگامی حالات پیدا ہو جانے کی صورت میں فوراً اطلاع کر

سکتے ہیں۔ اس لیے پریشانی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے ٹھکانے پر جا کر بیٹھ

جاؤ اور نگرانی کرتے ہو۔ اگر حالات زیادہ تشویش ناک نظر آئیں تو ہمیں فوراً خبر کر

دینا۔ پھر ہم یہاں سے پرانے قلعے والی جگہ پر چلے جائیں گے۔“

مجاہد چلا گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

”خالد بھائی! میرا خیال ہے تم نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ میں ابھی بھی یہی

کہوں گا کہ ہم سب کو فوراً یہ جگہ خالی کر کے پرانے قلعے والی کمین گاہ میں چلے جانا

چاہیے۔“

مگر خدا جانے کمانڈر خالد کے دل میں کیا تھا اور وہ کیا سوچ رہا تھا کہ کہنے لگا۔

”کرم داد! پریشانی ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پولیس نے یہاں چھاپہ بھی

مارا تو یقین کرنا ہمیں ہمارے آدی دو گھنٹے پہلے اس کی خبر کر دیں گے۔“

میں نے کہا۔

”میں اس معاملے میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“

وہ ہنس پڑا۔

”بھائی ان باتوں کو ابھی رہنے دو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں اپنے مشن کے لیے اور کس

”اب نہیں جاؤں گا۔ اگر میری کاپی پلٹ بھی ہوگئی تب بھی میں اپنے اس اہم

ترین مشن کو مکمل کیے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔“

کمانڈر خالد نے اسی وقت اپنا ایک آدی شہر کی طرف دوڑا دیا کہ وہ اپنے خاص

سراغریں کو بلا کر لے آئے۔ کیونکہ جھانسی کی طرف ایک گاڑی بھوپال سٹیشن سے منہ

اندھیرے چھوٹی ہے۔ کوئی آدمی گھسنے بعد اپنا سراغریں بھی آگیا۔ خالد نے اسے

خاص ہدایات دے کر سٹیشن کی طرف روانہ کر دیا۔ دوسرے دن شام کے وقت میں اور

خالد کمین گاہ کی کونھڑی میں بیٹھے اپنے مشن کی تفصیلات کا جائزہ لے رہے تھے کہ

ایک مجاہد آگیا۔ وہ سلوہو سنیا سی کے بھیس میں تھا۔ اس کی ڈیوٹی کمین گاہ کے نیلے سے

کچھ فاصلے پر رہ کر نگرانی کرنے کی تھی۔ اس نے آکر بتایا کہ باہر معاملہ کچھ مشکوک نظر

آتا ہے۔

خالد نے پوچھا۔

”کیا بات ہوئی ہے؟“

مجاہد ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”دوپہر کے وقت سے لے کر ایک گھنٹہ پہلے تک پولیس کی ایک جیپ نیلے کے

پیچھے جو سڑک ہے اس کے چار پانچ چکر لگا چکی ہے۔“

”کیا یہ جیپ نیلے کی طرف بھی آئی تھی؟“

”نیلے کی طرف جیپ تو نہیں آئی لیکن دو سپاہی جیپ سے اتر کر نیلے کے قریب

گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”کسی نے مخبری تو نہیں کر دی۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ جگہ کچھ دنوں کے لیے

خالی کر دینا چاہیے۔“

کمانڈر خالد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”مخبری ہو نہیں سکتی۔“

کس چیز کی ضرورت ہوگی۔“
میں نے کہا۔

”سب سے پہلے تو کسی طرح ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ جب ایمونیشن ڈپو سے ٹرکوں میں گولہ بارود لادا جاتا ہے تو کیا اس وقت شہری مزدور بھی فوجیوں کا ہاتھ بناتے ہیں یا نہیں۔ اگر سولین مزدور اس روز وہاں آ جاتے ہیں تو ان مزدوروں کی تعداد کتنی ہے اور وہ شہر میں کھل کھل رہتے ہیں۔“
خلد بولا۔

”یہ ہمیں اسی ہفتے معلوم ہو جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔“
جب شام کا اندھیرا رات کے اندھیرے میں کھل مل گیا اور خلد کی گھڑی نے شام کے سات بجائے تو میں نے اسے کہا کہ میں ناگن کی خیر خیریت معلوم کرنے بھیروں مندر جا رہا ہوں۔ ناگن درگا کے بارے میں میں نے خلد کو سارا قصہ سنا دیا تھا۔ اس نے میرے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔
”اب تو بھابی بی بی میں نہیں ہے۔ درگا بھی سانپ کے روپ میں نہیں ہے اور وہ تم سے پریم بھی کرنے لگی ہے“ اس لیے ذرا محتاط ہو کر رہنا۔“
میں نے ہنس کر کہا۔

”خلد بھائی! میں اتنا کچا اور کمزور نہیں ہوں اور پھر مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔“

خلد بولا۔

”پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ مگر تم کھانا تو کھاتے جاؤ۔ تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔“

خلد نے مجھے دو سو روپے دیئے اور کہا۔

”یہ اپنے پاس رکھو تمہارے کام آئیں گے۔“

میں خفیہ کمین گاہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ اور چاروں طرف سے خبردار رہ کر

باہر نکلا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں ایک طرف ہو کر پتھر کی دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ان درختوں کو دیکھنے لگا جن کے درمیان شہر بھوپال کو جانے والی چھوٹی سی سڑک گزرتی تھی۔ اپنے مجاہد نے اسی سڑک کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں دوپہر کے وقت پولیس کی جیپ دو تین بار آئی تھی۔ مجھے درختوں کی طرف کوئی خاص نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چونکہ مجھے اسی سڑک کو عبور کر کے بھیروں کے مندر جانا تھا اس لیے میں پوری تسلی کر لیتا چاہتا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا اور میں سانپ کے روپ میں بھی نہیں تھا کہ دشمن حملہ کرے تو جھازیوں وغیرہ میں گھس کر چھپ جاؤں۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ راستہ صاف ہے اور محاذ خلی پڑا ہے تو میں اوٹ میں سے نکل کر سڑک کی طرف چل پڑا۔ چھوٹی سی سڑک خلی پڑی تھی۔ میں جلدی سے اسے پار کر کے دوسری طرف کھیتوں میں چلا گیا۔ کھیتوں کھیت چلتا میں بھیروں کے مندر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ بچاری اور بچاریں نظر آئیں۔ میں ان کی نظر بچا کر مندر میں داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹے لڑکے سے میلا آشرم کا پوچھا۔ وہاں مجھے ناگن درگا کو نہ دیکھنے کے پاس بیٹھی مل گئی۔ وہ کوئی کپڑا دھو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

”میری کوٹھڑی میں آ جاؤ۔“

کوٹھڑی میں آ کر اس نے کپڑے کو نچوڑ کر جھاڑا تو وہ اس کا بلاؤز تھا۔ شراباٹے ہوئے بولی۔

”منہ دوسری طرف کر لو۔“

میں نے کہا۔

”ان باتوں کو چھوڑو“ یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا؟“

وہ میرے پاس چارہائی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

”ایک عجیب بات ضرور ہوئی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے تجسس کے لہجے میں پوچھا۔
کنسنے لگی۔

”آج شام میں بھیروں جی کی سورتی کے آگے پوجا پانٹھ کر رہی تھی۔ جب میں نے ہاتھ دیکھا تو مجھے بھیروں جی کے درشن ہو گئے۔“
”کیا مطلب؟“

”بھیروں جی کی شکل میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ بھیروں جی کون ہیں؟ کیا کوئی مرد ہے یا عورت ہے؟“

درگا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم مسلمان ہو کیسے بھیروں جی کی تمہیں

بددعا نہ لگ جائے۔“

میں نے کہا۔

”چھا بتاؤ درشن ہوئے تو پھر کیا ہوا؟ وہ کونسی عجیب بات ہے جو تم مجھے بتانے والی تھیں؟“

درگا نے سانس بھر کر کہا۔

بھروں جی ہمارے دیوتا ہیں۔ شیو جی کے اوتار ہیں اور بڑی غصیلی مزاج والے ہیں۔ مجھے درشن دیئے اور میری طرف اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگے۔ درگا! تم تو ایک مسلمان سے پریم کرنے لگی ہو۔ وہ مسلمان ہماری سورتیوں کو پاش پاش کرنے والے محمود غزنوی کا بھائی بند ہے۔ اس کو چھوڑ دو! میں نے کہا، مہاراج! میں تو اس کو دل سے پریم کرتی ہوں، بھیروں جی غصے میں آ گئے کہنے لگے، اگر تو نے اس مسلمان کو نہ چھوڑا تو میں تمہیں شراب دے دوں گا اور تم ایسی مصیبت میں پھنسی گئی کہ زندگی بھر اس سے چھٹکارا نہیں ملے گا! یہ کہہ کر بھیروں جی غائب ہو گئے۔“

میں درگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا

تھا۔ یہ محض اس کی نفسیات کا کرشمہ تھا۔ چونکہ یہ بات اس کے تحت الشعور میں تھی کہ وہ برہمن زادی ہو کر ایک مسلمان سے محبت کرنے لگی ہے اس کی وجہ سے اس کے مجرمانہ احساس نے یہ سارا کھیل کھیلایا تھا۔ میں نے اسے یہ باتیں بالکل نہ بتائیں۔ ایک طرح سے یہ سب کچھ میرے حق میں جاتا تھا۔ ناگن درگا سے میرا بیچھا چھوٹ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا۔

”درگا! تمہارے بھیروں جی نے تمہیں بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ تم یہاں سے نکلتی ہو اپنے گھڑوں چلی جاؤ اور اگر واقعی تم مجھ سے پریم کرتی ہو تو مجھے بھول جاؤ۔“

ناگن درگا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

”کرم داو! میں سنی ساتری ہوں۔ برہمن کی بیٹی ہوں۔ مجھے تم سے پریم ہے۔ پریم کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ دیوتا لوگ بھی پرلوک میں دیویوں سے پریم کرتے ہیں۔“
میں نے اس کے خطرناک ارادے دیکھے تو کہا۔

”مگر درگا! بھیروں جی نے تمہیں بددعا دے دی تو تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ تمہیں سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے۔ اپنی خاطر نہ سنی، میری خاطر ہی تم اپنا خیال کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔“

میری ہمدردانہ باتیں سن کر ناگن درگا کے چہرے پر ایک رونق سی آ گئی۔ کہنے لگی۔

”اگر تمہیں میرا اتنا خیال ہے تو مجھے پریم کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ میں تمہیں اب اپنا دل کھول کر بتاتی ہوں کہ تم میرے لیے میرے پریمی، میری پتی، دیو، میرے سب کچھ ہو۔ میں تمہاری خاطر، تمہارے پریم کی خاطر اپنی زندگی ایک بار نہیں ہزار بار قربان کر سکتی ہوں۔“

مسلحہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں اسے نکلتی ہوئی پور بھیجنا چاہتا تھا

اور وہ مجھ سے الگ ہونے پر تیار نہیں تھی۔ میں نے ایک اور طریقے سے اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”درگا! تم ایک بار کلکشن پور چلی جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور آکر تمہیں مل جایا کروں گا۔“

تاگن درگانے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کرم داوجی! میں اب تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب میرے ساتھ کیا ہو جائے۔ اب تو دیوتا بھیروں جی بھی میرے خلاف ہو گئے ہیں۔ جب تک جیتی رہوں گی تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں گی۔“

اس وقت معاملے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

”لیکن تم اس مندر میں بھی تو اب نہیں رہ سکتیں۔ اس مندر کا دیوتا تمہارا دشمن بن گیا ہے۔“

درگانے سر کو باغیانہ انداز میں جھٹک کر کہا۔

”بھیروں جی میرے پریم کرنے کی وجہ سے میرے دشمن ہو گئے ہیں تو میں شیوجی مہاراج کے آگے فریاد کروں گی۔ شیوجی بھی تو اپنی جتنی پاروتی سے بہت پریم کرتے ہیں۔ وہ ضرور میری مدد کریں گے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم یہاں رہ سکتی ہو تو بے شک یہیں رہ جاؤ۔ میں بھی اسی شہر بھوپال میں ہوں۔ جب تک یہاں ہوں تمہیں دوسرے تیسرے روز آکر مل جایا کروں گا۔ یہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔“

تاگن درگانے کہا۔

”تم مجھے اپنے پاس کیوں نہیں لے جاتے؟ میں بھیروں جی سے دور ہو جانا چاہتی ہوں۔ یہاں رہی تو میں ان کی بد دعا سے نہیں بچ سکوں گی۔“

یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے درگا سے بھی یہی کہا کہ میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا کیونکہ خود میں کسی اور کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

درگانے کچھ سوچ کر کہا۔

”ایک جگہ ہے جہاں ہم دونوں دشمن دیوتا کی نظروں سے بچ کر رہ سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”تم دیوتا کی نظروں سے تو دور ہو جاؤ گی لیکن اس کی بد دعا سے کیسے بچ سکو گی؟ تم خود کہا کرتی ہو کہ دیوتا لوگ جس کو بد دعا دے دیں پھر اس کو کوئی نہیں بچا سکتا۔“

تاگن درگانے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”ایک جگہ ہے جہاں دیوتاؤں کی بد دعاؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔“

”وہ کون سی ایسی جگہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

تاگن درگانے بڑی دلیری کے ساتھ میرا منہ چوم لیا اور ہنس کر بولی۔

”یہ میں تمہیں کل بتاؤں گی، کل شام کو مجھ سے ملنے آؤ گے نا؟“

میں نے کہا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ ناراضگی سے بولی۔ ”تمہیں یہاں ایسے کون سے کام کرنے ہیں۔ تم اکیلے ہی تو ہو، تمہاری جتنی بھی پاکستان چلی گئی ہے۔ پھر تم کیوں نہیں کل مجھ سے ملنے آؤ گے؟“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”اچھا میں کوشش کروں گا۔“

میں جانے لگا تو تاگن درگا مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔

”وعدہ کرو کہ تم کل ضرور آؤ گے۔“

میں نے کہا۔

”وعدہ کرتا ہوں۔“

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے پکڑ کر زبردستی بٹھالیا۔ کہنے لگی۔

”اب میرے ساتھ کھانا کھا کر جاؤ، میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔“

میں نے اسے بت کھا کہ مجھے بھوک نہیں ہے مگر وہ نہ مانی اور مجھے کوٹھڑی میں بٹھا کر کھانا لینے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ انھ کر چلا جاؤں اور بھوپال شہر کے کسی مسلم ہوٹل میں بیٹھ کر برائی کھاؤں۔ میرے پاس پیسے بھی تھے پھر یہ سوچ کر بیضا رہا کہ درگھا کھانا لے کر آئے گی میں نہ ہوا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ کھانا لے کر آگئی۔ مندر کے بھنڈار کا کھانا تھا۔ چاول، بھاتی، دی اور ساتھ چھ سات لٹو پیڑے تھے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ بھارت میں لوگ مٹھائیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران درگھا مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی۔

”کرم دادا! میرا اس سنسار میں اب تمہارے سوا اور کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ اگر تم بھی مجھے چھوڑ گئے تو میں مر جاؤں گی۔ دیوتا بھروں ویسے بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنے ساتھ رکھو گے۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو گے تو دیوتا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“

وہ اسی طرح باتیں کرتی رہی اور میں موقع کی مناسبت کے مطابق ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ پھر میں کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ خفیہ کمین گلہ کی طرف جاتے ہوئے سارا راستہ درگا کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ میرے چھوڑ دینے سے کہیں بچ بچ یہ عورت کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کر بیٹھے گی۔ ناگن درگا کے مزاج کو میں کافی سمجھنے لگا تھا۔ وہ بڑی جذباتی اور انتہا پسند عورت تھی۔ لیکن مجھے اس سے کوئی محبت وغیرہ نہیں تھی، ویسے دوستی تھی اور یہ دوستی میں کسی وقت بھی ختم رک سکتا تھا۔ اب جبکہ ایک بت اہم مشن میرے سامنے تھا تو میں قدرتی طور پر اپنے ذہن سے درگا کو نکل چکا تھا۔

میں خفیہ کمین گلہ والے نیلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میل کافی اندھیرا تھا۔ جب

میں درختوں والی چھوٹی سڑک کو پار کر کے دوسری طرف ویران میدان کی طرف بڑھا تو اچانک ایک طرف سے ایک انسانی سایہ میری طرف بڑھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کرم دادا! ہمیں رک چلو۔“

میں رک گیا۔ سایہ قریب آ گیا۔ یہ ہمارا وہی مجاہد تھا جو سادھو کے بھیس میں خفیہ کمین گلہ کی نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ وہ مجھے کھینچ کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں لے گیا اور کہنے لگا۔

”تخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پولیس کو کمین گلہ کی خبر ہو گئی تھی۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد اپنے ایک آدمی نے مجھے آکر اطلاع دی کہ پولیس کی پوری گارد مسلح ہو کر چھاپہ مارنے آرہی ہے۔ اگر میں عین اس وقت بھاگتا ہوا جا کر کلنڈر خلد کو خبر نہ کرتا تو ان میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ پولیس کے دو ٹرک آئے تھے۔ پولیس آتے ہی کمین گلہ میں گھس گئی اور مشین گنوں کی فائرنگ شروع کر دی۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا ہمارے ساتھی فرار ہو چکے تھے؟“

”جی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں نے عین وقت پر انہیں خبردار کر دیا اور تمام مجاہد اپنا تمام ضروری سامان اور کلنڈرات اور اسلحہ وغیرہ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کو خالی کمین گلہ ملی ہوگی۔ میں صرف تمہارے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ میں نے تمہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کلنڈر خلد نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر پرانے قلعے والی کمین گلہ میں آ جاؤں۔“

میں نے اندھیرے میں چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس ناکام چھاپے کے بعد وہاں اپنے خفیہ آدمی ضرور چھوڑ گئی ہوگی۔ میں نے مجاہد سے کہا۔

”تم نے اس طرف کسی آدمی کو تو آتے جاتے نہیں دیکھا؟“

”ابھی تک تو مجھے صرف تم ہی نظر آئے ہو۔“

میں نے اسے کہا۔

”یہاں سے جلدی نکل چلو۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ پرانا قلعہ کس طرف

ہے؟“

”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

مجاہد مجھے لے کر اس طرف چل پڑا جدھر بھیڑوں جی کا مندر تھا۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں رات کے اندھیرے میں پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ہم بھڑوں جی کے مندر کو بائیں ہاتھ کافی فاصلے پر چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ آگے کا علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ شرکی روشنیاں ہمارے دائیں جانب بست دور دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے مجاہد سے کہا۔

”اگر دور جانا ہے تو کوئی ٹیکسی رکشا کہیں سے لے لیتے ہیں۔ یہ خطرے کا علاقہ ہے یہاں پیدل چلنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

مجاہد نے کہا۔

”یہاں کوئی رکشا ٹیکسی نہیں ملے گی۔ چلتے چلو۔ پرانا قلعہ زیادہ دور نہیں ہے۔“

اور ہم اندھیرے میں چلتے گئے۔



آگے ریلوے لائن آگئی۔

پھر ایک چھوٹی ندی کے پل پر سے گزرے۔ اس کے آگے ویران علاقہ شروع ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دور سے اندھیرے میں کسی عمارت کا سیاہ ہیولا نظر آئے لگا۔ مجاہد نے کہا۔

”وہ پرانا قلعہ ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا یہ قلعہ آثار قدیمہ کے محکمے والوں کے پاس نہیں ہے؟“

مجاہد نے کہا۔

”یہ قلعہ کنڈر بن چکا ہے۔ اب اسے محکمے والے لے کر کیا کریں گے۔ اس کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اس میں کسی سمارانی کا بھوت رہتا ہے۔ لوگ تو اس طرف آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے یہاں اپنا ایک خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔“

قلعے کے آس پاس کا ماحول بھی بڑا آسپا تھا۔ عجیب ڈراؤنے درخت تھے جن کی شاخیں اس طرح زمین پر جھکی ہوئی تھیں جیسے کسی کو اپنے ٹہنچے میں لینے کے لیے جھکی ہوئی ہوں۔ انہیں دیکھ کر آدم خور درختوں کا خیال آتا تھا۔ قلعے کی دیوار آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اندھیرے میں کسی عفریت کی طرح کھڑی تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جھانپاں سوکھی ہوئی تھیں۔ مجاہد میرے آگے آگے تھا۔

ایک جگہ کھائی تھی، ہم اس میں اتر گئے۔ کھائی میں درختوں کی خشک شاخیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پر کھائی کی دیوار کو خود رو جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مجاہد ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔

جھاڑیوں کے اندر غار کا دہانہ تھا۔ یہاں مجاہد نے جیب سے ہاتھ نکال کر جلائی تو اس کی روشنی میں مجھے ایک غار دکھائی دیا جس کی چھت سے جالے ٹنک رہے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم ایک سیڑھی اتر کر نیچے ایک کشادہ دالان میں پہنچ گئے۔ یہاں اپنے دو مجاہد پرے پر موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا اور بتایا کہ کمانڈو خالد دوسرے دالان کے حجرے میں ہے۔ ہم اس حجرے میں آ گئے۔ کمانڈو مجاہد لائسنس کی روشنی میں درزی کے فرش پر بیٹھا کاپی پر بنا ہوا مختصر سا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”تمہارا خدشہ درست تھا کرم داد! اگر ہمیں بروقت اطلاع نہ مل جاتی تو ہم سب ایک بار تو گرفتار ہو گئے تھے۔“

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ پولیس یونٹی نیلے کے قریب چکر نہیں لگا رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ بچ گئے۔“

خالد نے درگا کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے کہا۔

”وہ بھروسوں کے مندر میں ہی رہ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کچھ روز بعد اپنے گاؤں لکشمی پور چلی جاؤں گی۔“

پھر میں نے اس سے جھانسی ایمونیشن سپلائی سنٹر کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

”اپنا جاسوس کل یا پرسوں آکر بتائے گا کہ وہاں ایمونیشن سپلائی کی کیا صورت مل ہے۔“

پھر اس نے نقشہ والی کاپی بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور کھانے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔

”کھانا مجھے درگا نے ہی کھلا دیا تھا۔“

وہ ہنسنے لگا۔

”مندرجہ کے پیاریوں کا پرشلو کھا کر آرہے ہو۔“

میں نے کہا۔

”خالد بھائی! درگا نے بہت اصرار کیا تھا۔ رک گیا ورنہ میں تو شر کے کسی مسلمان ہوٹل سے مرغ برانی کھانا چاہتا تھا۔“

اتنے میں چائے آگئی اور ہم چائے پینے لگے۔

دوسرے روز جموں کشمیر سے اپنے آدمی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ میری بیوی جمیلہ کو پاکستان میں اس کے مہ باب کے حوالے کر کے واپس آ رہے ہیں۔ میں نے ان سے جمیلہ کے مہ باب کی خیریت وغیرہ معلوم کی۔ یہ بھی پوچھا کہ جمیلہ بی بی تو اپنے مہ باب سے مل کر بڑی خوش ہوئی ہوگی۔

مجاہد کہنے لگا۔

”سر! وہ سب آپ کا بہت پوچھ رہے تھے۔ آپ کے بارے میں سب بڑے پریشان تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ بالکل محفوظ ہیں اور بڑی جلد واپس پاکستان آ جائیں گے۔ بھلی نے آتی دفعہ آپ کے نام ایک پیغام دیا تھا۔“

”جلدی بتاؤ بھائی۔“ میں نے بے تاب سے کہا۔

مجاہد کہنے لگا۔

”سر! بھائی صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اپنا خیال رکھیں اور کبھی بیمار ہوں تو گھر سے باہر نہ نکلیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی بزرگ کے مزار پر جا کر آپ کے لیے دعا بھی مانگیں گی۔“

مجھ پر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

تیسرے روز ہمارا جھانسی والا مجاہد بھی آگیا جو فقیر کے بھیس میں سرانفرسانی کے خاص مشن پر گیا تھا۔ میں اور خالد اسے لے کر حجرے میں بیٹھ گئے۔ وہ کہنے لگا۔

”سر! جھانسی کے آرمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے ہفتے میں دو بار ٹرکوں پر گولہ بارود اور جدید ترین اسلحہ لوڈ کر کے مقبوضہ کشمیر روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ چھ ٹرک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ سیکورٹی کے چار آرمڈ ٹرک آگے پیچھے اور درمیان میں ہوتے ہیں۔ چاندھر سے آگے ایک ہیلی کاپٹر بھی ان فوجی ٹرکوں کی حفاظت کے لیے اوپر آ جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ بتاؤ کہ کیا ایمونیشن صرف فوجی یونٹ کے جوان ہی لوڈ کرتے ہیں یا ان میں سولین مزدور بھی ہوتے ہیں؟“

وہ بولا۔

”سر! میں یہی بتانے والا تھا۔ میری معلومات کے مطابق شر سے چھ سولین مزدور سپلائی سنٹر پر اس روز جاتے ہیں اور وہ اسلحہ ٹرکوں میں لوڈ کرانے میں فوجی جوانوں کی مدد کرتے ہیں۔“

خالد نے پوچھا۔

”کیا یہ سولین مزدور ہندو ہیں یا مسلمان؟“

سراغرساں مجاہد نے کہا۔

”ان میں چار ہندو ہیں، دو مسلمان ہیں۔ ان دونوں مسلمانوں کے بارے میں بھی میں نے سارا پتہ کر لیا ہے۔ میں ان کے مکان بھی دیکھ آیا ہوں۔ وہ جھانسی شہر کے ایک گنجلان محلے میں رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام فیروز شاہ ہے۔ دوسرے کا نام عبد الجبار ہے۔ دونوں جوان ہیں اور دو تین سال سے فوجی چھاؤنی میں کام کر رہے ہیں۔“

کمانڈر خالد نے میری طرف دیکھا۔

”کرم داد! کیا خیال ہے تمہارا؟“

میں نے کہا۔

”کمانڈر ہمیں جھانسی جانا ہوگا۔“

خالد نے اپنے سراغرساں مجاہد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا جھانسی میں کوئی ایسی خفیہ جگہ ہے جہاں ہمارا کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ ہمیں کم از کم وہیں دس پندرہ دن تک قیام کرنا پڑے گا۔“

سراغرساں مجاہد غور کرنے لگا پھر بولا۔

”سر! فکر نہ کریں۔ یہ انتظام بھی ہو جائے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ کس روز جھانسی جانا پسند کریں گے۔ مجھے کم از کم ایک روز پہلے معلوم ہو جانا چاہیے۔“

خالد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”میری طرف سے کل ہی چلے چلیں۔“

سراغرساں مجاہد بولا۔

”سر! آپ پر سوں رات کو چلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح مجھے وہیں جا کر ضروری انتظام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اگر آپ پر سوں ضرور روانہ ہوں گے تو میں آج رات جھانسی کی گاڑی پکڑ لوں گا اور کل یا پھر پر سوں صبح صبح آپ کے پاس واپس پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”نھیک ہے دوست! تم آج رات دوبارہ جھانسی کی طرف روانہ ہو جاؤ اور جو انتظام تم کر سکتے ہو کر کے واپس آ جاؤ۔ تمہارے واپس آنے کے بعد ہم اپنے مشن کا آغاز کر دیں گے۔“

سراغرساں مجاہد کمانڈر خالد سے اجازت لے کر حجرت سے نکل گیا۔ جھانسی میں بھوپال کے مجاہدوں کی ابھی کوئی باقاعدہ خفیہ تنظیم نہیں تھی۔ کچھ نوجوان تیار ضرور کر لیے گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے سراغرساں نے ایسے ہی ایک نوجوان کے مکان پر ہماری خفیہ رہائش کا اہتمام کیا تھا۔ دو دن بعد ہمیں رات کی گاڑی سے جھانسی روانہ ہونا تھا۔ میں ابھی تک ناگن درگا کے ہاں بھیروں جی مندر نہیں گیا تھا۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی

میں کانڈو خالد کو بتا کر ناگن درگا سے ملنے چل دیا۔ بھیدوں کے مندر میں پوچھا پٹھ ہو رہی تھی۔ میں مندر کے احاطے میں ٹھٹھا ہوا اس کو ٹھڑی کی طرف گیا، جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ تلا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تھوڑا چونکا دیا وہ یہ تھی کہ کوٹھڑی میں سانپ کی خاص بو تھی۔ سانپ کی یہ بو بڑی تیز تھی۔ اس خاص بو کو یا تو کوئی سانپ محسوس کر سکتا تھا یا میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔

میں نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی جلائی۔ طاق میں سوم بتی رکھی تھی، میں نے اسے روشن کر دیا۔ دروازے کو بند کر دیا تھا۔ اب میں بڑے غور سے کوٹھڑی کا جائزہ لینے لگا۔ سانپ کی بو ایک کونے سے آرہی تھی۔ میں نے کونے میں جھک کر دیکھا، وہاں ایک کپڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ ناگن درگا کا بلاؤز تھا۔ میں نے اسے سونگھا۔ سانپ کی تیز بو اسی بلاؤز میں سے آرہی تھی۔ میرا ماتھا ٹٹکا۔ ضرور ناگن درگا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ بست ٹیکن تھا کہ بھیدوں دیوتا کی بد دعا نے اسے پھر سے سانپ میں تبدیل کر دیا ہو۔ میں نے بلاؤز کو دھیں رکھ دیا اور سوم بتی بجھا کر کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ باہر ننگے کے پاس ایک ساہو کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں کوٹھڑی سے نکلا، اس نے کہا۔

”تو جس کی تلاش میں آیا ہے وہ اب تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ تو مسلمان ہے۔ اس مندر میں کسی مسلمان کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھگتی دھرم کا ساہو ہوں۔ میری جگہ کوئی ورن آشرم کا برہمن ساہو ہوتا تو وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ جا۔“

میں نے ساہو کا شکریہ ادا کیا اور اس سے صرف اتنا پوچھا۔

”مہاراج! کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس کی مجھے تلاش ہے وہ کہاں ہوگی؟“

ساہو نے بازو بلند کیا اور کہا۔

”سورکھ ہو۔ تمہیں جان کی پروا نہیں ہے تو جا پھر جو چاہے کر۔“

اتنا کہہ کر ساہو چلا گیا۔

میں نے سوچا کہ حالات ٹھیک نہیں لگتے۔ بہتر یہی ہے کہ میں جتنی جلدی نکل سکوں اس مندر سے نکل جاؤں۔ میں نے کوٹھڑی کی طرف پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا مندر سے باہر نکل گیا۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ ناگن درگا بے چاری کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ خدا جانے وہ کہاں اور کس حل میں ہوگی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگی سانپ ہی کے روپ میں ہوگی۔ میں دوسرے راستے سے مندر آیا تھا۔ واپس بھی اسی راستے سے پرانے قلعے کی کمین گاہ میں آ گیا۔ کانڈو خالد جھانسی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے مجھ سے درگا کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا اور کہنے لگا۔

”اس وقت تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن خیر تم آ گئے ہو یہ خوشی کی بات ہے۔ تمہاری ناگن کس حل میں ہے؟“

میں نے کہا۔

”وہ مندر میں نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کلکشن پور واپس چلی گئی ہے۔“

کانڈو خالد نے اپنے آئوٹنگ پستول کی ٹال پر سلیشر چڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی اچھا ہوا ہے۔ تمہارا پستول اس تھیلے میں رکھا ہے۔ چیک کر لو۔ ہم ایک کھنڈے بعد یہاں سے نکل رہے ہیں۔“

میں نے تھیلے میں سے پستول نکال کر اس کے میگزین کو چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

”کانڈو! یہاں سے ہمارے ساتھ کوئی اور مجاہد بھی جھانسی جائے گا؟“

اس نے کہا۔

”نہیں، صرف ہم دونوں ہی جائیں گے۔ ضرورت پڑی تو جھانسی سے ہمیں مجاہد

مل جائیں گے۔“

چونکہ ہماری پرانی کمین گاہ پر چھاپہ پڑنے کے بعد بھوپال کی پولیس ہماری تلاش

میں تھی، اس لیے ہم پرانے قلعے میں سے الگ الگ ہو کر نکلے۔ کمانڈر خالد اکیلا ہی نشیون کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارا سراغرس جس کے ساتھ ہمیں جہانسی جانا تھا وہ پہلے نکل چکا تھا۔ وہ فقیرانہ بھیس میں تھا۔ ہم نے معمول کے مطابق کپڑے پن رکھے تھے۔ یعنی ٹھنڈی جیکٹ اور پتلون، میں کمانڈر خالد کے نکلنے کے دو منٹ بعد نکلا۔ ہمیں بھوپال ریلوے سٹیشن کے تھرو کلاس کے مسافر خانے میں ملنا تھا۔

جہانسی جانے والی ٹرین کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جس وقت ہم مسافر خانے میں اکٹھے ہوئے اس کے آدھ گھنٹے بعد بمبئی کی جانب سے ٹرین نے آنا تھا۔ یہ ٹرین دلی جا رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ ہم تھرو کلاس کے مسافر خانے میں ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر بیٹھے رہے۔ سراغرس مجاہد ہمارے لیے تھرو کلاس کے جہانسی تک کے تین ٹکٹ لے آیا تھا۔ جس وقت ٹرین سٹیشن میں داخل ہوئی تو ہم اس کے پانچ سات منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچے۔ ٹرین بھوپال سٹیشن پر دس بارہ منٹ ضرور رکتی تھی۔ ٹرین میں بھی ہم الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوئے ابھی تک سب ٹھیک تھا۔ سٹیشن پر پولیس ضرور تھی مگر ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ٹرین چل پڑی تو مجھے اطمینان ہوا۔ ٹرین آدھی رات کے بعد جہانسی پہنچی۔ وہاں بھی ہم تہہ شدہ پروگرام کے مطابق تھرو کلاس کے مسافر خانے میں ہی اکٹھے ہوئے۔ ہمارا سراغرس مجاہد اب ہمارا گائیڈ تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہماری منزل جہانسی میں مقسم ہماری اسلامی تنظیم کے ایک جانباز کا مکان تھا۔ اس جانباز کا نام اور اس کے گھر کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ اس جانباز کا فرض نام ہاشم رکھ لیتے ہیں۔ ہاشم کا مکان شرکی منجلیں آبادی سے باہر ایک پرانی ہستی میں تھا۔ یہاں ہم پر کسی کو شک شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی رات ہم نے سو کر بسر کی۔ اگلے دن ہم سب ناشتہ کر کے مکان کے چوبارے میں بیٹھ گئے۔ ہاشم کو سراغرس مجاہد نے ہمارے مشن کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ کمانڈر

خالد نے ہاشم سے پوچھا۔

”جو دو مسلمان سولین آدمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے اسلحہ وغیرہ فوجی ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہیں۔ ان میں سے تمہارے خیال میں قتل اہل آدمی کون ہے؟“

ہاشم نے جیسے پہلے ہی سے ان میں سے ایک آدمی کا انتخاب کر رکھا تھا۔ بے لگا۔

”ان میں فیروز شاہ بھروسے کا آدمی ہے۔ وہ ہماری مدد کے لیے فوراً تیار ہو جائے گا۔“

میں نے اپنے پلان کے مطابق ہاشم سے پوچھا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق چھ سولین مزدور ٹرکوں میں اسلحہ لوڈ کرتے ہیں۔ جن میں سے چار ہندو ہیں، دو مسلمان ہیں۔ کیا ان لوگوں کو سپلائی سینٹر کے یونٹ کمانڈر کی طرف سے کوئی شناختی کارڈ بھی ایشوع کیے گئے ہیں؟“

ہاشم کی بجائے ہمارے سراغرس جاسوس نے جواب میں کہا۔

”ان چھ سولین لوڈروں کو کوئی شناختی کارڈ ایشوع نہیں کیا گیا۔ جس روز فوجی ٹرک آتے ہیں یہ وقت پر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ٹرکوں میں ایمونیشن کے بکس وغیرہ لوڈ کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ صرف اسلحہ سپلائی سینٹر کے داخلہ گیٹ پر ان کی آتے جاتے وقت معمولی سی چیکنگ ہوتی ہے۔“

کمانڈر خالد نے مجھ سے کہا۔

”مکرم دادا! ایک بہت بڑی رکلوٹ ہمارے راستے سے خود بخود ہٹ گئی ہے۔ شناختی کارڈ کا معاملہ ہمیں پریشان بھی اور مشکل میں بھی پھنسا سکتا تھا۔“

اس کے بعد کمانڈر خالد نے ہاشم کو اپنے قریب بٹھالیا اور اسے کہا۔

”ہاشم بھائی! بات یہ ہے کہ تمہیں فیروز شاہ لوڈر کو آج رات اس مکان پر لانا ہے۔ لیکن ایک بار پھر غور کر کے بتاؤ کہ کیا اس آدمی فیروز شاہ پر ہم پورا بھروسہ کر سکتے ہیں؟ کیونکہ فیروز شاہ نے ہمارے مشن میں بڑا اہم رول ادا کرنا ہے۔“

ہاشم کہنے لگا۔

"فیروز شاہ کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری تنظیم کا بھرپور ہے اور سرفروش مجاہد ہے۔ وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ میں اسے رات کو یہاں لے آؤں گا۔ میں ابھی اس سے جا کر ملتا ہوں۔ اس وقت وہ اپنی دکان پر ہی ہوگا۔ شہر میں اس کی بیکری کی دکان ہے۔ ویسے وہ پملوان ٹائپ آدمی ہے اور فوجی سپلائی سینٹر کے ٹرکوں کی لوڈنگ سے جو مزدوری ملتی ہے اس کے وہ بلاوام خرید کر گھر ڈال لیتا ہے۔"

کمانڈر خالد میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"ہم اسے فیروز پملوان کہہ کر پکاریں گے۔"

ہاشم فیروز شاہ کی دکان کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد کمانڈر خالد نے سراغریں جاسوس سے کہا۔

"دوست! اب تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"میں حاضر ہوں کمانڈر۔"

کمانڈر خالد نے کہا۔

"ہم جھانسی کے اس ایمونیشن سپلائی سینٹر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

سراغریں مجاہد ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"یہ کام آپ کس وقت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"دن کی روشنی میں ہی ہونا چاہیے۔ رات کے وقت تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔"

سراغریں جاسوس نے کہا۔

"سپلائی سینٹر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ہے۔ اس طرف جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ آپ جوگی ساموزن کا بھی بدل کر بھی گئے تو فوجی گارڈ آپ کو ٹیلے پر

جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ سوئیں کپڑوں میں بھی دن کے وقت لوہر نہیں جاسکیں گے۔"

میں نے سراغریں مجاہد سے پوچھا۔ "کیا ٹیلے کے آس پاس کوئی اونچی جگہ ہے؟" اس نے کہا۔

"اس کی بائیں جانب ایک پرانے مینار کا کھنڈر ہے۔"

"مینار کے اوپر جانے کی میڑھیاں ضرور ہوں گی؟" میں نے پوچھا۔

"سراغریں نے جواب دیا۔

"ہیں مگر بہت بوسیدہ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیں کوئی دور بین لاکر دے سکتے ہو؟"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔" سراغریں نے اطمینان دلایا۔

میں نے کمانڈر خالد سے کہا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مینار کے کھنڈر پر سے دور بین سے سپلائی سینٹر کا جائزہ لیں۔"

وہ کہنے لگا۔

"یہ کام ہمیں آج ہی کرنا ہوگا اور شام کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کرنا ہوگا۔"

سراغریں جاسوس بولا۔

"دور بین کا انتظام ہاشم کر دے گا۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"ابھی جاؤ۔" میں نے اسے کہا۔

سراغریں مجاہد کے جانے کے بعد ہم اپنے مشن کے پلان پر مزید غور کرنے لگے۔

نصف گھنٹے بعد سراغریں مجاہد واپس آ گیا۔ اب وہ فقیرانہ لباس میں نہیں تھا۔ اس نے ہمیں دور بین لاکر دی۔ یہ کوئی اعلیٰ کوالٹی کی دور بین نہیں تھی۔ مگر اس سے ہمارا کام

چل سکتا تھا۔ ہم نے سراغریں مجاہد کو ساتھ لیا۔ مکان کو تھما لگایا اور پرانے مینار کی طرف چل پڑے۔ سراغریں مجاہد اپنے ساتھی ہاشم کو اس کی دکان پر کھد آیا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد مکان پر آئے۔

جہانسی شہر بھارت کے بڑے پرانے اور گنجان آبادی میں سے ہے۔ یہاں جہانسی کی رانی کا قلعہ، محل اور باغات بھی ہیں۔ شہر و دواؤں کی چار دیواری کے اندر بھی ہے اور باہر بھی اس کی کلاویں آباد ہو گئی ہیں۔ شہر کی عمارتیں پرانی حویلیوں کی طرح ہیں۔ ہم شہر کی چار دیواری سے دور رہ کر ایک پرانے بلغ میں ایک تاریخی تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک غیر آباد جگہ پر آ گئے۔ سامنے بائیں جانب ایک چھوٹا سا ٹیلہ نظر آیا۔ سراغریں نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس ٹیلے پر آری سپلائی سینٹر ہے۔"

ہم پرے پرے رہ کر چلتے ہوئے ٹیلے سے کوئی چھ سات سو گز کی دوری سے گزر گئے۔ ٹیلہ ایک نیبے کی طرح تھا جس کے اوپر دو چار درخت نظر آ رہے تھے۔ جس طرف اس کا داخلہ گیٹ تھا اس طرف کچھ فاصلے پر مینار کا کھنڈر تھا۔ ہم اوپر سے ہو کر مینار کے عقب میں آئے۔ مینار کے اوپر جانے کی سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ سراغریں مجاہد کو ہم نے نیچے ایک طرف ہجراتی کرنے کے لیے روک دیا اور خود سیڑھیاں چڑھتے کسی نہ کسی طرح مینار کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ میں نے دور میں لگا کر ایمنیشن سپلائی سینٹر پر نگاہ ڈالی۔

ایمنیشن ڈپو بہت بڑے گودام کی طرح تھا۔ چھت ڈھلواں تھی۔ دیواریں اونچی اونچی تھیں۔ ارد گرد کافی کھلی جگہ تھی جس کی ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ دو سنتری ڈپو کے دروازے پر سپرہ دے رہے تھے۔ کونے میں فوجی بارک تھی جس کے آگے گول دائرے میں پھولدار پودے تھے اور ان کے درمیان رجسٹر کے نشان کا جھنڈا بانس پر لہا رہا تھا۔ دو چار فوجی بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ایمنیشن ڈپو کے ارد گرد خاردار تاروں والی دیوار نہیں تھی بلکہ ایک مرد

اونچی پتھروں کی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ میں نے یہ ساری تفصیل خالد کو زبانی بتاتے ہوئے دور میں اس کے حوالے کی اور کہا۔

"چار دیواری کو خاص طور پر دیکھو۔ مجھے تو وہاں کانٹے دار تار دکھائی نہیں دی۔"

لکھنؤ خالد دور میں لگائے ویر تک سپلائی سینٹر کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"چار دیواری پتھروں کی ہے۔ حیرانی ہے کہ یہاں خاردار تار نہیں لگائی گئی لیکن سیکورٹی کا انتظام کافی ہے۔ اس طرف مجھے دو مشین گن پوشیں نظر آ رہی ہیں۔ ضرور ایسی ہی دو پوشیں ٹیلے کی دوسری جانب بھی ہوں گی۔"

اس نے دور میں مجھے دے دی۔ میں مشین گن پوشیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ دور میں لگا کر غور سے دیکھا تو سپلائی سینٹر کی دیوار کے قریب ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنے ہوئے تھے جن پر جھاڑیاں کٹ کر ڈال دی گئی تھیں۔ ان میں سے مشین گنوں کی ٹائیاں دور میں میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ دو مشین گن پوشیں ہیں۔ گارڈ سنتری صرف دو ہی ہیں۔ مگر ذرا آگے گیٹ کے اندر دونوں جانب اونچے چبوترے ہیں جن میں مجھے چوکور سوراخ نظر آ رہے ہیں۔ تم بھی دیکھو۔"

میں نے دور میں خالد کو دی۔ اس نے دور میں آنکھوں سے لگائی۔ کہنے لگا۔

"یہ دونوں بھی مشین گنوں کے مورچے ہیں کرم داد۔"

میں نے بھی دور میں لگا کر ان مورچوں کو پھر سے دیکھا اور دور میں آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ایمنیشن ڈپو میں یقینی طور پر انتہائی اہم اور جدید ترین فوجی اسلحہ موجود ہے۔ ورنہ اس قسم کے شہروں کے قریب بنے ہوئے ایمنیشن سینٹروں میں سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہوا کرتی اور شہر کے قریب اس ایمنیشن ڈپو کو بھی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ لوگ یہی سمجھیں کہ یہاں عام قسم کا اسلحہ وغیرہ رکھا گیا ہے۔ کسی کو ذرا سا شک بھی نہ پڑ سکے کہ یہاں جدید ترین فوجی اسلحہ

کا ذخیرہ جمع ہے۔"

کمانڈو خالد نے دور بین لگا کر ایک بار پھر ٹارگٹ کا جائزہ لیا۔

کنسنے لگا۔ "ہمیں اپنے پلان میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ ہم آنومک ہسپتال یا کمانڈو چاقو چمپا کر ساتھ لے جانے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

میں غور کرنے لگا۔ خالد دور بین آنکھوں سے ہٹا کر مینار کی منڈیر کے نیچے ہو گیا۔ ہم دونوں سروں کو نیچے کیے باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ ہم اگر چاہیں کہ بارود لگا کر یا ٹائم بموں کے مین دبا کر وہاں سے فرار ہو جائیں گے تو ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔ ہمیں نارمل طریقے سے سپلائی سینٹر کے اندر جانا ہو گا اور نارمل طریقے سے ہی وہاں سے باہر نکلنا پڑے گا۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"یعنی ہمیں اس سکیم پر عمل کرنا ہو گا جو ہم نے سب سے پہلے سوچی تھی۔"

"بالکل وہی پلان ہمیں اس مشن میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔" میں نے

جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، آؤ واپس چلیں۔"

ہم مینار کے کھنڈر کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ ہمارا سراغرساں ساتھی ایک طرف چھپ کر ہمارا انتظار کر رہا تھا ہم جس راستے سے آئے تھے۔ اسی راستے سے الگ الگ ہو کر واپس روانہ ہوئے۔ مکھن پر آئے، ہاشم ابھی نہیں پہنچا تھا۔ ہم تھکا کھول کر اوپر والے چوہارے میں جا کر بیٹھ گئے۔ سراغرساں مجاہد ہاشم کو لینے چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہاشم کو لے کر آگیا۔ ہاشم نے بتایا کہ اس نے فیروز شہ سے ساری بات کر لی ہے۔ وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔ بلکہ کہنے لگا کہ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے میں اپنی جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

خالد نے پوچھا۔

"وہ کس وقت یہاں آ رہا ہے؟"

"رات کو دکن بند کر کے آجائے گا۔"

ہم مکھن میں ہی بیٹھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات کا کھانا کھا کر ہم چائے پی رہے تھے کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ہاشم بولا۔

"فیروز شہ آگیا ہے۔"

وہ نیچے گیا اور جب اوپر آیا تو اس کے ساتھ گھنے ہوئے بدن کا ایک ہڈی بٹڈر قسم کا نوجوان تھا جس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چاندی کا تعویذ تھا۔ اس نے السلام و علیکم کہا اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہاشم نے اس کا تعارف کروایا۔ میں نے

کہا۔

"پہلوان جی چائے تو آپ شاید نہیں پیتے گے۔"

فیروز شہ مسکرانے لگا۔

"شکریہ بھائی صاحب۔ ہم پہلوان لوگ چائے نہیں پیتے، چائے ہمیں گرمی کرتی ہے۔"

چند ایک باتیں کرنے کے بعد کمانڈو خالد نے مطلب کی بات شروع کر دی۔

"فیروز شہ یہ بتاؤ کہ نیلے والے سپلائی سینٹر سے کس کس دن اسلحہ ٹرکوں میں لوڈ کیا جاتا ہے۔"

اس نے کہا۔

"بھائی جان۔ سات ٹرک لوڈ ہو کر دو روز پہلے جموں کشمیر کی طرف گئے ہیں۔ اب تین دن بعد پھر سات ٹرک لوڈ ہو کر جائیں گے۔"

خالد نے پوچھا۔

"تم کتنے سولین وہاں اسلحہ لوڈ کرتے ہو؟"

"ہم کل چھ سولین ہیں۔ چار ہندو مسافر ہیں، دو ہم مسلمان ہیں۔ ایک میں دو سراجبار ہے۔"

خالد نے سوال کیا۔

"یہ جبار کس قسم کا آدمی ہے۔"

فیروز شاہ گردن گھماتے ہوئے بولا۔

"بھائی جان! وہ دنیاوار قسم کا آدمی ہے۔ پہلے ریلوے گودام پر مزدوری کرتا تھا۔ وہاں ایک آدمی سے جھگڑا کر بیخدا۔ آج کل اس کا کونوں کا مال ہے۔ محنت مزدوری کے لیے ٹرکوں پر مال لوڈ کرنے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔"

خلد نے میری طرف دیکھ کر میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

خلد کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے فیروز شاہ سے کہا۔

"فیروز شاہ! یہ تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم کس مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ بھارت نے اپنی فوج کے ذریعے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہاں بھارتی فوج کشمیری مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی ہے۔ مسجدوں، خانقاہوں اور کشمیریوں کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے۔ انہیں وحشیانہ انداز میں اذیتیں دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ کشمیری حریت پرست اپنے وطن کی آزادی کے لیے جانوں کے نذرانے دے رہے ہیں۔ بھارتی فوجی جدید ترین اسلحے سے لیس ہوتے ہیں جبکہ کشمیری حریت پرستوں کے پاس سوائے راکٹوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بھارتی فوجی یونٹوں کو جھانسی کے سپلائی سینٹر سے اس وقت انتہائی ہلاکت خیز فوجی اسلحہ سپلائی کیا جا رہا ہے۔ جس سے بھارتی فوجی مقبوضہ کشمیر میں مظلوم کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔"

فیروز شاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھائی جان! کشمیری مسلمانوں کی آزادی اور اسلام کی خاطر فیروز شاہ کی ایک جان تو کیا ہزار جانیں حاضر ہیں۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلا کام تو تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ جب ہم تمہیں کہیں تمہیں اپنے دوسرے مسلمان ساتھی جبار کو کم از کم چار دلوں کے لیے کہیں غائب کر دنا ہو گا۔ کیا تم ایسا کر

سکتے ہو؟ کیونکہ ہم جبار پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

فیروز شاہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ ہاشم کہنے لگا۔

"اس کو غائب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا انتظام بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود کچھ دنوں کے لیے جھانسی سے باہر چلا جائے۔ کیوں فیروز شاہ؟ جبار کی چھوٹی بہن دوہنی میں اپنے خلوں بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ہم جبار کے ہم وہاں سے ایک تار بھجوا دیں گے کہ تمہاری بہن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ جلدی پہنچو۔ جبار تار لٹنے کے بعد ہر حالت میں دوہنی روانہ ہو جائے گا کیونکہ اس کی ایک ہی بہن ہے اور وہ اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ ہمیں اکثر کہا کرتا ہے کہ میری یہ بہن میرا بھائی بھی ہے اور میری ماں بھی ہے۔ اس کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

خلد نے پوچھا۔

"کیا تم لوگ دوہنی سے اس قسم کا تار بھجوا سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔" ہاشم بولا۔ "وہاں میرا ایک جگری دوست دس برس سے رہ رہا ہے۔ میں جس وقت اسے فون پر کہوں گا کہ اس مضمون کا تار جبار کے پتے پر بھجوا دو۔ وہ فوراً بھجوا دے گا۔"

کمانڈو خلد نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ مسئلہ تقریباً" طے ہی سمجھو۔ اب فیروز شاہ باقی کا کام تمہیں کرنا ہو گا۔"

"آپ حکم کریں بھائی جان۔ میری جان بھی حاضر ہے۔"

فیروز شاہ نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔ کمانڈو خلد نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ تم لوگ ایمونیشن ڈپو کے باہر سے اسلحہ کے کسٹ اور کیسے اٹا کر

ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہو یا تمہیں یہ چیزیں اٹھانے کے لیے اسلحہ کے گودام کے اندر بھی

جاننا پڑتا ہے؟"

فیروز شاہ نے کہا۔

”باہر کوئی جیسے نہیں ہوتے جناب۔ ہم سولین بھی فوجی جوانوں کے ساتھ گودام کے اندر جاتے ہیں اور وہاں سے اسلحہ کے چھوٹے بڑے کریٹ اٹھا کر لاتے ہیں اور فوجی ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہیں۔“

کمانڈر خالد نے کہا۔

”تم نے یہ بتا کر ہمارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ گودام میں پٹرول وغیرہ کے ڈرم بھی رکھے ہوتے ہیں یا نہیں؟“

فیروز شاہ بولا۔

”بھائی جان! مجھے یہ کام کرتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ مجھے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہوا ہے۔ میں تو جیسے کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس میں مشین گن کا میگزین ہے یا ہینڈ گرنیڈ ہیں۔ پٹرول کے ڈرم نہیں ہوتے، بڑے بڑے کین ہوتے ہیں۔“

کمانڈر خالد ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”یہ مجھے معلوم تھا مگر میں نے ڈرموں کا نام اس لیے لیا تھا کہ شاید کین تم نہ سمجھ سکو۔ مگر یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تمہیں فوجی اسلحہ کی پوری پوری پہچان ہے۔ اب بات یہ ہے کہ جس روز تمہارا ساتھی جبار دوبئی چلا جائے گا اس کے بعد جب تم اپنے ہندو ساتھیوں کے ہمراہ ٹرکوں میں اسلحہ لوڈ کرنے سپلائی سینٹر جاؤ گے تو ہم تمہیں کالے رنگ کا ایک تعویذ دیں گے۔ یہ تعویذ چوکور ہوگا۔ زیادہ بڑا نہیں ہوگا۔ اس پر جڑا منڈھا ہوا ہوگا۔ فیتہ لگا ہوگا۔ تم اس تعویذ کو اپنے بازو پر باندھ کر ایمونیشن سپلائی سینٹر میں جاؤ گے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہوگا کہ جب تم اسلحہ کے کریٹ اٹھانے اندر جاؤ تو آٹھ پچا کر یہ تعویذ اتار کر کسی بھی پٹرول کین کے پاس رکھ دو گے اور رکھنے سے پہلے اس کو انگوٹھے سے ذرا سا دبا دو گے۔ کیا یہ کام اتنی احتیاط کے ساتھ کر سکو گے کہ تمہارے کسی سولین ساتھی یا کسی فوجی جوان کو پتہ نہ چل سکے؟“

فیروز شاہ بولا۔

”یہ تو کوئی مشکل کام ہی نہیں ہے بھائی جان۔ مجھے کوئی مشکل کام بتائیں۔“

کمانڈر خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے دوست! اس کام کو چاہے مشکل سمجھو چاہے آسان لیکن تمہیں صرف اتنا کام ہی کرنا ہوگا۔“

فیروز شاہ نے سوال کیا۔

”بھائی جان! یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جو تعویذ آپ مجھے دیں گے وہ کوئی ٹائم بم ہوگا اور بڑا ہی طاقت ور ٹائم بم ہوگا۔ لیکن یہ ضرور بتا دیں کہ بم رکھنے کے کتنی دیر بعد پھٹے گا؟“

کمانڈر خالد نے کہا۔

”ڈیڑھ گھنٹے بعد پھٹے گا۔ اس وقت تک میرا خیال ہے تم اپنے گھر پہنچ گئے ہو گے۔“

فیروز شاہ نے کوئی اندازہ لگا کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں آخری پھیرا لگاتے ہوئے یہ تعویذ پٹرول کینوں کے درمیان رکھ دوں گا۔ اس کے بعد تو مجھے چھٹی کر کے گھر ہی جانا ہوگا۔ لیکن بھائی صاحب دھماکہ کتنا ہوگا؟ ہمارے محلے کے مکان تو نہیں مریں گے؟“

اس پر میں نے فیروز شاہ کو تسلی دی۔

”فکر نہ کرو ہمارے پتلوان بھلہ! تمہارے گھر محفوظ رہیں گے۔ صرف وہ پہاڑی غائب ہو جائے گی جس پر ایمونیشن کا گودام ہے۔“

فیروز شاہ کو ہم نے اپنے پلان کی ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اسے رخصت کر دیا۔ ہاشم نے کہا کہ وہ دوبئی ٹیلی فون پر اپنے دوست کو خبر کر دے گا کہ وہ جبار کو اس کی بہن کے حادثے کے بارے میں ٹیلی گرام دے دے۔ تین دن کے بعد جھانسی کے آرمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے گولہ بارود ٹرکوں میں لوڈ کیا جانا تھا۔ دو دن پہلے ہاشم نے دوبئی اپنے دوست کو فون کر دیا۔ دوسرے روز صبح جبار کو ٹیلی گرام موصول ہوا کہ اس کی بہن کا کار میں حادثہ ہو گیا ہے اور وہ ہسپتال میں ہے۔ جبار دوسرے

تک نہ پہنچ سکے۔ ہم نے ٹارگٹ رجسٹر کر رکھا تھا کہ ہمیں کہیں گھات لگا کر بیٹھنا ہے۔ چنانچہ ہم ٹھیک دس بجے ہاشم کے مکان سے نکل کھڑے ہوئے۔ سرافرساں مجاہد ہمارے ساتھ تھا۔ ہم شر سے کافی دور آ گئے۔ یہاں ہمیں چھوٹے ٹیلوں کے درمیان ایک سڑک مل کھاتی گزر رہی تھی۔ گولہ بارود اور جدید ہتھیاروں سے بھرے ہوئے فوجی ٹرکوں کو اسی سڑک پر سے گزرنا تھا۔ فیروز شاہ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ فوجی گاڑیاں اسلحہ لے کر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک جوں کشمیر کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن سویلین مزدور ایک بجے تک اسلحہ کے گودام میں بکس اور کرسٹ وغیرہ کو اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے کے لیے وہیں رہتے ہیں۔

ہمارے پاس چھ چھ پنڈ گرنیڈ تھے۔ آئوٹک ہسپتال تھے اور ایک ایک کمانڈو چاقو تھا۔ شین گھنیں وغیرہ ہمیں نہیں مل سکی تھیں۔ پنڈ گرنیڈ ہمارے سرافرساں مجاہد نے اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعے حاصل کیے تھے۔ میں اور کمانڈو خالد سویلین کپڑوں میں تھے۔ ہم نے سرافرساں مجاہد کو واپس بھیج دیا اور خود نیلے کی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ابھی فوجی گاڑیوں کے آنے میں کافی وقت تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ اگر تعویذ ہم میں عین وقت پر کوئی فنی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور فیروز شاہ دن کے ایک بجے اسے پزول کے درمیان رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ڈیزہ گھنٹے بعد یعنی ٹھیک ڈھلان بجے جھانسی میں ایک ایسا دھماکہ ہونے والا تھا جس کو جھانسی کے شہریوں نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔

نیلے کی ڈھلان سے ہمیں سڑک ذرا نیچے صاف نظر آ رہی تھی۔ جہاں ہم گھات لگا کر بیٹھے تھے وہاں پیچھے تھوڑے فاصلے پر سڑک نیلے کے پہلو سے ہو کر سڑک کاموڑ گھومتی ہوئی سامنے آتی تھی۔ سڑک خلی پڑی تھی۔ جب سے ہم وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے سڑک پر سے کوئی سویلین گاڑی رکشا یا سکور وغیرہ نہیں گزرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس روز یہاں سے فوجی گاڑیاں گزرنی ہوتی تھیں اس روز چند گھنٹوں کے لیے سڑک سویلین ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی تھی۔ ہم نے سڑک کے پہاڑی موڑ پر

کی فلائیٹ سے دوپٹی چلا گیا۔

اب ہمارا میدان صاف تھا۔ دوسرے روز دن کے دس بجے ایمونیشن سپلائی سینٹر سے اسلحہ کے ٹرک لوڈ ہوئے تھے۔ کمانڈو خالد نے اس دوران جھانسی کے ایک ماہر اور تجربہ کار ایکسپوزیٹر تیار کرنے والے مجاہد کی مدد سے ایک ایسا تعویذ ہم تیار کر لیا تھا جس کی طاقت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ یہ تعویذ رات کے وقت فیروز شاہ کے حوالے کر دیا گیا جس نے اسے اپنے بازو پر باندھ لیا۔ فیروز شاہ کی گھڑی سے ہم نے اپنی گھڑیاں ملا لیں۔ اس نے بتایا کہ وہ عام طور پر دوپہر کے ایک بجے ٹرک لوڈنگ سے فارغ ہو جاتا ہے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

”تم ٹھیک ایک بجے تعویذ ہم کو اسلحہ کے گودام کے اندر پزول کے ڈرموں کے درمیان رکھ کر اس کو اوپر سے دبا دیتا۔“

فیروز شاہ نے کہا۔

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

دوسرا دن ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

اس روز ہمارا مشن کامیاب بھی ہو سکتا تھا اور ناکام بھی۔ اس روز جھانسی کے شہری ایک قیامت خیز دھماکہ سننے والے تھے اور سارا شہر لرزنے والا تھا اور اگر کسی وجہ سے تعویذ ہم بلاست نہیں ہوتا تو ہمارا مشن ناکام بھی ہو سکتا تھا۔ ہم اپنی کامیابی کے لیے خدا سے دعا مانگ رہے تھے۔ ٹھیک دن کے ساڑھے نو بجے فیروز شاہ نے ہاشم کے ہاتھ ہمیں یہ پیغام بھیجا کہ وہ سپلائی سینٹر جا رہا ہے اور ہر چیز اپنے وقت کے مطابق عمل میں آئے گی۔

ہمیں کیا کرنا تھا؟ یہ بھی ہم نے طے کر لیا ہوا تھا۔

اپنے سرافرساں جاسوس نے ہمیں وہ راستہ بتا دیا تھا جہاں سے اسلحہ سے لدی ہوئی فوجی گاڑیوں کو گزرنا تھا۔ ہم ان چھ سات اسلحہ سے بھری ہوئی گاڑیوں کو بھی راستے میں اڑا دینا چاہتے تھے تاکہ یہ اسلحہ بھی کشمیر میں تعینات مقبوضہ انڈین یونٹوں

اس لیے پوزیشن لی تھی کہ موڑ گھومنے کی وجہ سے فوجی گاڑیوں کی رفتار کم ہو جانا یقینی تھا۔ عین اس وقت ہمیں حملہ کرنا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھ لیتے تھے۔ جب ہمیں محسوس ہوا کہ فیروز شاہ کے مطابق اس وقت اسلحہ اور جدید ہتھیاروں سے لدی ہوئی فوجی گاڑیاں جھانسی آرمی سپلائی سینٹر سے روانہ ہو چکی ہوں گی تو خالد نے اپنے پلان کے مطابق مجھے اشارہ کیا۔ میں اپنی پوزیشن سے اٹھ کر دس گز پرے ہو کر ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

ہم ایک دوسرے سے اب صرف اشاروں میں بات کرتے تھے۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ ٹائم شیڈول کے مطابق فوجی گاڑیوں کو پانچ منٹ بعد پہاڑی کا موڑ کاٹ کر نمودار ہونا تھا۔ عین اس وقت مجھے کمانڈو خالد نے خاص اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ وہ بھی اپنی پوزیشن سے اٹھ کر پندرہ گز اوپر چلا گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ نیلے پر جھاڑیاں بست تھیں۔ ہم ان کی اوٹ میں اچھی طرح سے چھپ کر بیٹھے تھے۔ ہماری آنکھیں اپنی دائیں جانب اس جگہ لگی ہوئی تھیں جہاں پہاڑی سڑک موڑ مڑتی تھی۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر دس منٹ اور پندرہ منٹ بھی گزر گئے۔ فوجی گاڑیوں کا کونوے نمودار ہوا۔ اس کے بعد دور سے بھاری ٹرک کے انجن کی آواز آئی۔ کمانڈو خالد نے مجھے سینڈ بائی کا سگنل ہاتھ کے اشارے سے دیا۔ میں پوری طرح سینڈ نو تھا۔ دو گرینڈ میرے ہاتھ میں تھے۔ دو گرینڈ میں نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس یہی معمولی دھماکہ خیز اسلحہ تھا۔ لیکن چونکہ گاڑیوں میں گولہ بارود لدا ہوا تھا اس لیے یقین تھا کہ یہ گرینڈ ٹرکوں میں پھٹ کر ایٹم بم کا کام کریں گے اور ان کے ساتھ ہی ٹرکوں میں لدا ہوا گولہ بارود قیامت خیز دھماکوں سے پھٹ پڑے گا۔ میرے کان فوجی ٹرک کی آواز پر گئے ہوئے تھے۔ اب اس آواز میں دوسری فوجی گاڑیوں کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی کے موڑ پر ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی جس پر مشین گن لگی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے فوجی ٹرک آنے شروع ہو گئے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ یہ کل چھ فوجی ٹرک تھے۔ ان میں سے آگے کے ایک ٹرک پر تریاں پڑی ہوئی تھیں۔ پچھلے تین ٹرک تریاں سے ڈھکے ہوئے نہیں تھے۔ اگلے تین ٹرک کمانڈو خالد کا ٹارگٹ تھے۔ پچھلے تین ٹرکوں پر میں نے یکے بعد دیگرے ہینڈ گرینڈ پھینکتے تھے۔ تین ٹرکوں کے درمیان ایک بکتر بند گاڑی بھی نظر آئی لیکن اس وقت ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ ہماری نگاہیں صرف اپنے اپنے ٹارگٹ پر تھیں۔ مجھے اونچائی سے ٹھیک ٹارگٹ پر گرینڈ پھینکنے کی ہاتھ دھڑکنگ ملی ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد کے بارے میں مجھے تھوڑا سا شک تھا۔ ہر ٹرک کے درمیان تھوڑا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ پہاڑی سڑک ہونے کی وجہ سے فوجی ٹرکوں کی رفتار ہلکی تھی۔ میں نے اگلے تین ٹرک گزر جانے دیے۔ ایک گرینڈ میرے ایک ہاتھ میں تھا۔ دو سرا گرینڈ میرے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ جیسے ہی چوتھا ٹرک میری بالکل سیدھ میں نیچے سے گزرنے لگا تو میں نے بسم اللہ پڑھ کر گرینڈ کا سیفٹی پن کھینچا اور اسے خاص انداز اور خاص زاویے سے ٹرک پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دو سرا گرینڈ دوسرے ٹرک پر پھینک دیا مگر اس سے پہلے کمانڈو خالد اگلے تینوں ٹرکوں میں گرینڈ پھینک چکا تھا۔ اچانک دو دھماکے ہوئے۔ پہاڑیاں اپنی جگہ سے اوپر نیچے ہو گئیں۔ پھر تین اور دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے باقی گرینڈ بھی بیٹ کے بل لیٹ کر نیچے پھینک دیے۔ اب سڑک پر ایک بت قیامت خیز دھماکہ ہوا جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا ہو۔ اس فوجی کونوے کے کسی ایک ٹرک میں انتہائی دھماکہ خیز اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ اس دھماکے نے قیامت کا منظر پیش کر دیا۔ سڑک پر ہر طرف آگ کے شعلے اور دھواں ہی دھواں تھا۔ آدمیوں کی چیخ و پکار تھی اور ٹرکوں کا اسلحہ ایک دو دو سینڈ کے بعد پھٹ رہا تھا اور لوہے کے سرخ ٹکڑے ہمارے اوپر سے زناٹوں کے ساتھ نکل رہے تھے۔

ہم پلان کے مطابق نیلے کی ڈھلان پر ایک طرف کو آگے پیچھے دوڑ پڑے۔ خدا جانے اگلی جیپ یا پچھلی جیپ بچ گئی تھی۔ ڈھلان پر مشین گن کا فائر آنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے نیلے کے اوپر جانے کی بجائے دوسری جانب بھاگ رہے تھے۔

گولیاں ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے پھنسنے سے وہاں قیامت کا شور تھا جس میں مشین گن فائرنگ کے دھماکے الگ گونج رہے تھے لیکن ہم ان کی پہنچ سے دور نکل آئے تھے۔ پروگرام کے مطابق سرائرساں مجاہد موٹر سائیکل لے چلے کی دوسری جانب ایک جگہ درختوں میں کھڑا تھا۔ ہمیں دوڑتے ہوئے آتا دیکھ کر اس نے موٹر سائیکل شارٹ کر دیا۔ کمانڈو خالد نے موٹر سائیکل سنبھالا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل اونچے نیچے راستوں پر اچھلتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔

پروگرام کے مطابق سرائرساں مجاہد کو وہاں سے اپنے طور پر ایک جگہ پہنچنا تھا۔ ہم موٹر سائیکل کو تیزی سے بھگائے لے جا رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے ایک جگہ موٹر سائیکل کھیت میں کھڑی کر دی۔ یہاں سے سرائرساں مجاہد نے آکر موٹر سائیکل لے جانی تھی۔ آگے شر کے مضافات تھے۔ دھماکوں کی آواز برابر آ رہی تھی مگر اب جھوٹا اسلحہ پھٹ رہا تھا۔ ہم بڑے سکون کے ساتھ ٹارنل انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھ کر خلد سے کہا۔

”سپلائی سینٹر والے دھماکے میں ابھی ایک گھنٹہ میں منٹ رہتے ہیں۔“

اس نے آہستہ سے کہا۔

”اللہ کو جو منظور ہے وہی ہوگا۔“

ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر ہاشم کے مکان میں آ گئے۔ ہاشم بینک میں ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ فوجی کنوائے کی تباہی کے دھماکے اس نے بھی سنے تھے۔ کہنے لگا۔

”آپ لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ آپ واقعی بڑے ماہر کمانڈو ہیں۔“

ہم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اوپر والے چوہارے میں چلے آئے۔ ہاشم ہمارے پیچھے پیچھے آیا۔ ہمارے پاس دو دو ہینڈ گرنیڈج گئے تھے۔ ہم نے چاروں گرنیڈج نکال کر ہاشم کو دے دیے۔ کمانڈو خالد نے اسے کہا۔

”انہیں کسی ایسی جگہ چھپا کر رکھ دو کہ ضرورت پڑنے پر ہمیں مل بھی جائیں اور اگر پولیس یہاں تلاشی بھی لے تو اسے نہ ملیں۔“

ہاشم نے چاروں گرنیڈج لے کر رومل میں باندھ کر رکھ لیے اور کہنے لگا۔

”سپلائی والا دھماکہ ابھی تک نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے فیروز پتلوان نے اپنا کام کر دیا ہوگا۔“

خالد نے کہا۔

”اگر اس نے اپنی ڈیوٹی ٹھیک طرح سے پوری کر دی ہے تو پھر سوا گھنٹہ ہمیں دھماکے کا مزید انتظار کرنا پڑے گا۔“

ہاشم بولا۔

”میں آپ کے لیے چائے لاتا ہوں۔“

میں نے اسے کہا۔

”کہیں سے چائے لاؤ گے؟“

وہ بولا۔

”بازار کی کھڑ پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں سے لاؤں گا۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”اس وقت تمہارا باہر نکلتا ٹھیک نہیں ہے، ہمیں چائے نہیں چاہیے۔“

ہاشم کہنے لگا۔

”تو پھر میں بیس چائے بتاتا ہوں۔ چائے کی تو مجھے بھی سخت طلب محسوس ہو

رہی ہے۔ آپ کو بھی چائے کی سخت ضرورت ہے۔“

مکان کی پہلی منزل پر بلورچی خانہ تھا۔ ہاشم نیچے چلا گیا۔ ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں پر

نگاہ ڈالی۔ ہم پر ایک عجیب بیچن خیر کیفیت طاری تھی۔ خالد مجھ سے کہنے لگا۔

”کرم دادا تمہارا کیا خیال ہے، فیروز شہ نے ہم بھی ٹھیک جگہ پر رکھ دیا ہوگا؟“

میں نے کہا۔

”آدمی اگرچہ اناڑی ہے مگر اسے کوئی خاص ٹیکنیکل کام بھی نہیں کرنا تھا۔ ایک

تعویذ تھا جو اس نے اپنے بازو کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ بس اس تعویذ کو پڑوں کے

ڈرموں کے درمیان رکھ دتا ہے۔"

اچانک مجھے نیل آیا کہ ایک تو ہم نے گولہ بارود والے فوجی کنوائے کو اڑا دیا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد ایمونیشن سینٹر دھماکے سے اڑ گیا تو فوج ہماری تلاش میں سارے جھانسی شہر کو گھیرے میں لے لے گی اور نہیں ممکن ہے کہ ہم پکڑے جائیں۔ جب میں نے خالد کے آگے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بھی تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا، بھوپال ہوتا تو اور بات تھی۔ یہ دوسرا شہر ہے، ہم اس شہر کے گلی محلوں سے بھی مذاقت ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل کر شہر سے دور کسی جگہ چھپ جانا چاہیے۔"

کمانڈو خالد جلدی سے اٹھ کر اس نے بیڑھیوں میں جا کر ہاشم کو آواز دی۔ وہ اوپر آگیا۔ خالد نے اسے ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس طرح اس کے پکڑے جانے کا بھی ڈر ہے۔ ہاشم بولا۔

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے لیکن آپ کا سلامت رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میرے ساتھ آئیے۔"

ہم نے اپنے آئوٹریک پستول اور کمانڈو چاقو جیبوں میں سنبھالے اور ہاشم کے ساتھ اس کے مکان سے نکل آئے۔ اس کا مکان جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں شہر سے باہر ایک معمولی سی غربانہ بستی میں تھا۔ وہاں سے ہم پیدال ہی گزر کر جب شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آئے تو وہاں تین فوجی گاڑیاں بڑی تیزی سے گزر گئیں۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داؤ لگتا ہے تم نے عین وقت پر ہم سب کو بچا لیا ہے۔"

ہاشم نے کہا۔

"سڑک سے اتر کر کھیتوں میں آ جائیں۔"

ہم سڑک سے اتر کر کھیتوں میں سے گزرنے لگے۔ کھیتوں میں اونچی فصل کھڑی

تھی۔ ہاشم ہمیں لے کر فصل کی لوٹ میں ہو گیا۔ ہم اس کے پیچھے تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے گھڑی پر نگہ ڈالی۔ ابھی دھماکے ہونے میں کافی وقت تھا۔ کمانڈو خالد نے ہاشم سے کہا۔

"شہر سے باہر اگر ہم کسی جنگل میں چلے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا؟ کسی مکان وغیرہ میں چھپنا ٹھیک نہیں رہے گا۔"

ہاشم بولا۔

"میں آپ کو جنگل میں ہی لیے جا رہا ہوں۔"

وسطی بھارت کے گھنے جنگلوں کا سلسلہ ایک طرح سے بستی کی طرف جاتے ہوئے گوالیار ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن مغربی کوہ ست پڑا کے جنگل جھانسی کے بعد زیادہ گھنے ہوتا شروع ہو جاتے ہیں جو آگے بھوپال سے لے کر جنوب میں ہوشنگ آباد اور ناگ پور تک چلے گئے ہیں۔ ایک مقام پر مندر کی بڑی عمارت سڑک کنارے آ گئی۔ ہاشم نے وہاں سے موٹر رکشا لے لیا۔ ہم تینوں گھسڑ سڑک ایک ہی رکشے میں بیٹھ گئے۔ رکشا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ہاشم اسے گھنیز کر رہا تھا۔ جب ہم شہر سے کئی میل آگے بھوپال کی جانب آ گئے تو ہاشم نے ایک ندی کے پل پر پہنچ کر رکشے کو فارغ کر دیا۔ ہم ندی کا پل عبور کر کے دوسری طرف درختوں، جھاڑیوں کے درمیان چلنے لگے۔ آگے ایک جنگلاتی ٹیلہ تھا۔ ہاشم رک گیا۔ نیلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"یہاں اوپر کسی زمانے میں ایک ہندو ٹھیکیدار نے اپنی والدہ کی سلاہ بنائی تھی اور ساتھ ہی اپنے رہنے کے لیے ایک کوٹھڑی بھی بنوائی تھی۔ وہ مینے میں چار دن یہاں اپنی ماں کی سلاہ پر آکر بھجن کیرتن کیا کرتا تھا۔ اس ہندو ٹھیکیدار کے مرنے کے بعد یہ سلاہ ویران ہو گئی۔ اب یہاں کئی برس سے کوئی نہیں آیا۔ آپ لوگ اس کوٹھڑی میں جتنی دیر چاہیں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا، کیا خیال ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

نیلہ چھوٹا سا تھا۔ چڑھائی چڑھنے کے لیے ڈھلان پر ایک طرف اس مال دار ہندو نے پتھر کی بیڑھیاں بنائی ہوئی تھیں جو اب اونچی گھاس میں چھپ گئی تھیں۔ ہم بیڑھیاں چڑھ کر نیلے کے اوپر آگئے۔ نیلے کے اوپر ایک تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جس میں درمیان میں ایک سلاخ تھی۔ سادھ اب آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ کیا ہوتی ہے۔ بعض ہندو لوگ اپنے مردوں کی کچھ ہڈیاں یا راکھ چتا سے لا کر دفن کر دیتے ہیں۔ اس کے اوپر بہت چھوٹی سی بارہ دری یا سہ دری بنا دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ وہیں ایک طرف کچیرل کی ڈھلانی چمت والی ایک کونھڑی تھی۔ چمت ایک طرف سے دیوار کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئی تھی۔ کونھڑی کا دروازہ بھی غائب تھا۔ یہاں سے مغرب کی جانب جھانسی شرکی آبلوی دور سے نظر آ رہی تھی۔ میں اور کمانڈو خالد اس آبلوی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کہنے لگا۔

”یہاں سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے ٹارگٹ مار لیا ہے یا ہم اپنے مشن میں ناکام ہو گئے ہیں۔“

ہاشم کہنے لگا۔

”میں شام کو آکر آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آپ کے لیے کھانا اور چائے بھی لیتا آؤں گا۔ یہ جگہ بڑی محفوظ ہے، اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں ہے۔“

ہاشم ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم ایک ایک منٹ بڑی بے چینی اور تجسس کے عالم میں گزار رہے تھے۔ کونھڑی کے باہر سلاخ کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹے شرکی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے۔ اگر فیروز شاہ نے پلان کے مطابق سب کام کیا تھا تو ابھی کچھ دیر میں وہیں زبردست دھماکہ ہونے والا تھا۔ ہم بار بار اپنی اپنی گھڑیوں کو دیکھتے۔ میں نے خالد سے پوچھا۔

”خالد بھائی فیروز شاہ نے یہی کہا تھا میں کہ وہ ٹھیک ایک بجے بم گودام میں رکھ

دے گا۔“

”کہا تو یہی تھا۔“

خالد نے شرکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا۔

”اس سب سے تو دھماکہ ہونے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔“

خالد نے اپنی گھڑی دیکھی اور اٹھ کر ٹپٹنے لگا۔ پھر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اس بیجلی کیفیت سے نکل آنا چاہیے۔ ہم جو کچھ کر سکتے

تھے ہم نے کر دیا ہے۔ اب آگے قسمت کا کھیل ہے۔ دھماکہ ہونا ہو گا تو ہو جائے گا۔

نہیں ہونا ہو گا تو ایک بار پھر کسی دوسری حکمت عملی پر عمل کر کے کوشش کریں گے۔“

اتنے میں مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا خالد نے بھی محسوس کیا۔ اس کے

ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے دور کہیں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہو۔ ہماری نگاہیں

بے اختیار شرکی طرف اٹھ گئیں۔ دن کا وقت تھا۔ شرکی طرف ایک جانب دھوئیں

کے بول اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے بے اختیار مجھے گلے لگے

لیا۔

”کرم دادا! ہم نے ٹارگٹ مار لیا ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔“

اور کمانڈو خالد وہیں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ شرکی طرف سے پرندوں کے

غول کے غول شور مچاتے جنگل کی طرف اڑتے چلے آ رہے تھے۔ دھماکے کی لرزش

سے جنگل میں درختوں کے پرندے بھی شور مچاتے اڑ گئے تھے۔

کمانڈو خالد اور میں مسلسل شرکی آبلوی کے اوپر دھوئیں کے بولوں کو دیکھ رہے

تھے۔ کسی کسی وقت سیاہ دھوئیں میں بجلی سی چمک جاتی تھی۔ یہ پھٹنے والے مختلف

اسٹیم کی چمک تھی۔ دھوئیں کے بول شر کے اوپر کافی بلندی پر جا کر مطلق ہو گئے تھے۔

کمانڈو خالد نے دھوئیں کے بولوں کو دیکھ کر کہا۔

”کرم دادا! کہیں اس ایمونیشن سینٹر میں انڈین آرمی نے کوئی نیوکلیائی میٹرائیل

دیگر تو نہیں رکھے تھے۔ دھوئیں کی یہ چھتری مجھے بالکل ایٹم بم کے دھماکے کے بعد کی

میرے سوال کے جواب میں کمانڈر خالد نے کہا۔
 ”ہمیں اب حالات کے معمول پر آنے تک اس جگہ رہنا چاہیے، دانشمندی کا یہی
 تقاضا ہے۔ اس وقت نکلنے میں پکڑے جانے کا خدشہ زیادہ ہے۔“
 میں نے کہا۔

”خالد! میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہمارا یہاں زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا ہمارے لیے
 نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ ہم آج ہی رات کے اندھیرے
 میں یہاں سے بھوپال کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہم جہانسی بھوپال روڈ کو چھوڑ کر
 کھیتوں، میدانوں اور جنگل میں سے ہوتے ہوئے خطرے کے علاقے سے نکل سکتے
 ہیں۔“

کمانڈر خالد بولا۔

”ہم بھٹک بھی سکتے ہیں۔ مجھے راستے کا علم نہیں ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ ہاشم
 رات کو آئے تو اس سے حالات معلوم کیے جائیں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔“
 سورج غروب ہونے لگا۔ ہم نیلے پر کوٹھڑی کے باہر ہی بیٹھے کبھی باتیں کرتے،
 کبھی شلٹے اور کبھی شرکی آبادی کی طرف دیکھتے رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو ہاشم کا
 انتظار شروع ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہوتے ہی آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ
 جلدی آ جائے۔ وہ بھی ہمیں دھماکے کے رد عمل اور پولیس اور فوج کی سرگرمیوں کے
 بارے میں تازہ ترین صورت حال بتانے کو بے تاب ہو گا۔

ابھی سورج غروب ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہاشم آگیا۔ وہ ہمارے
 لیے کھانے پینے کا کچھ سلن بھی لایا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ نیلے کا سپلائی سینٹر
 سارا اڑ گیا ہے۔ نیلے کے ارد گرد کی پھاڑیوں میں بھی آگ لگی ہے۔ شہر میں پولیس اور
 فوج آگنی ہے۔ سپلائی سینٹر کے علاقے میں فوج نے کرفو لگا دیا ہے۔ جب ہم نے اسے
 بتایا کہ ہم رات کو وہاں سے بھوپال کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں تو اس نے کہا۔
 ”بھوپال جہانسی روڈ پر تو فوج جگہ جگہ موجود ہے۔“

پھرتی لگتی ہے۔“
 میں نے کہا۔

”نہیں خالد بھائی۔ ایسی بات ہوتی تو اس وقت سارا شہر آگ کی لپیٹ میں ہوتا اور
 ہم بھی یہاں زندہ سلامت نہ ہوتے۔ یہ انتہائی طاقتور بارود کے پھٹنے کی وجہ سے
 ہے۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں کہ اس طرف کوئی فوجی یا پولیس کی
 گاڑی تو نہیں آئی۔“

میں نیلے سے اتر کر درختوں میں سے گزرتا اس جگہ آگیا جہاں دور سے کھیت اور
 کھیتوں کے پار شر کو جاتی سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا۔ مجھے ایسا
 لگا جیسے لوگوں میں کچھ افراتفری سی ہے۔ گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں بھی آ رہی
 تھیں۔ کھیت خالی پڑے تھے۔ ابھی تک اس طرف کوئی نہیں آیا تھا۔ فوج نے ضرور
 شر کو محاصرے میں لے لیا ہو گا۔ میں واپس خالد کے پاس آگیا۔ اس نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات؟“

میں نے کہا۔

”ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں یہاں اب رکنا نہیں چاہیے۔ دیکھا
 جائے تو ہمارا مشن مکمل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ فوج کے
 ایمونیشن سپلائی سینٹر میں اتنی زبردست تباہی ہوئی ہے۔ فوجی کوائے اڑ گیا ہے۔ فوج
 اور پولیس آرام سے تو نہیں بیٹھے گی۔“

کمانڈر خالد نے ذرا سوچ کر کہا۔

”اگر ہم اس وقت نکل جاتے جس وقت ہاشم ہمیں لے کر اس طرف آیا تھا تو
 ٹھیک ہوتا۔ اب خطرہ ہے کہ جہانسی بھوپال روڈ پر ملٹری پولیس آگنی ہوگی۔“
 ”تو پھر اس جگہ کب تک بیٹھے رہیں گے؟“



خالد نے کہا کہ ہم جنگل میں سے گزر کر جاسکتے ہیں۔ ہاشم سوچنے لگا۔
”جنگل رات کے وقت انسان کا جلی دشمن بن جاتا ہے اور پھر جنگل میں راستے کی
سمت کو برقرار رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ دو ایک روز یہیں ٹھہرے
رہیں۔ اس کے بعد بے شک نکل جائیں۔“

میں نے خالد کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔

”میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“

”لیکن“ میں نے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم یہاں محفوظ ہوں
گے۔ اور اس طرف ملٹری انٹیلی جینس کا دھیان نہیں جائے گا۔ انٹیلی جینس کے آدمی
اس سارے علاقے میں پھیل گئے ہوں گے۔“
خالد نے کہا۔

”کرم داد! یہاں سے نکلنے میں بھی تو خطرہ ہے۔ یہاں سے نکلنا بھی تو اب محفوظ
نہیں رہا۔“

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اسی ٹیلے والی کوٹھڑی میں ہی اس وقت تک روپوش
رہیں گے جب تک کہ ہاشم ہمیں آکر حالات کے معمول پر آنے یا کشیدگی ذرا کم ہو
جانے کی اطلاع نہیں دیتا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھلایا۔ ہاشم کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا
رہا۔ جب رات گہری ہونے لگی تو وہ دوسرے روز دوپہر کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔



دوسرے روز ہاشم نے آکر بتایا کہ شہر میں فوج گشت کر رہی ہے۔
میں نے فیروز شاہ کے بارے میں پوچھا کہ اس پر تو کسی نے شک نہیں کیا۔ ہاشم
نے بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔

”مگر آپ لوگ ابھی یہاں سے نہ ہی باہر نکلیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ علاقہ بھی فوج
کی نگرانی میں ہے۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”تمہارے خیال میں یہ ہنگامی حالات کب تک رہیں گے؟“

ہاشم بولا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ فوج جگہ جگہ موجود ہے۔ سپلائی سینٹر کے آس پاس کے
علاقے میں کئی گرفتاریاں ہوئی ہیں۔“

ہاشم اپنے ساتھ کھانا بھی لایا تھا۔ خالد نے اسے خبردار کیا کہ وہ ہر طرح سے
چوکس ہو کر آیا کرے۔ وہ کہنے لگا۔

”میں ایک خفیہ راستے سے یہاں آتا ہوں۔ پھر بھی اس بات کی تسلی کر لیتا ہوں

کہ میرا پیچھا نہیں کیا جا رہا۔“

ہم اس ٹیلے پر چار دن تک روپوش رہے۔ پانچویں روز ہاشم آیا تو اس نے یہ
خوش خبری سنائی کہ فوج شہر سے چلی گئی ہے۔ ہم نے بھوپال جانے کی تیاریاں شروع کر

دیں۔ حالات کے معمول پر آنے کے بلوجود ہم جھانسی سٹیشن سے ریل پر سوار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ فوج ضرور شر سے چلی گئی تھی لیکن ہمیں یقین تھا کہ ملٹری اور سول پولیس انٹیلی جنس سٹیشن پر ضرور آنے جانے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہوگی۔

ہاشم نے تجویز پیش کی کہ ہم وہاں سے بھوپال کی طرف ایک سٹیشن تک چلے جائیں۔ وہاں پنجر ٹرین ضرور ٹھہرتی ہے۔ ہم وہاں سے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ خالد کو بھی یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ ہم اسی روز شام کے وقت نیلے سے اتر کر جھانسی سے بھوپال کی جانب جو پہلا سٹیشن آتا تھا اس طرف روانہ ہو گئے۔ ہاشم ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے پستول اسے دے دیئے تھے کہ وہ انہیں اپنے پاس سنبھال کر رکھے۔ صرف کمانڈو چاقو ہمارے پاس تھے۔ ہاشم ہمیں جنگل کے ایک راستے سے لے جا رہا تھا۔ جنگل سے نکلے تو ریلوے لائن آگئی۔ یہاں سے ہم ریلوے ٹریک کے ساتھ چل پڑے۔ دو تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ پھر دور سے سٹیشن کی روشنی دکھائی دی۔ وہاں ہم نے ہاشم کے ذریعے بھوپال تک کے دو ریل کے ٹکٹ منگوائے۔ ہاشم کو رخصت کر دیا اور خود خلی پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ٹرین آئی۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ ہم تھرو کلاس کے الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوں گے۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ سو رہے تھے کچھ جاگ رہے تھے۔ خالد ایک ڈبے میں اور میں دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرین بھوپال کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا کہ میرے سامنے سوائے اس کے اور کوئی مشن نہیں ہے کہ کشمیر کے جلا میں شریک ہو کر مقبوضہ بھارتی فوج کے خلاف حریت پرست کشمیریوں کے شانہ بشانہ جنگ کروں۔ جیلہ کی طرف سے میرا ہوجہ ہلکا ہو چکا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ پاکستان میں اپنے ماں باپ کے گھر پہنچ چکی ہے۔ میں نے یہی سوچا کہ بھوپال پہنچ کر کمانڈو خالد سے مشورہ کروں گا کہ اگر اس علاقے میں کوئی مزید اہم مشن اس کے زیر غور نہیں تو میں مقبوضہ کشمیر چلا جاؤں۔ ٹرین رات کی

تاریکی میں رواں تھی۔ ڈبے کے اکثر مسافر سو رہے تھے۔ میں نے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر مجھے نیند آگئی اور میں بھی سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک سویا رہوں گا کہ ایک دھچکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹرین کسی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ کافی بڑا پلیٹ فارم تھا۔ لوگ اچھے کپڑوں میں نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی بڑا شہر ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ بھوپال آ گیا ہے۔ مگر یہ بھوپال اور جھانسی کے درمیان کوئی اہم شہر تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

میں ڈبے سے اتر کر خالد کے پاس گیا۔ وہ مجھ سے تین چار ڈبے چھوڑ کر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھوپال ابھی کتنی دور ہو گا۔ اس نے بتایا کہ دو اڑھائی گھنٹے میں ہم بھوپال پہنچ جائیں گے۔ پھر اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں پلیٹ فارم پر اس طرح نہ پھروں اور اپنے ڈبے میں جا کر بیٹھوں۔ میں اپنے ڈبے کی طرف آگیا۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں ریلوے کا مال لاوا جا رہا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ ٹرین وہاں کچھ دیر رکے گی۔ میرا چائے پینے کو دل چاہتا تھا مگر وہاں مجھے چائے کا کوئی شال نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے سیکنڈ کلاس ریفرنٹ روم تھا۔ میں نے سوچا کہ وہاں چل کر جلدی سے ایک کپ چائے پیا جائے۔ میں نے احتیاطاً ایک قلی سے پوچھ لیا کہ گاڑی ابھی کتنی دیر تک رکے گی۔ اس نے بتایا کہ گاڑی ابھی کافی دیر ٹھہرے گی۔ میں ریفرنٹ روم میں آ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے دیا۔ ابھی چائے نہیں آئی تھی کہ باہر سے ایک سوٹ بوٹ والا آدمی اندر آگیا۔ جوان مگر دبلا آدمی تھا۔ وہ سیدھا میری میز کے پاس آ کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

میرے ذہن نے کہا کہ یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں بظاہر بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے بھائی صاحب۔ آپ اس طرح مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔“

ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھی کمانڈوز کے بارے میں بتا دو کہ وہ کہاں کہاں روپوش ہیں تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔

سی آئی ڈی والوں کے پاس ہی ایک ہتھکنڈہ ہوتا ہے۔ وہ ہر کمانڈو سے اس قسم کی بات ضرور کرتے ہیں۔ میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

”میرا کسی کمانڈو پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بھوپال میں ہوزری کا کاروبار کرتا ہوں۔ ایک شریف شہری ہوں۔ بھوپال کا ڈپٹی میئر مجھے جانتا ہے۔ آپ اسے بے شک فون کر کے معلوم کر لیں۔

یہ میں نے یونسی بلف چال چلی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”اس کمانڈو چاقو کا ہوزری کے کاروبار سے کیا تعلق ہے؟“

میں نے کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں کہ یہ کہاں سے آگیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری پولیس کے کسی آدمی نے مجھے پھسلنے کے لیے میری جیب میں ڈال دیا ہو۔“

اس نے کہا۔

”میں تمہیں تھانے لے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں تم اپنے آپ سب کچھ بتا دو گے۔“

اس دوران ایک عجیب بات ہو گئی تھی۔ سی آئی ڈی والے اس آدمی سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ہلکے ہلکے دو تین جھٹکے لگے تھے جس سے میں سمجھ گیا تھا کہ میری کاپی پلٹ ہونے والی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی کاپی پلٹ کی بے حد ضرورت تھی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا کسی طرح میں جلدی سے سانپ کا روپ اختیار کر لوں۔

میرے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ جب اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے تھانے لے جا رہا ہے تو مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں اپنا روپ بدلنے والا ہوں۔ اس جگہ میرا انسان سے سانپ کی شکل بدلنا خطرناک تھا۔ وہاں مجھے فوراً ہلاک کر دیا جاتا۔ میں نے سی آئی ڈی والے سے کہا۔

وہ میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

”تم کہاں سے آرہے ہو؟“

میرے منہ سے سے جھانسی نکل گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ریفرشمنٹ روم کے دروازے میں سے دو پولیس والے داخل ہوئے اور سیدھے میری میز کی طرف آ کر ایک میری دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور سختی سے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ سوٹ بوٹ والے آدمی نے ایک سپاہی سے کہا۔

”اس کی تلاشی لو۔“

میرے پاس کمانڈو چاقو موجود تھا۔ میں اسے کہیں پھینک نہیں سکتا تھا۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگوں کو میری تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ایک ذمے دار بھارتی شہری ہوں۔ میں تمہارے خلاف رپورٹ کروں گا۔“

سوٹ بوٹ والے آدمی پر میری اس دھمکی کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ پولیس کے سپاہی پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری تلاشی لینی شروع کر دی۔ کمانڈو چاقو میری جیب سے نکل آیا۔ اسے دیکھ کر سوٹ بوٹ والے آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔

”تم سامنے والی میز پر جا کر بیٹھ جاؤ۔“

دونوں سپاہی ایک میز چھوڑ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں کچھ دوسرے مسافر بھی چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ سوٹ بوٹ والے آدمی نے کمانڈو چاقو کو کھولا۔ پھر بند کیا اور میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

”یہ کمانڈو ٹائف ہے اور تم کشمیری یا پاکستانی کمانڈو ہے۔ اس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ تم انکار نہیں کر سکتے۔ تم اپنے کمانڈو ہونے کا ثبوت اپنی جیب میں لے کر پھر رہے ہو۔ میں نے سپاہیوں کو اس لیے پرے بٹھا دیا ہے کہ میں تم سے

سپاہی کو فرش پر بے حس پڑے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان کا لڑم بھی غائب ہے تو وہ ششدر سے ہو کر رہ گئے۔ سوٹ بوٹ والے نے چیخ کر کہا۔

”کیا ہوا؟ اس کو باہر لے چلو جلدی کرو۔ کمانڈو کہاں غائب ہو گیا۔ باہر دیکھو۔“
اور وہ لوگ افرا تفری کے عالم میں سپاہی کی لاش کو گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ جب ہاتھ روم خالی رہ گیا تو میں نے کموڈ کے پیچھے سے نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ ہاتھ روم کی دیوار پر صرف ایک ہی روشندان تھا جس کا شیشے والا چوکھٹا بند تھا۔ میں تیزی سے دیوار پر رینگتا ہوا روشندان تک گیا۔ دیکھا کہ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چوکھٹا مضبوطی سے بند تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ ہاتھ روم کے باہر شور مچا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور تین چار سپاہی اندر آ کر اوہرا دھر دیکھنے لگے۔ میں واپس کموڈ کے پیچھے جا کر چھپ گیا تھا۔ جس سپاہی کو میں نے دسا تھا اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ کسی کو یہ بتا سکتا کہ مجھے سانپ نے کاٹا ہے اور سانپ ابھی تک ہاتھ روم میں ہی ہے۔ چنانچہ سپاہی سانپ کو نہیں بلکہ کمانڈو کو یعنی مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔
ان میں ایک پولیس افسر ہو گا۔ اس کی آواز آئی۔

”ایئر سٹگ ہیڈ کو آرٹر فوراً“ اطلاع کرو۔ دو آدمی یہاں باہر پہرے پر رہو۔ بلرام! تم میرے ساتھ آؤ۔ جلدی۔“

ہاتھ روم کے باہر پہرہ لگ گیا۔ سب لوگ باہر چلے گئے تھے۔ ایک طرح سے میں اندر بند ہو گیا تھا۔ میں نے بند دروازے کے نیچے سے باہر دیکھا۔ دو سپاہی رانٹھلیں لیے کھڑے تھے۔ ریفرشمنٹ روم میں بھی کافی لوگ بیٹھے تھے۔ تین اس دوران وہاں سے بھوپال کی طرف روانہ ہو گئی ہوئی تھی۔ مجھے کمانڈو خالد کا خیال آ رہا تھا کہ جب بھوپال پہنچنے کے بعد میں اسے کہیں نظر نہیں آؤں گا تو وہ کیا سوچے گا کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی جان کی فکر پڑی تھی۔ مجھے سب سے پہلے اپنی جان بچانی تھی۔ ہاتھ روم کے نیچے اتنی جگہ تھی کہ میں باہر نکل سکتا تھا لیکن ریفرشمنٹ روم میں ایک تو روشنی تھی، دوسرے وہاں کافی لوگ بیٹھے تھے اور پولیس کے سپاہی بھی

”میں ہاتھ روم جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے بے شک پولیس سٹیشن لے چلیں۔“

اس نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ دونوں سپاہی مجھے لے کر ہاتھ روم کی طرف چلے۔ ہاتھ روم سامنے ہی تھا۔ ایک سپاہی ہاتھ روم کے باہر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا گن لے کر میرے ساتھ اندر آ گیا۔ مجھے برابر جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے سپاہی سے کہا۔
”تم بھی باہر چلے جاؤ۔ میں یہاں سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔“
وہ بولا۔

”میں اسی جگہ رہوں گا۔“

مجھے صرف یہ خطرہ تھا کہ اس کے پاس رائفل تھی۔ اگر میں وہاں سانپ کے روپ میں ظاہر ہو گیا اور ایک آدمی کو سانپ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر اگر اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تو مجھ پر ضرور فائرنگ شروع کر دے گا اور بند ہاتھ روم میں میرے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ مگر وہ باہر نہ گیا اور میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ پھر اچانک میں جیسے اپنے جسم سے الگ ہو گیا۔

جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں میری بجائے ایک سانپ فرش پر بیٹھا تھا۔ پہلے تو سپاہی سمجھا کہ میں غائب ہو گیا ہوں۔ جب اس نے وہاں ایک سانپ کو دیکھا تو ڈر کر اٹلے پاؤں دروازے کی طرف دو چار قدم ہٹا اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کر لی اور مجھ پر فائر کر دیا۔ لیکن اتنی دیر میں اس کے پیچھے آچکا تھا۔ میں نے فوراً اچھل کر اس کی ران پر ڈس دیا اور اس کی وردی کے ساتھ ہی چٹا رہا۔ سپاہی نے گھبرا کر چیخ ماری اور گر پڑا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی مجھے ہاتھ روم کی طرف لوگوں کے دوڑنے کی آواز آئی تھی۔ سپاہی گرا تو میں چھلانگ لگا کر کموڈ کے پیچھے چھپ گیا۔ ہاتھ روم کا دروازہ دھڑک سے کھل گیا۔

”کیا ہوا بھولا رانم؟“

یہ وہی سوٹ بوٹ والا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا سپاہی بھی تھا۔ انہوں نے

رائظین لیے کھڑے تھے۔ میں باہر نکل کر اگر تیز سے تیز بھی بھاگوں تو اتنی تیز نہیں رہ سکنا تھا۔ ریفرشمنٹ روم کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے پہلے میرا ہلاک ہو جانا یقینی تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ میں کسی طرح ریفرشمنٹ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں تب بھی لوگوں نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ وہاں تو سناپ سناپ کا شور مچ جاتا اور پلیٹ فارم پر کافی روشنی تھی۔ کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی کہ میں جہاں چھپ کر جان بچا سکوں۔ میں نے ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ ابھی مجھے ہاتھ روم میں ہی چھپے رہنا چاہیے۔ جب پولیس واپس چلی جائے اور ریفرشمنٹ روم بھی خالی ہو جائے تو میں باہر نکلنے کی کوشش کروں گا۔

ہاتھ روم میں مجھے کموڈ کے پیچھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چھپنے کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ چنانچہ میں وہیں دیک کر بیٹھا رہا۔ کچھ وقت گزر گیا۔ میں کموڈ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ پھر دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ کوئی دروازے کی چٹخنی لگا رہا تھا۔ میں نے سر ذرا سا آگے کر کے دیکھا کہ ایک آدمی اندر آیا ہے جس کے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ ہے۔ بھاری بھر کم اوپر عمر کا آدمی تھا۔ صحت بڑی اچھی تھی، سلک کی قمیض اور سفید دھوتی میں ملبوس تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ پان بھی کھا رہا تھا۔ اس نے بیگ منہ ہاتھ دھونے والے سنک کے قریب فرش پر رکھ دیا۔ کموڈ میں پان کی پیک تھوکی اور جیب سے چھوٹی سی کنکھی نکال کر آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں پھیرنے لگا۔ وہ کوئی فلمی گیت بھی گنگنا رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا آگے پیچھے ہل بھی رہا تھا جیسے ہلکے ہلکے سرور میں ہو۔ میں کموڈ کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں اسی آدمی کے بیگ کے ساتھ نیچے چمٹ جاؤں تو اس کے ساتھ ہاتھ روم کی قید سے نکل سکتا ہوں۔

اتنے میں اس آدمی نے بیگ کو کھول کر اس میں سے شراب کی بوتلی نکالی اور منہ کے ساتھ لگا کر ہلکے ہلکے گھونٹ بھرنے لگا۔ بیگ کا منہ کھلا دیکھ کر فوراً ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔ میں آہستہ سے ریٹکنا ہوا چمڑے کے بیگ کے قریب آ گیا۔ وہ

آدمی بڑے مزے سے شراب کی چسکیں لگا رہا تھا اور گنگنا بھی رہا تھا اور ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس کے پاؤں میں بیگ کے پاس تھا۔ میں بغیر کچھ سوچے کچھ جلدی سے بیگ پر چڑھ گیا اور پھر بیگ کے اندر گھس گیا۔ بیگ میں طرح طرح کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ میں ان کے نیچے گھس کر چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے بوتلی بند کی اور اسے اپنے چمڑے کے بیگ میں ڈال کر بیگ کا زپ کھینچ کر اسے بند کر دیا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ بیگ کو زپ لگی ہوئی ہے۔ اب میں اس شخص کی صوابدید پر تھا کہ جب وہ دوبارہ زپ کو کھولے گا تو میں باہر نکل سکتا تھا۔ اگر بیگ کو زپ نہ لگی ہوتی تو جب وہ ہاتھ روم سے باہر جاتا کسی بھی جگہ مناسب موقع دیکھ کر بیگ میں سے رینگ کر باہر چلا نکل لگا سکتا تھا۔ مگر زپ کے بند ہو جانے سے میں ہاتھ روم کی قید سے نکل کر چمڑے کے بیگ کی حالات میں پھنس گیا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس آدمی نے بیگ اٹھالیا ہے اور ہاتھ روم سے باہر نکل آیا ہے۔ باہر آ کر اس نے بیگ کو دوبارہ ایک جگہ پر رکھ دیا۔ مجھے ریفرشمنٹ روم میں لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ باہر پلیٹ فارم پر سے بھی آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی انجن شمنٹ کرتا اور سٹی بجاتا تیزی سے پلیٹ فارم کی لائن پر سے گزر گیا۔ اس کے بعد بھاری بوٹوں کی آواز آئی جو تیز تیز میرے قریب سے گزر گئی۔ لگتا تھا پولیس کے سپاہی ہیں۔ وہ شاید ہاتھ روم میں گئے تھے۔ واپس تیز تیز قدموں سے میرے قریب سے ہو کر باہر چلے گئے، میں بیگ کے اندر مختلف چیزوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ پولیس سے توجہ گیا ہوں اب خدا جانے قسمت مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ جس آدمی کا بیگ تھا اس کے فلمی گیت گنگنانے کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ اخبار کا صفحہ پلٹنے کی آواز بھی آئی۔ شاید وہ اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر شور ہونے لگا۔ پھر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس آدمی نے بیگ کو اٹھالیا اور باہر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ کچھ دیر وہ بیگ اٹھائے ادھر ادھر چلتا رہا۔ جیسے ڈبے میں بیٹھنے کے

لے جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ آخر ایک جگہ اس نے بیگ رکھ دیا۔ شاید وہ ڈبے میں بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے مسافروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ٹرین دیر تک کھڑی رہی۔ پھر انجن نے وسل بجلیا۔ گارڈ نے سیٹی دی اور چمک چمک کرتی گاڑی چل پڑی۔ یہ گاڑی شمال کی طرف جا رہی تھی یا جنوب کی طرف؟ مغرب کی طرف جا رہی تھی یا مشرق کی طرف؟ جھانسی کی طرف جا رہی تھی یا بھوپال کی طرف؟ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں چڑے کے بیگ میں بند تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ ٹرین سٹیشن سے باہر نکل گئی اور اب یارڈ کی مختلف پٹریوں پر سے گزرگراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کے بعد ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں زمان و مکان وقت اور خلا کے درمیان معلق ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے احساس رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اس کے بعد سارے اندازے اور قیاس ختم ہو گئے۔ ٹرین کی آواز تھی اور اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کبھی ٹرین کے پیروں کا شور دیر تک سنائی دیتا۔ کبھی ٹرین کسی جگہ رک جاتی۔ اس کے بعد پھر چل پڑی۔ خدا جانے رات تھی کہ دن تھا، شام تھی کہ دوپہر تھی۔ ٹرین چلتی رہی، رکتی رہی اور پھر چلتی رہی۔ بیگ کا مالک خدا جانے بھارت کے کس دور دراز شہر کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے ابھی تک وہ بیگ نہیں اٹھایا تھا جس میں میں بند تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شراب کی چسکی لگانے کے لیے بھی بیگ کھول کر بوتل نہیں نکالی تھی۔ آخر خدا نے مجھے ٹرین کے مسلسل شور سے نجات دلانے کی میری دعا قبول فرمائی۔ ایک جگہ ٹرین رکی تو میرا بیگ اس آدمی نے اٹھالیا اور ڈبے سے اتر پڑا۔

مجھے اس کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

وہ شاید سٹیشن سے باہر آ گیا تھا۔ یہاں مختلف کاروں، رکشوں اور ٹانگوں اور لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کسی نے قریب سے کہا۔

”چونی رام جی! ادھر آ جاؤ۔ میں گاڑی لے آیا ہوں۔“

بیگ کے مالک کا نام چونی رام تھا۔ اس نے کہا۔

”ابے بھوانی کو کیا حال ہے بے تیرا؟“
”ٹھیک ہوں مالک۔“

پھر موٹر گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور بیگ اندر سیٹ پر رکھ دیا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ بیگ کا مالک چونی رام مجھے محسوس ہوا میرے پاس ہی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔ موٹر سٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ میں عجیب تجسس میں پھنس چکا تھا۔ نہ یہ پتہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، نہ یہ پتہ تھا کہ یہ کون سا شہر ہے، نہ یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

میں چونکہ سانپ کے روپ میں تھا اس لیے قدرتی طور پر میری سوتکھنے اور سننے کی حس بہت تیز ہو گئی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سانپ بڑی دور سے آواز بھی سن لیتا ہے اور بو بھی سونگھ لیتا ہے۔ چڑے کے بیگ کے اندر شراب، ڈبیل، پرنیوم، پان کے خوشبودار تمباکو اور کپڑوں میں رکھے ہوئے فرائل کی گولیوں، نوٹھ پیٹ اور شیونگ کریم کی بوتلیں ملی جلی تھیں۔ مگر ان میں اب ایک اور خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ خوشبو ناگن درگا کی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی خیال کیا کہ یہ میرا وہم ہے۔ بھلا ناگن درگا یہاں کہاں ہوگی۔ مگر جب یہ خوشبو جو ہلکی ہلکی تھی مسلسل بڑھتی چلی گئی تو مجھے یقین ہو گیا یہ ناگن درگا ہی کی خوشبو ہے۔ یہ ناگن درگا سانپ کی خوشبو نہیں تھی بلکہ ناگن درگا کے عورت کے جسم کی خوشبو تھی۔

مجھے یاد آ گیا کہ جب میں بھوپال کے بھیروں کے مندر میں ناگن درگا کی کوٹھڑی میں اس سے ملنے گیا تھا تو کوٹھڑی خالی تھی مگر کوٹھڑی کے ایک کونے میں سے سانپ کی بڑی تیز بو آرہی تھی۔ حالانکہ میں ناگن درگا کو عورت کی شکل میں وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ ٹرین کے مسلسل سفر سے صاف ظاہر تھا کہ میں جھانسی اور بھوپال کے شمال یا جنوب یا مشرق یا مغرب کی سمت کسی دور دراز شہر میں آ گیا ہوں۔ حیران تھا کہ ناگن درگا یہاں کیسے پہنچ گئی ہے۔ ضرور اسے کوئی بھیروں مندر سے اغوا کر کے لے آیا

ہے۔ کیونکہ وہ مجھ سے ملے بغیر وہاں سے نہیں جاسکتی تھی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ یہ بھیروں دیوتا کی بددعا کا اثر ہوگا۔ ناگن درگا پر ضرور کوئی بھاری مشکل آن پڑی ہے۔ اب جیسے ناگن درگا کے جسم کی خوشبو تیز ہو رہی تھی۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں اس کے قریب سے قریب تر ہو رہا ہوں۔ موڑ کار جن سڑکوں پر سے گزر رہی تھی ان پر ٹنٹک کا کافی شور تھا۔ آہستہ آہستہ گاڑی ایسے علاقے میں داخل ہو گئی جہاں ٹنٹک کا شور بالکل ختم ہو گیا۔ صرف اس گاڑی کے انجن کی آواز آرہی تھی جس میں چوٹی رام سوار تھا اور اس کا چڑے کا بیگ تھا اور جس بیگ میں میں بند تھا۔ دیر کے بعد کوئی گاڑی قریب سے گزر جاتی۔ اب ایسا لگا کہ موڑ کار کی سڑک سے اتر کر کسی خراب سڑک پر چلنے لگی ہے۔ گاڑی بار بار تھوڑا تھوڑا اچھل رہی تھی۔ ڈرائیور بڑی دیر بعد بولا۔

”چوٹی رام جی! کچھ کام بنا؟“

چوٹی رام یعنی میرے بیگ کے مالک نے نیند بھری آواز میں کہا۔
”مجھے سونے دے بھوانی۔“

معلوم ہوا کہ چوٹی رام سو رہا تھا۔ بھوانی یعنی ڈرائیور نے کہا۔
”مہاراج! اپنا راج بھون آرہا ہے۔“

چوٹی رام نے جھنجھلا کر کہا۔

”اے آتا ہے تو آنے دے۔“

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ گاڑی کچے مہموار رستے پر سے اچھل اچھل کر گزرتی ایک طرف کو گھوم گئی۔ وہ ایک بار اور گھومی اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ چوٹی رام نے میرے والا بیگ اٹھاتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

”چند رانی سے کہہ دینا میں واپس آ گیا ہوں۔“

”کہہ دوں گا۔“

یہاں ناگن درگا کی خوشبو بڑی تیز ہو گئی تھی۔ میرا بیگ اٹھا لیا گیا۔ چوٹی رام یعنی

بیگ کا مالک چل رہا تھا۔ پھر جیسے وہ تین چار میڑھیاں چڑھ کر کسی برآمدے میں داخل ہو گیا۔ اس نے کھنٹی کاٹن دبا دیا تھا۔ مجھے کسی کمرے کے اندر سے کھنٹی کی مدھم آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ چوٹی رام کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ ناگن درگا کے انسانی یعنی عورت کے جسم کی خوشبو کے تیز جھونکے محسوس ہونے لگے تھے۔ کسی عورت نے بے رام جی کی کہا۔ چوٹی رام نے پوچھا۔

”رانی جی کہاں ہیں؟“

عورت کی آواز آئی۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔ ابھی انہیں چائے دے کر آرہی ہوں۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو یہ صبح کا وقت ہے اور یہاں ناشتہ کیا جا رہا ہے یا شام کا وقت ہے اور یہ رانی جی جو کوئی بھی ہے شام کی چائے پیا رہی ہے۔ مگر میں اس بات پر سخت حیران تھا کہ ناگن درگا یہاں کہاں سے آ گئی ہے۔ پھر خیال آتا کہ ہو سکتا ہے یہ ناگن درگا کے کوئی رشتے دار ہوں۔ وہ مجھ سے مایوس ہو کر بھیروں کے مندر سے یہاں آ گئی ہو۔ مگر وہ مجھ سے کیسے مایوس ہو سکتی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے تو مجھے جاتے وقت کہا تھا کہ کرم داد جلدی واپس آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گی۔

عجیب معمہ بن گیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ چوٹی رام کمرے میں سے گزر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا بنگلہ ہے۔ پھر وہ لکڑی کی میڑھیاں چڑھنے لگا۔ میڑھیوں کے کسی وقت چڑھانے کی آواز آرہی تھی۔ میڑھیاں ختم ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ چوٹی رام کسی گیلری میں سے گزر رہا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ گیلری کے فرش پر قالین بچھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک جگہ رک گیا۔ یہاں اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر کہا۔

”رانی جی! میں ہوں چوٹی رام۔“

کمرے کے اندر سے تان پورے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ یہ آواز رک گئی۔

کسی نے دروازہ کھولا اور کہا۔

”رانی جی چائے کی میز پر بیٹھی ہیں، آجائیں۔“

چونی رام کمرے میں داخل ہو گیا۔ فضا ناگن درگا کے جسم کی خوشبو سے لبریز تھی۔ جس بیک میں میں بند تھا ایک طرف رکھ دیا گیا۔ پھر ایک عورت کی بڑی دلکش مگر باوقار آواز سنائی دی۔

”چونی رام! تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟“

چونی رام نے کہا۔

”رانی جی! موہن بابو تھائی لینڈ گیا ہوا تھا۔ مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ آیا تو مال اس کے حوالے کیا۔“

”چیک لائے ہو؟“ رانی جی نے پوچھا۔

چونی رام نے کہا۔

”جی ہاں۔“

”پوری رقم دی ہے یا اس حرای نے؟“

چونی رام نے کہا۔

”جی ہاں رانی جی! اس بار میں پوری رقم لایا ہوں۔ یہ لیجئے، ڈھائی لاکھ روپے کا چیک ہے۔“

”ہوں۔“ رانی جی کی آواز سنائی دی۔ ”تم بڑے وقت پر آئے ہو۔ دھام پور کا جاگیردار کل نئی لڑکی کا بھرا سننے آ رہا ہے۔ اس کو تھوڑا تیار کر دو۔“

چونی رام بولا۔

”مگر رانی جی اس نئی لڑکی کو تو گانا بالکل ہی نہیں آتہ بڑی مشکل سے اسے دو چار دنوں میں بھرے کے دو تین توڑے سکھائے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کا گانا رہنے دیں۔ جاگیردار کو دو چار بھرے کے توڑے دکھا دیں۔ یہ میں کچے کر ادوں گا۔ جاگیردار اسی میں خوش ہو جائے گا۔ دیے لڑکی جوان ہے، خوبصورت ہے۔ جاگیردار کو

اس کے گانے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

رانی جی کی آواز آئی۔

”مگر میں اتنی جلدی یہ نئی لڑکی اس حرای جاگیردار کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو ایک رات کے لیے بھی لڑکی اس کے کمرے میں نہیں بھیجوں گی۔“

چونی رام نے کہا۔

”رانی جی! اگر وہ موٹی رقم دیتا ہے تو ایک رات میں لڑکی کا کیا بگڑ جائے گا؟“

رانی جی نے کہا۔

”لڑکی کا تو کچھ نہیں جائے گا مگر ہمارا بھرم جاتا رہے گا۔ رانی بائی نے کبھی پہلی بار کوئی لڑکی اتنی جلدی کسی جاگیردار یا سینہ کے حوالے نہیں کی۔ بھگوان نے بیٹھے بٹھائے بڑی خوش شکل جوان لڑکی بھیج دی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ جس روز تم لوگ اسے بھیروں جی کے مندر سے اٹھا کر لائے ہو اس کے دوسرے روز ہی وہ ہم سے اس طرح راضی خوش ہو گئی جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی کہ کوئی اسے اٹھا کر یہاں لے آئے۔“

چونی رام کہنے لگا۔

”رانی بائی! بات یہ ہے کہ لڑکی کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی لڑکی آزاد طبیعت کی ہے اور گانے بجانے اور ڈانس بھرے کو بہت پسند کرتی ہے۔“

رانی بائی بولی۔

”میں تو اس لڑکی کو اپنی رانی بنا کر رکھوں گی۔ کسی کے آگے ہرگز نہیں بیچوں گی چاہے مجھے کوئی دس لاکھ روپے ہی کیوں نہ دے۔ یہاں اسے رکھ کر دولت کمائوں گی۔ بس تم اسے ڈھنگ کا بھرا اور ٹھمری انگ کی دو چار چیزیں پکی کرا دو۔“

”وہ میں کرا دوں گا۔“ چونی رام نے کہا۔

تین پورے کی آواز آنے لگی پھر رک گئی۔ رانی بائی نے کہا۔

”چونی رام! اسے لے جا کر سر کر دو، بے سرا ہو رہا ہے اور سنو! لڑکی اپنے کمرے

میں ہی ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور ابھی سے ٹھہری کی استھائی سکھانی شروع کر دو۔ کل دھام پور کا جاگیردار آ رہا ہے۔ مجرا تو وہ تھوڑا بہت کر لے گی۔ ایک آدھ استھائی ٹھہری کی بھی سکھا دو۔ لڑکی کو خود بھی یہ سب کچھ سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔“

چونی رام نے کہا۔

”رائی بائی! آپ اسے بار بار لڑکی کہہ کر کیوں بلاتی ہیں۔ آپ نے خود ہی تو اس کا نام پیار سے چندا رکھا ہے۔ چندا کہہ کر بلائیں۔“

رائی بائی کی آواز آئی۔

”چند تو اس نے خود ہی اپنی پسند کا نام رکھا تھا۔ میں اسے چندا ہی کہوں گی، اب تم اس کے پاس جاؤ اور تھوڑا بہت ریاض کراؤ۔“

”جاتا ہوں۔“

جس بیگ میں بند تھا جب اسے اٹھایا گیا تو میں سمجھ گیا کہ چونی رام ناگن درگا کے کمرے میں جا رہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں وہ میں نے سب کی سب سن لی تھیں۔ اب اس میں کوئی شک شے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ جس لڑکی کو یہ لوگ بھیروں جی کے مندر سے اٹھا کر لائے ہیں اور جس کا نام چندا رکھا گیا ہے وہ ناگن درگا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مجھے صرف اس بات کی حیرانی تھی کہ ناگن درگا نے اس ماحول کو اتنی جلدی اور خوشی کے ساتھ کس طرح قبول کر لیا ہے۔ کہیں یہ بھیروں دیوتا کی بد دعا کا اثر تو نہیں تھا؟ ہو سکتا ہے اس منحوس دیوتا کی بد دعا سے ناگن درگا کا ذہن ہی بدل گیا ہو۔ چونکہ ناگن درگا ایک کٹر برہمن ہندو لڑکی تھی اور اس قسم کے توہمات پر اس کا گہرا یقین تھا اس لیے اس پر دیوتاؤں کی بد دعا کا اثر ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ناگن درگا کی نفسیات نے بد دعا کے اثر کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اگر وہ مسلمان ہوتی اور اس کا صرف ایک خدا پر ایمان ہوتا تو بھیروں دیوتا کی بد دعا کا اس پر کبھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

چونی رام کسی کمرے میں داخل ہو چکا تھا جہاں سے ناگن درگا کی خوشبو بہت

قریب سے آنے لگی تھی۔ اس کمرے میں کسی اعلیٰ انگریزی پرفیوم کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چونی رام نے بیگ ایک جگہ رکھ دیا اور کہا۔

”چندا رائی! کیسی ہو؟ آج تو تم بڑی پیاری لگ رہی ہو۔ بھگوان نے تمہیں بڑا روپ دیا ہے۔“

تب مجھے ناگن درگا کی آواز آئی۔

”آپ نے اتنی دیر کہاں لگا دی انکل جی؟“

چونی رام نے کہا۔

”بس کیا بتاؤں چندا۔ بڑے ضروری کام سے گیا تھا۔ تم بتاؤ میں نے تمہیں ڈانس کا جو توڑا سکھایا تھا اس کی مشق کی ہے؟“

ناگن درگا نے کہا۔

”کی ہے انکل۔ تھکھو و مگھوا کر ابھی ڈانس کر کے دکھاتی ہوں۔“

چونی رام نے کہا۔

”یہ بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تم ایسا کرو کہ ٹھہری کی ایک استھائی میرے ساتھ گلاؤ، یہ بہت ضروری ہے۔ ارے میں تو یہ بھول ہی گیا۔ تمہارے لیے میں حنا کا عطر لایا ہوں۔ لکھنؤ گیا تھا وہاں سے خریدا ہے۔“

چونی رام نے بیگ کا زپ کھول دیا۔ میں بیگ کے کونے میں کپڑوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ چونی رام نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر عطر کی ڈبی نکالی اور بیگ کا زپ بند کیے بغیر چلا گیا۔ مجھے زپ بند کرنے کی آواز نہ آئی تو میں آہستہ آہستہ بیگ کر اوپر آ گیا اور کھلے بیگ کی ایک جانب سے سر نکال کر دیکھا۔ کمرہ بڑے شاندار طریقے سے قالینوں اور ریشمی پردوں سے سجا ہوا تھا۔ تخت پر بھی قالین بچھے تھے۔ سفید گلاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تخت پر ناگن درگا سبز ریشمی ساڑھی میں لمبوس، سونے کے زیورات پہنے بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کی ایک جانب تانپورہ اور ہارمونیم پڑا تھا۔ تخت کے پیچھے کمرے کا دروازہ تھا جو باہر ایک ٹیرس میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹیرس میں

آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ پس منظر میں درختوں کا منظر تھا۔ آسمان پر غروب ہوتے سورج کی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ چونی رام نے عطر کا پیکٹ ناگن درگا کو دیا۔ اس نے پیکٹ لے لیا اور کہا۔

”شکریہ اٹکل جی۔ اب مجھے استھائی سکھانی شروع کر دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی دھنتی ملا کی طرح ڈانس کروں اور اختری بائی فیض آبادی کی طرح ٹھمری گاؤں۔“

چونی رام مسکراتے ہوئے ہارمونیم لے کر ناگن درگا کے پاس تخت پر بیٹھ گیا اور ہارمونیم کھول کر اس کے سروں پر آہستہ آہستہ انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

”چندا رانی! بھگوان نے چاہا اور تم نے پورا پورا ریاض کیا تو دیکھ لینا ایک دن تم دھنتی ملا اور اختری بائی سے آگے نکل جاؤ گی۔ اب میرے ساتھ استھائی گاؤں۔“

کمرے کی فضا ہارمونیم کی دھیمی دھیمی آواز سے بھر گئی۔ چونی رام نے کسی ٹھمری کی استھائی گانی شروع کر دی۔ ناگن درگا اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر ناگن درگا کو دیکھ رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ناگن درگا ہے جس کو میں بھیروں جی کے مندر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ سبز ریشمی ساڑھی اور سونے کے زیورات کے ساتھ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تک یہ گانا ہوتا رہا۔ چونی رام نے ہارمونیم بند کرتے ہوئے کہا۔

”چندا جی! مجھے پورا دشا اس ہے کہ اگر اسی طرح تم نے دو چار دن ریاض کیا تو تم بہت اچھی ٹھمری گانے لگو گی۔“

ناگن درگا بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

”اٹکل جی! اب میرے ڈانس کے بھی دو ایک توڑے دیکھ لیں۔ میں روز دو گھنٹے ریاض کرتی تھی۔“

اس نے کسی عورت کا نام لے کر آواز دی۔

”شانتی! میرے ٹھنکھرو لانا۔“

چونی رام ہارمونیم بند کر چکا تھا۔ کہنے لگا۔

”ہاں۔ یہ کام بھی اسی وقت ہو جانا چاہیے۔ کل دھام پور کا جاگیردار تمہارا ڈانس دیکھنے آ رہا ہے۔ مجھے پورا دشا اس ہے کہ جو دو تین مجرے کے توڑے میں نے تمہیں سکھائے ہیں انہیں دیکھ کر وہ تمہارا دیوانہ ہو جائے گا۔“

”اٹکل جی! آپ کوئی چٹا نہ کریں‘ مجھے جتنا بھی ڈانس آپ نے سکھایا ہے اس کو اس طرح سے ادا کروں گی کہ جاگیردار اچھل اچھل پڑے گا۔“

چونی رام نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

”جیتی رہو چندا رانی! جیتی رہو۔“

مازمہ لڑکی شانتی ٹھنکھرو لے کر آگئی۔ چونی رام نے ہارمونیم کو دوبارہ کھولا اور اس کے سر چھیڑنے شروع کر دیے۔ ناگن درگا پاؤں میں ٹھنکھرو باندھنے لگی۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا کہ یہ اس کی کیسی کلیا پلٹ ہو گئی ہے۔ ٹھنکھرو باندھنے کے بعد وہ تخت سے اتر کر قالین پر آگئی۔ اس نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے ساتھ کس کر باندھا اور رقص کا پوز بنایا۔ چونی رام نے ڈانس کی دھن چھیڑ دی اور ساتھ ہی منہ سے ڈانس کے بول بولنے لگا۔

ناگن درگا نے رقص شروع کر دیا۔ وہ اس طرح رقص کر رہی تھی جیسے پیدائشی ڈانسر ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی رقص کرتے کرتے گھوم جاتی، کبھی آگے کو جھکتی، کبھی ایک دم سر کو پیچھے لے جاتی اور آنکھوں سے اشارے کرنے لگتی۔ وہ کوئی دس پندرہ منٹ تک رقص کرتی رہی۔ پھر ایک توڑا پورا کر کے فہس کر بولی۔

”اٹکل جی! میں نے سب ٹھیک کیا ہے نا؟ بے تمل تو نہیں ہوئی؟“

چونی رام نے ہارمونیم کی پیٹی بند کرتے ہوئے کہا۔

”ہیو چندا رانی! میں نے دنوں میں ہی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اگر اس طرح ریاض جاری رہا تو تم ایک مہینے میں دھنتی ملا کو پیچھے چھوڑ جاؤ گی۔ اب تم آرام کرو‘ میں چتا ہوں۔ ابھی میں گھر بھی نہیں گیا۔ رات کو آؤں گا۔ ٹھمری کی دو ایک

اگر کسی وقت جا کر اس پر بد دعا کا اثر ختم ہو گیا تو اسے اپنی بربادی اور تباہ حال زندگی کا احساس ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ ناگن درگا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور خود کشی کر لے۔ ناگن درگا کے مجھ پر ایک دو بڑے اہم احسان تھے۔ اس نے میری ایسے وقت میں مدد کی تھی جب موت کا ہاتھ میری شہ رگ تک پہنچ چکا تھا۔ اس اعتبار سے بھی میرا فرض بنتا تھا کہ میں ناگن درگا کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لوں۔ کیونکہ وہ جو کچھ کر رہی تھی ایک طرح سے غم شدہ یادداشت کے تحت کر رہی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ناگن درگا ہے اور یہاں اسے پیشہ ور طوائف بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب بد دعا کا اثر تھا۔

ملازمہ شانتی جوس کا بلوریں گلاس ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ ناگن درگا نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”رانی بانی کیا کر رہی ہیں؟“

شانتی نے کہا۔

”بانی جی نے کہا ہے کہ وہ چائے آپ کے ساتھ ہی آکر بیٹھیں گی۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”رانی بانی سے کہنا کہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ میں ان کا انتظار کروں گی۔“

شانتی چلی گئی۔ ناگن درگا جوس کا گلاس لے کر تخت سے اٹھی اور باہر ٹیرس میں چلی گئی۔ وہ ٹیرس میں کھڑی ہو گئی۔ باہر درختوں پر رات کا اندھیرا تر رہا تھا۔ ٹیرس کی جی جل رہی تھی۔ شاید وہ شام کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہی تھی۔ باہر کھڑے ہو کر ہی اس نے جوس پیا۔ وہیں میز پر گلاس رکھا اور اپنے بالوں کو سنوارتے ہوئے کمرے میں آکر سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئی اور ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر ٹی وی اون کر دیا۔ ٹی وی پر فلمی گانے اور ڈانس ہو رہے تھے۔ تپائی پر سگریٹ کہیں پڑا تھا۔ ناگن درگا نے اس میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور مزے سے پینے لگی۔ میں اور بھی حیران ہوا۔ اس نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اب وہ ایک پیشہ ور طوائف کی

رہرہ سلیس کرا دوں گا۔“

میں نے اس دوران دیکھ لیا تھا کہ جس بیک میں میں چھپا ہوا تھا وہ گولڈن کاؤچ کی جانب رکھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے بیک میں سے نکل کر کاؤچ کے نیچے چھپ گیا۔ چوٹی رام اٹھ کر آیا۔ اس نے بیک اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب کمرے میں میں اور ناگن درگا دونوں اکیلے تھے۔ میں انسانی آواز میں بات کر سکتا تھا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ ناگن درگا کا ذہن بالکل بدل چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے نہ پہچانے۔ ہو سکتا ہے ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بات کرتے دیکھ کر وہ شور مچا دے اور نوکر چاکر وہاں آ جائیں اور میرے پیچھے ڈانگ سوٹے لے کر مجھے مارنے کو دوڑ پڑیں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

ناگن درگا نے پاؤں بے گھٹکھڑ کھول کر ایک طرف رکھ دیے تھے اور ریشمی رومال سے اپنے چہرے پر آیا ہوا پسینہ بڑی احتیاط کے ساتھ پونچھ رہی تھی کہ اس کا میک اپ خراب نہ ہو۔ اس نے شانتی کو آواز دی۔ ملازمہ شانتی آگئی۔

”جی بی بی جی۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”میرے لیے مسمی جوس لے آؤ۔“

ملازمہ شانتی چلی گئی۔ ناگن بڑے آرام سے تخت پر بیٹھ گئی اور ہارمونیم کھول کر اس کے سروں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے ٹھمری کی استھانی گنگٹانے لگی۔ اس دوران میں یہی سوچتا رہا کہ ناگن درگا پر اپنا آپ ظاہر کروں یا نہ کروں۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ اسے منحوس دیوتا بھیدوں کی بد دعا لگ چکی ہے اور اگر حالات میں کسی قسم کی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی تو دو تین مہینوں میں ناگن درگا ایک پیشہ ور طوائف بن جائے گی اور ٹائیکہ رانی بانی کی چاندی ہی چاندی ہوگی۔ وہ اسے علاقے کے بڑے بڑے جاگیرداروں، سیٹھوں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو پیش کر کے ان سے ہزاروں روپے کمانے لگے گی اور یوں ناگن درگا کی زندگی بربادی اور تباہی کے راستے پر پڑ جائے گی۔

طرح سگریٹ پی رہی تھی۔ مجھے بھیروں دیوتا پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ناگن درگا سے برا خوفناک انتقام لیا تھا۔

رانی بائی ساڑھی کو سنبھالتی سگریٹ پیتی کمرے میں داخل ہوئی تو ناگن درگا نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ رانی بائی نے آگے بڑھ کر ناگن درگا کا ہاتھ چوم لیا اور بلائیں لے کر بولی۔

”جینو چندا رانی! ہزار برس تک جینو تم سبز ساڑھی میں بالکل آکاش کی اسپر اگل رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔“

”یہ سب آپ کی دیا ہے رانی بائی۔“

ناگن درگا کو ٹائیکہ رانی بائی نے اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا اور پوچھا۔

”چونی رام نے ٹھمری کی استھانی کا ریاض کرا دیا تھا۔“

ناگن درگا بولی۔

”جی ہاں میں نے ٹھمری پوری طرح سے یاد کر لی ہے، سناؤ۔“

”اس کی ضرورت نہیں بنی۔ کل بھی ریاض کرتا۔ کل رات کو جاگیردار آ رہا ہے۔ بس اسے کسی طرح خوش کر دینا۔ مجھے کا بھی ریاض کر لینا تھا؟“

”ہاں رانی بائی، چونی جی تو میرا مجرا دیکھ کر اور ٹھمری من کر بہت خوش ہوئے تھے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“ رانی بائی نے سگریٹ الٹش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ملازمہ شامی چائے لے کر آگئی۔ اس نے چائے بنا کر رانی بائی اور ناگن درگا کو دی۔ جب ملازمہ چلی گئی تو رانی بائی نے ناگن درگا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”چندا! دھام پور کا جاگیردار نیا آدمی ہے، دولت مند بہت ہے۔ رات کو میں اسے تمہارے پاس کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی بہت شراب بھی پیئے اور ایک حد سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کرے۔ تم اسے وہیں روک لینا اور ہرگز ہرگز حد سے آگے نہ بڑھنے دینا۔“

ناگن درگا نے بڑی تجربہ کار طوائف کے انداز میں کہا۔

”رانی بائی! آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سنبھال لوں گی اور حد سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔“

”شلباش۔“ رانی بائی نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ سختی سے بھی پیش نہ آنا۔ بہت موٹا شکار ہے۔ میں اسے ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتی۔ بس ادھر ادھر کی باتوں اور چوما چٹائی سے اس کو اپنے قابو میں رکھنا۔“

ناگن درگا ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

”آپ کیوں چٹا کرتی ہیں رانی بائی۔ جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔“

رانی بائی نے اپنے پرس میں سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر ناگن درگا کو دیے اور کہا۔

”چندا رانی یہ تم اپنے پاس رکھو تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مارکیٹ سے منگوا لینا۔ اب تم تھوڑی دیر آرام کرو۔ آج میں نے خاص طور پر تمہارے لیے رام پور کی بریانی بکوائی ہے، ساتھ بنگالی رس گلے بھی بنوائے ہیں۔ رات کو چونی رام بھی یہیں کھانا کھائے گا۔“

یہ کہہ کر رانی بائی چلی گئی۔ ناگن درگا صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ میں سامنے والے کاؤچ کے نیچے ایک طرف چھپ کر بیٹھا یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ میرے دل میں کئی بار خیال آیا کہ ناگن درگا کے سامنے آ جاؤں اور اس پر اپنا آپ ظاہر کر دوں لیکن اس ڈر کے مارے باہر نہ نکلا کہ ناگن درگا نے اگر مجھے نہ پہچانا تو وہ سنپ کو دیکھ کر شور مچا دے گی اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ جبکہ میں وہاں رہ کر ناگن درگا کی گھرائی بلکہ خبر گیری بھی کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ایک طرح سے اس کا جال کسی ایسی عورت کا تھا جس کو پٹاٹاٹا کیا گیا ہو۔ اس پر جلو کر دیا گیا ہو۔ اس کی ساتھ بد سے بد تر سلوک بھی اگر ہوا تو اسے احساس نہیں ہوگا۔

رانی بائی حقیقت میں اس کی عزت اور عصمت کا سودا کرنے والی تھی۔ اگر بے خبری کے عالم میں ناگن درگا کی عزت لٹ گئی اور بعد میں جب وہ اپنے ہوش و حواس میں آئی تو اسے حقیقت حال جاننے کے بعد کس قدر صدمہ نہیں ہو گا۔ عورت کی عزت اگر ایک بار لٹ جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لا سکتی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے وہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ میں کسی بھی جگہ چھپ سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے وہیں کچھ دیر رہ کر ایک تو ناگن درگا کی عزت کی حفاظت کرنی چاہیے دوسرے انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں اس پر بد دعا کا اثر ختم ہو جائے اور وہ اپنی اصلی حیثیت میں واپس آجائے۔

ناگن، درگا نے ٹی وی بند کر دیا اور اسی کمرے کا ایک دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اندر پانی گرنے کی آواز آئی۔ شاید یہ غسل خانہ تھا۔ میں کلاچ سے نیچے سے نکل آیا میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں اطمینان سے رات بھی گزار سکوں۔ کمرے میں کٹنی فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری لگی تھی۔ میں اس کے پیچھے آگیا۔ یہاں چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ اس الماری کو کوئی اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسی جگہ چھپے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں سے میں سارے کمرے کو اچھی طرح سے دیکھ بھی سکتا تھا۔ ناگن درگا نے ہاتھ روم میں کٹنی دیر لگا دی۔ شاید وہ غسل کر رہی تھی۔ جب وہ باہر آئی تو اس نے سر پر چھوٹے تولیے سے بالوں کو لپیٹ رکھا تھا۔ سارے جسم کے گرد بھی بڑا تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ وہ اسی ٹھنڈی کے بول گنگنا رہی تھی جو چونی رام نے آج اسے یاد کرائی تھی۔

سانے والی دیوار کے ساتھ بہت بڑا سنگھار میز تھا۔ دیوار پر سنہری حاشیے والا بیضی آئینہ لگتا تھا۔ اس کے برابر میں ایک قد آدم الماری تھی۔ ناگن درگا الماری کھول کر اس میں سے بیگمیں میں لگی ہوئی ساڑھیاں نکل نکل کر دیکھنے لگی۔ آخر اسے ایک گلابی رنگ کی کام دار ساڑھی پسند آگئی۔ اس نے ساڑھی نکل کر سنگھار میز کی کرسی پر رکھی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو تولیے سے جھاڑنے

لگی۔ پھر اس نے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر پر جوڑے کی طرح بٹایا اور اپنے جسم کے گرد لپیٹا ہوا تولیہ اتار دیا۔ اس نے اندر کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ میں اگرچہ ستپ کے روپ میں تھا لیکن میرے احاسات سارے انسانی تھے۔ مجھے ناگن درگا سے شرم سی آنے لگی۔ مگر ستپ نے اپنا چہرہ دوسری طرف نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ ستپ ان باتوں کو محسوس نہیں کرتے۔ میں ستپ کی آنکھوں سے ناگن درگا کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناگن درگا کا جسم یونانی دیویوں ایسا تھا۔ ایسا خوبصورت جسم میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے پیار سے اپنے سارے جسم پر کسی پرفوم کا سپرے کر رہی تھی اور گنگنا بھی رہی تھی۔ کمرہ پرفوم کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔ اس نے الماری میں سے سیاہ رنگ کا بلاؤز نکل کر پہن لیا۔ پھر چینی کوٹ پہنا۔ اس کے بعد ساڑھی پہن کر تیار ہونے لگی۔

وہ دیر تک سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بناؤ سنگھار میں لگی رہی۔ میں اسے پہلی بار اس ذوق و شوق سے بناؤ سنگھار کرتے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ملازمہ شانتی نے اندر آ کر کہا۔

”رانی جی! بلا رہی ہیں۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”انہیں کمرہ میں آ رہی ہوں۔“

ناگن درگا اب کوئی قلبی گیت گنگنا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ انھی اور بڑی شان کے ساتھ ریٹھی ساڑھی سنبھالتی مہارانیوں کی طرح قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی الماری کے نیچے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ مجھے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس کمرے میں جاتی ہے اس کے جسم کی خوشبو مجھے گھیر کر رہی تھی۔

وہ اس کمرے میں تھی جہاں پہلے رانی بائی کو میں نے دیکھا تھا۔ رانی بائی اس سے پہلے اس کی بلائیں لے چکی تھی، اب اس کے حسن اور بناؤ سنگھار کی تعریف کر رہی

تھی۔ اس کے تعریف کرنے کا انداز خراٹ بھیکوں والا تھا۔ میں دوازے میں داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ ایک طرف گھدیانہ والی پٹائی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ رانی ہائی نے اب ٹیلی فون بھی اپنے پاس رکھا ہوا تھا جس کی تار عقبی کمرے کی طرف جاتی تھی جو رانی ہائی کا بیڈ روم تھا شاید۔ وہ ناگن درگا سے کہنے لگی۔

”جاگیردار کا دھام پور سے فون آیا ہے کہ وہ کل کی بجائے آج رات کو ہی پہنچ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا کل اسے کسی منتری سے ملنے جانا ہے جس نے اسے ڈنر پر بلایا ہے۔“

ناگن درگا بولی۔

”پھر کیا ہوا رانی مل۔ اسے آج ہی آ جانے دیں۔ کل کیا اور آج کیا۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔“

رانی ہائی نے ناگن درگا کا ہاتھ چوم لیا۔

”میں واری جیوں‘ میری چند۔ تم نے تو مجھے نمل کر دیا ہے۔ بس آج رات کوئی ایسا کرتب دکھاؤ کہ سب بھی مرجائے اور لاشیں بھی نہ ٹوٹے۔“

ناگن درگا نے حیار طوائفوں کی طرح کہل۔

”رانی جی! ایسا ہی کرتب دکھاؤں گی۔ یہ بتائیں کہ کمرہ کون سا دیں گی ہمیں؟ میرے بیڈ روم کے تو پردے پرانے ہو گئے ہیں۔“

رانی ہائی نے کہل۔

”اس کلام کے لیے میں نے ایک انگ لور خاص بیڈ روم بتایا ہوا ہے جو میں نے تمہیں ابھی تک نہیں دکھایا تھا۔ وہ میں تمہیں دکھا دوں گی۔ وہاں ضرورت کی لور موقع کے لحاظ سے ہر شے موجود ہے۔ میں چونی رام کو فون کرتی ہوں کہ ابھی آ جائے اور تمہیں تھوڑا سا بھرے کلریاض کرا دے۔“

ناگن درگا نے فوراً کہل۔

”نہیں نہیں رانی مل۔ اب ریاض کیا تو سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ اب تو میں جاگیردار کے سامنے ہی ہجرا کوں گی۔“

اور دونوں ہنسنے لگیں۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی رانی ہائی بولی۔

”چونی رام آ گیا ہو گا۔“

تھوڑی دیر بعد چونی رام بھی آگیا۔ خوب بنا سنورا تھا۔ بوسکی کا کرتہ سفید چوڑی دار پاجامہ پن رکھا تھا۔ پاؤں میں کولہا پوری چپل تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ منہ میں پن تھا۔ رانی ہائی کو پرہم کر کے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور بولا۔

”رانی ہائی! میں نے دیر کر دی۔ آپ کی بہو نے کھیر پکالی تھی کہنے لگی کھا کر جاؤ۔“

رانی ہائی نے کہل۔

”وہ دھام پور والا جاگیردار آج رات ہی آ رہا ہے‘ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تمہیں فون کرنے والی تھی۔“

چونی رام صوفے پر بیٹھ گیا۔

”اچھا“ پھر ناگن درگا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں چندا رانی کو میں نے کلنی ریاض کرا دیا ہے۔ کیوں چندا؟“

چندائے طوائفوں کی طرح گردن ایک طرف ڈھلکا کر کہل۔

”کیوں نہیں‘ کیوں نہیں۔ میں تو اب دھننی ملا اور انٹری ہائی کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔“

”میں واری جیوں۔“ رانی ہائی نے بے اختیار کہل۔ پھر چونی رام سے کہنے لگیں۔

”ارے کوئی ولایتی دارو کا بھی انتظام کر لینا۔ میں نے ایک ٹیز والے شرابی سے کل کے واسطے چار ولایتی بوتلیں لانے کو کہا تھا۔“

چونی رام بولا۔

”اس کی فکر نہ کریں رانی مل۔ گھر میں اس وقت دو بلیک اینڈ وائیٹ کی بوتلیں نیچے والی لٹاری میں بند پڑی ہیں۔ مجھے معلوم ہے ہائی ابھی کچھ مرغ لے آتا ہوں۔ اسے درست کر لیں گے‘ بریانی شانتی روز ہی پکاتی ہے۔ ساتھ پڑنگ بھی تیار کر لے

گی۔ باقی اور کیا چاہیے۔“

”جب تو ٹھیک ہے، چند ٹھیک لگ رہی ہے؟“

چونی رام نے ناگن درگا پر ایک نگاہ ڈالی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ ساڑھی کا رنگ بھی صحیح ہے۔ بس موقع پر اسے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا۔“

رانی بائی نے کہا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو، وہ میں نے سب کچھ اپنی بنیا کو سمجھا دیا ہے۔ تم فوراً“
مارکیٹ میں جا کر مرنے اور دوسرا ضروری سامان لاکر خانسلاں ہریا کو دے دو، جلاؤ۔“

”ابھی جاتا ہوں، کچھ رقم دے دیجئے۔“

رانی بائی نے سوسو کے پانچ نوٹ اپنے برس سے نکل کر اسے دے دیے۔ وہ چلا گیا۔ رانی بائی نے ناگن درگا کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”رات کو بلاؤز اتار کر بیڈ روم میں آنا، مگر اسے زیادہ ہاتھ مت لگانے دینا۔“

ناگن درگا شراب کر سٹ سی گئی۔ اس وقت مجھے وہ بالکل پہلے والی باجیا ناگن درگا لگی۔ مگر فوراً ہی گردن اٹھا کر بولی۔

”بس جتنا ضروری ہوگا اتنا ہی اسے قریب آنے دوں گی رانی ماں۔ تم شانت رہو۔“

رانی بائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ میں تمہیں نیا بیڈ روم دکھاتی ہوں۔“ دونوں کمرے سے نکل کر گئیں تو میں بھی دیوار کے ساتھ ریٹکتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلے لگا۔ یہ دوسری منزل تھی۔ نیا بیڈ روم بھی اسی منزل پر تھا۔ وہ لکڑی کی شاندار میزچیاں اترنے کی بجائے گیلری میں ہی ذرا آگے جا کر ایک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ میں کچھ دیر کے لیے گیلری میں ہی قالین کے کنارے پر دیوار کے ساتھ لگا رہا۔ بیڈ روم کا دروازہ انہوں نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی، مگر یہ روشنی زیادہ تیز نہیں تھی۔ رانی بائی نے خاص قسم کا ماحول بنانے کے لیے وہاں روشنی کا انتظام بھی خاص طور پر

رومانوی کر رکھا تھا۔ میں ریٹکتا ریٹکتا بیڈ روم کے دروازے کی دہلیز کے ساتھ ہی اندر جا کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ بیڈ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک بڑا چنگ تھا جس پر ریشمی بستر بچھا تھا۔ سرخ رنگ کے ٹیکے پڑے تھے۔ چنگ کی ایک جانب سینڈ والا ٹیبل لیس تھا۔ کارنس پر نیم عریاں عورتوں کی بڑی ہنسٹنگ لگی تھی۔ کارنس کے اوپر خوبصورت سنہری گلوب والی جی روشن تھی۔ بیڈ روم میں اس وقت صرف وہی ایک جی روشن تھی۔ چنگ کی ایک جانب گولڈن فریم والا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ درمیان میں شیشے کی ککلی ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر گلدان رکھا تھا جس میں پلاسٹک کے پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بہت بڑی بڑی دو جھنگڑ لگی تھیں جن میں عورتیں بالکل عریاں حالت میں ایک چشمتے پر نما رہی تھیں۔ صاف لگتا تھا کہ یہ بیڈ روم صرف عیاشی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ناگن درگا ان تصویروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ رانی بائی کہہ رہی تھی۔

”رات کو یہ کارنس کے اوپر والی جی بچھا کر ٹیبل لیس روشن کر دینا۔“

اس نے گلوب والی جی بچھا کر ٹیبل لیس چلا دیا۔ ٹیبل لیس میں سرخ بلب لگا تھا۔ بیڈ روم میں سرخ روشنی پھیل گئی۔ ناگن درگا چنگ پر بیٹھ کر بولی۔

”رانی ماں یہ تو برا نرم بستر ہے۔“

رانی بائی نے دیوار پر لگا ہوا ایک سوچ دلیلا اور چمت سے لگا پٹکھا ایک خاص رفتار سے چل پڑا۔ وہ بولی۔

”یہاں رات کو ویسے بھی زیادہ گرمی نہیں ہوتی۔ اس پٹکے کی ہوا بڑی ٹھیک رہے گی۔ آ جاؤ۔ اب کھانا کھا کر تھوڑا اور تیار ہو جاؤ، کوئی پتہ نہیں وہ جاگیردار کب آ جائے۔“

ان سے پہلے میں بیڈ روم سے کھسک کر گیلری میں قالین کے کنارے کے نیچے چھپ گیا۔ دونوں ایک اور کمرے میں چلی گئیں۔ اس کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ بڑی میز پر کھانا لگا ہوا تھا اور ایک سفید وردی والا خانسلا ملازمہ شانتی کے ساتھ مل کر ضروری چیزیں لوہر لوہر رکھ رہا تھا۔ وہاں چونی رام بھی آ

گیلہ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں ابھی جا کر بیڈ روم میں کسی مناسب جگہ پر چھپ جاؤں۔ بیڈ روم میں میں اس لیے جانا چاہتا تھا کہ اگر رات کو جاگیردار ناگن درگا کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک کرنے کی کوشش کرے یا اس سے زیادتی کرے تو میں ناگن درگا کی عزت بچا سکوں، کیونکہ ایک طوائف کی قیمت ادا کر کے جب ایک عیاش مرد اس کے بیڈ روم میں جاتا ہے تو پھر وہ اس کی عزت وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

بہت ممکن تھا کہ وہ ناگن درگا کو کوئی چیز پلا کر بے ہوش کر دے اور پھر اس کی عزت لوٹ لے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رانی بائی نے جاگیردار کے ساتھ ناگن درگا کی عزت کا سودا طے کر کے لاکھ سوا لاکھ روپیہ وصول کر لیا ہو اور ناگن درگا کو اپنی جگہ پر پکی کر دی ہو کہ جاگیردار کو ایک حد سے آگے نہ جانے دینا اس کو اپنے بدن پر زیادہ ہاتھ نہ پھیرنے دینا تاکہ ناگن کو یہی تاثر ملے کہ رانی بائی کو اس کی عزت و حرمت کا بے حد خیال ہے اور اس نے اس کی عزت کی کوئی قیمت وصول نہیں کی ہے۔ یعنی یہ معیار نانیکہ رانی بائی ایک تیر سے دو نسلے لگانے کی کوشش کر رہی ہو۔

بیڈ روم کا دروازہ پوری طرح سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ بند کرنے کی انہیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ ان کا اپنا بنگلہ تھا اور تھوڑی دیر بعد وہاں جشن عیش منعقد ہونے والا تھا۔ میں لوہ کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔ ایک طرف کنفی مار کر بیٹھ گیا اور جائزہ لینے لگا۔ آخر ایک جگہ مجھے موزوں لگی۔ وہاں سے میں بنگالی صورت حال میں تیزی سے چنگ پر آکر جاگیردار پر حملہ کر سکتا تھا اور اس کو ڈس کر اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کر سکتا تھا کہ جس سے وہ کم از کم چوبیس گھنٹے بے ہوش رہے۔ یہ جگہ چنگ کے بالکل سامنے دہلی دیوار کے ساتھ لکڑی کے ایک لمبے کینٹ کے نیچے تھی۔ میں وہاں جا کر کینٹ کے نیچے گھس گیا۔ میں نے اپنی تھوڑی سی گردن باہر نکال کر دیکھا۔ مجھے بیڈ روم کا سارا منظر واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ میں ناگن درگا اور اس کے عیاش گاہک جاگیردار کا انتظار کرنے لگا۔



مخندہ ڈیڑھ گھنٹہ گزرا نہو گا کہ جنگلے کے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی رانی بائی کی آواز آئی۔

”شانخی! نیچے جا کر دروازہ کھولو، جلدی کرو۔“

قدموں کے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے اور بیڑھیاں اترنے کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی بیڈ روم کے باہر جو گیلری تھی وہاں رانی بائی کی آواز سنائی دی، وہ چوٹی رام سے کہہ رہی تھی۔

”تم نیچے جا کر اسے اوپر لے آؤ۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گی، جاؤ۔“

میں بیڈ روم میں کینٹ کے نیچے چھپا یہ ساری آوازیں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیچے ہل کمرے میں سے دو مردوں کے قہقہوں کی آواز آئی، ان میں سے ایک چوٹی رام اور دوسرا دھام پور کا جاگیردار ہی ہو سکتا تھا۔ وہ قہقہے لگاتے باتیں کرتے بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے اور گیلری میں سے گزر گئے۔ پھر رانی بائی کی آواز بھی آئی۔ وہ جاگیردار کا استقبال کرتے ہوئے خوشامدانہ ہنسلے کہہ رہی تھی جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد شاید وہاں ناگن درگا کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ پہلے تازہ چمڑا، پھر ہارمونیم کے سرگونج اٹھے، اس کے بعد ناگن درگا کے ٹھہری گانے کی ہلکی ہلکی آواز بیڈ روم میں آنے لگی، کچھ دیر بعد ڈانس شروع ہو گیا۔ طبلے کی تھاپ پر ہتھکڑو چمک رہے تھے۔ کلنی دیر تک یہ محفل رقص و سرور جی رہی۔ اس کے بعد صرف

ہاتوں اور تمقوں کی آوازیں آتی رہیں۔ شاید جاگیردار کو ڈنر کرایا جا رہا تھا۔ سب لوگ کھانے کی میز پر ہی تھے۔ ان کی آوازیں ذرا دور سے آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں عائب ہونے لگیں۔

پھر سرگوشیوں کی آواز آئی۔ یہ آواز گیلری میں سے آئی تھی۔ یہ ناگن درگا کی سرگوشی تھی۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”کیا کرتے ہیں، صبر سے کام لیں۔“

جاگیردار کی آواز آئی۔ ”میری جان! صبر ہی تو نہیں ہوتا۔“

ناگن درگا نے کہا۔

”اندر آ جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ناگن درگا کو ایک ٹائٹل قد کے سانولے آدمی کے ساتھ دیکھا جس نے ہل خضاب سے خوب کالے کیے ہوئے تھے۔ سفید چٹکیلی شیردانی کے ساتھ کھلے پانچوں والا سفید ریشی پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھوٹی سی چھری تھی۔ بیڈ روم میں کارنس والے گلوب کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ اندر آتے ہی جاگیردار دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھنے لگا۔

”دنڈر فل! بہت خوبصورت تصویریں ہیں۔ بس ہم تو چاہتے ہیں کہ عورتیں ہوں تو ایسی ہوں تم بھی ایسی ہی عورت بن جاؤ۔ ہم تمہیں مالا مل کر دیں گے۔“

ناگن درگا نے ایک الماری میں سے شراب کی بوتل اور گلاس نکل کر میز پر سجا دئے۔ دوسری شیشے کی الماری میں سے بڑی دو تھرمس نکالیں۔ کسنے لگی۔

”رانا جی یہاں تشریف رکھیں، باقی ساری باتیں ہوتی رہیں گی۔“

جاگیردار جس کو ناگن درگا نے رانا کہہ کر پکارا تھا صوفے پر بیٹھ گیا اور دسکی کی بوتل کو اٹھا کر بولا۔

”معمولی سکچ ہے، مگر کوئی بات نہیں۔ چلے گی۔“

ناگن درگا نے بوتل کھول کر رانا کے گلاس میں اور پھر اپنے گلاس میں شراب

ڈالی۔ ایک تھرمس میں سے برف کی ڈلیاں نکل کر دونوں گلاسوں میں ڈالیں۔ دوسرے تھرمس میں سے پانی نکل کر دونوں گلاسوں میں ڈالا اور صوفے پر جاگیردار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ایک گلاس اسے دیا، ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جاگیردار نے گلاس سے گلاس نکراتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”چیزز۔“

ناگن درگا نے بھی وہی لفظ دہرایا اور دونوں نے گلاس ہونٹوں کے ساتھ لگا لیے۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ جاگیردار تو غٹاٹ شراب چڑھا گیا مگر ناگن درگا بہت آہستہ آہستہ پی رہی تھی جیسے پیتے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ جب اس نے گلاس میز پر رکھا تو جاگیردار اس کے گلاس کو دیکھ کر بولا۔

”اری میری چندا رانی! تو نے تو صرف ایک ہی مھونٹ پیا ہے۔ اس طرح تو کلام نہیں چلے گا۔“

ناگن درگا نے جاگیردار کی گردن میں اپنی بائیں حائل کر دیں اور کہا۔

”رانا جی! میں آہستہ آہستہ ہی پیتی ہوں۔ فکر نہ کریں آپ کا پورا ساتھ دوں گی۔“

جاگیردار نے بے اختیار ہو کر ناگن درگا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ناگن درگا نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”رانا جی! تمہوڑا صبر کریں پوری رات پڑی ہے۔“

رانا الگ ہو گیا، سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہاں! یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہم پوری رات کے لیے یہاں آئے ہیں۔“

جاگیردار نے شیردانی اتار کر سامنے والے صوفے پر رکھ دی۔ چھری بھی وہیں رکھ دی اور چاندی کا سگریٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک سگریٹ ناگن درگا کو دیا، دوسرا سگریٹ خود سلگایا اور کسنے لگا۔

”چند رانی! تمہیں پہلے بائی جی کے ہاں نہیں دیکھا تم کہاں رہتی تھیں؟ بائی جی تو

کہہ رہی تھیں کہ تم رام پور سے آئی ہو۔
 ناگن درگا نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔
 ”میں سمجھ لیں۔“
 جاگیردار نے گلاس اٹھایا اور ناگن درگا سے کہا۔
 ”چیئرز۔“

ناگن درگا بولی۔ ”آپ بی جائیں میں دوسرے گلاس میں آپ کا ساتھ دوں گی۔“
 ”جیسے تمہاری مرضی“ پوری رات پڑی ہے۔“
 یہ کہہ کر جاگیردار نے زور دار قہقہہ لگایا اور سارا گلاس چڑھا لیا۔ ناگن درگا نے
 اس کے خلی گلاس میں مزید شراب برف اور پانی ڈال کر دوسرا ٹیک بھی بنا دیا۔
 دوسرے ٹیک کو اٹھاتے ہوئے جاگیردار نے ناگن درگا سے کہا۔
 ”اب تم بھی گلاس خلی کر دو گی۔“

درگا نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ
 تین چار گھونٹ پی گئی۔ جاگیردار اس دوران آدھا گلاس خلی کر چکا تھا۔ اس نے گلاس
 میز پر رکھ دیا۔ پہلا سگریٹ الٹل ٹرے میں مسل ڈالا اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ اب
 اس نے ناگن درگا کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور کہنے لگا۔
 ”میری جان! ہم دھام پور کے سب سے بڑے جاگیردار ہیں۔ کبھی ہماری حویلی میں
 آؤ تمہاری اتنی خاطر کریں گے کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔ تمہیں شیر کا شکار کھائیں
 گے۔“

ناگن درگا نے ہاتھوں سے ہاتھ لگا کر کہا۔
 ”توبہ، توبہ۔ مجھے تو شیر سے بہت ڈر لگتا ہے۔“
 جاگیردار نے ناگن درگا کا منہ چوم لیا اور بولا۔

”اری میری رانی! ہم جو تمہارے ساتھ ہوں گے پھر تمہیں شیر سے ڈرنے کی کیا
 ضرورت ہے۔ میری جان تمہارے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔“ اور وہ ناگن درگا

سے لپٹ گیا۔
 درگا نے بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑایا اور اٹھ کر بولی۔
 ”میں آپ کو ٹھہری ستاتی ہوں۔“
 جاگیردار نے دوسرا گلاس بھی خلی کرتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں، ٹھہری نہیں۔ ہم تمہارا بھرا دیکھیں گے، ہاں بھرا دیکھیں گے۔“
 میں سمجھ گیا تھا کہ ناگن درگا وقت گزار رہی تھی۔ مگر میں حیران تھا کہ اتنی رات
 اتنا وقت بڑا تھا وہ کیسے گزارے گی۔ اس نے الماری میں سے تہپورہ نکال لیا اور چنگ
 پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔
 ”پہلے میں آپ کو ایک ہائل نی ٹھہری سنوں گی، اس کے بعد بھرا بھی کہوں
 گی۔“
 اس نے تہپورہ چھیڑ دیا اور کوئی ٹھہری گانے لگی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زیادہ
 گانا نہیں جانتی مگر کوشش کر رہی تھی کہ پیشہ ور طوائفوں کی طرح نرت کے ساتھ
 گائے۔ وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔ ناگن درگا شراب کا ایک گلاس پی چکی تھی۔ اگرچہ اس
 نے اپنے گلاس میں تھوڑی ڈالی تھی پھر بھی اس پر نشے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔
 نرت کرتے ہوئے وہ لڑکھائی تو جاگیردار نے پک کر اسے ہاتھوں میں قلم لیا اور اس
 سے لپٹ گیا۔ ناگن درگا اپنے آپ کو چھڑا کر کلوچ پر بیٹھ گئی اور ہاتھوں کو ٹھیک کرتے
 ہوئے بولی۔
 ”مجھے یہ بہت اچھی نہیں لگتی۔“

جاگیردار پورے نشے میں تھا۔ اس نے کلوچ پر بیٹھی ناگن درگا کو اپنی طرف کھینچا
 اور کہا۔

”تو پھر کوئی بہت اچھی لگتی ہے میری جان۔“
 جاگیردار نے درگا کی ساڑھی اتارنی چاہی تو اس نے سخت مزاحمت کی۔ جب
 جاگیردار نے اس کے بلاؤز پر ہاتھ ڈالا تو درگا نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔

جاگیردار کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے بھی درگا کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور
فضیلی آواز میں کہل

”حرام زلوی! تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ تھماری پوری رقم میں نے ہائی جی کو
لوا کی ہے، چل سازھی اتار کر چنگ پر لیٹ جا۔“
ناگن درگا نے بھی گرج دار آواز میں کہل

”ہائی جی کو پیسے دیے ہیں تو ہائی جی کے پاس جا، میرے پاس کیا لینے آیا ہے۔ میں
تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔“

جاگیردار نے اونچی آواز میں ہائی جی، چونی رام اور ناگن درگا کو گلیاں دینی شروع
کدیں۔ وہیں شور مچ گیا۔ میں کینٹ کے نیچے سے کھل کر جاگیردار کو ڈسنے کے بارے
میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہائی جی اور چونی رام بیڈ روم میں آگئے۔ رانی ہائی نے آتے ہی
داوڑا شروع کر دیا۔

”ہائے ہائے۔ میری ہنسی کے ساتھ کہیں ظلم کر رہے ہو، چھوڑ دو۔“

جاگیردار یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ چونی رام نے کسی کو آواز دی کمرے میں دو
بٹے کئے آدمی ہاتھوں میں شین تھیں لیے داخل ہو گئے اور آتے ہی انہوں نے جاگیردار
کو پکڑ لیا۔ یہ رانی ہائی کے ہڈی گاڑتی ہو سکتے تھے۔ میں نے پہلے انہیں وہیں نہیں
دیکھا تھا۔ جاگیردار نے مسلح ہڈی گاڑ کو دیکھا تو غصہ اڑ گیا۔ کہنے لگا

”ٹھیک ہے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ تم لوگوں نے مجھ سے جو بھاری رقم
وصول کی ہے وہ میں تم سے واپس لے کر ہی رہوں گا، چھوڑ دو مجھے۔“

رانی ہائی کے اشارے پر ہڈی گاڑ نے جاگیردار کو چھوڑ دیا۔ جاگیردار نے شیروانی
پہنی ہاتھ میں چھری پکڑی اور بولا۔

”میں اس بے عزتی کا بدلہ لے کر رہوں گا۔“

رانی ہائی درگا کو ساتھ لگا کر پیادہ کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”ہم نے کسی کی کوئی بے عزتی نہیں کی۔ ہم نے اپنی ہنسی کی جان پھینکی ہے۔ ہم

نہ آتے تو تم نے اسے مار ڈالا ہوتا۔“

جاگیردار سخت غصے کی حالت میں بیڈ روم سے کھل گیا۔ رانی ہائی نے ہڈی گاڑ
سے کہل

”تم کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ جا کر دیکھو جاگیردار کا بچہ چلا گیا
ہے کہ نہیں؟“

ہڈی گاڑ زور فوراً چلے گئے۔ رانی ہائی نے درگا سے کہل۔
”جاہلی تو اپنے کمرے میں جا کر سو جا، فکر نہ کر۔ وہ تیرا بیل تک بکا نہیں کر سکتا۔
جا۔“

ناگن درگا سازھی سنبھالتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد
چونی رام کہنے لگا۔

”رانی ہائی! یہ حرامی ہمیں دھمکی دے گیا ہے۔ ہمیں اس سے ہوشیار رہنا ہو گا۔“
رانی ہائی کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہل۔

”ارے وہ کیا کر لے گا؟ ہم بھی اسی شر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے بھی کچھ
جاننے والے یہاں ہیں۔ میں صبح ہی کشنر بندھاری صاحب کو فون کرتی ہوں۔ جاگیردار
ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چلو تم بھی جا کر آرام کرو۔“

رانی ہائی اور چونی رام بھی وہیں سے کھل گئے۔ بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا گیا۔
صرف میں وہیں رہ گیا تھا۔ سوچنے لگا کہ جاگیردار اپنے آدمیوں کے ذریعے ناگن درگا کو
نفصل پہنچانے کی ضرورت کو شش کرے گا۔ اس قسم کے حیاش جاگیرداروں نے غنڈے
ضرور پالے ہوتے ہیں۔ بہر حال اب مجھے بھی چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ دل میں یہ
خیال بھی آتا کہ میں ناگن درگا پر اپنا آپ ظاہر کر دوں اور اسے کہوں کہ یہاں اس کی
جان اور عزت خطرے میں ہے۔ وہ یہاں سے میرے ساتھ فرار ہو جائے۔ پھر خیال آتا
کہ ناگن درگا کا تو بھروسہ دیوتا کی بد دعا کے اثر سے ذہن ہی بدل چکا ہے۔ وہ مجھے
کہیں پہچانے گی۔ الٹا شور مچا دے گی اور خود میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہی

ہو سکتا تھا کہ میں رانی ہائی کے بیچلے پر وہ کرسی ٹانگن درگا کی گھرائی کھول اور اسے کسی آنے والے خطرے سے محفوظ رکھ سکوں۔

وہ رات گزر گئی، دوسرے دن نیچے ایک گاڑی آ کر رکی۔ دو چار آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ یہ لوگ باتیں کرتے گیلری میں سے گزر گئے۔ شاید وہ رانی ہائی کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ پھر چوٹی رام اور رانی ہائی کی بھی آواز آنے لگی۔ میں بیڈ روم میں ہی چمپا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ باہر دن کی روشنی تھی، باہر کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ میں اگر باہر نکلتا ہوں تو مجھے دیکھا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ معلوم کرنا بھی ضروری تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور ٹانگن درگا کس حال میں ہے۔ میں کینٹ کے نیچے سے ریک کر دروازے کے پاس آیا۔ اس دروازے کے نیچے گزرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے اپنا سر دروازے کے ساتھ لگا کر آگے کو دھکیلا۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ لگتا تھا کہ باہر سے تلا لگا دیا گیا ہے کیونکہ یہ بیڈ روم عام استعمال میں نہیں آتا تھا۔ اسے رانی ہائی نے خاص خاص موقعوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں بیڈ روم میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ وہیں کوئی کھڑکی، روشنی بھی نہیں تھا۔ رانی ہائی کا کمرہ وہیں سے ایک کمرہ چھوڑ کر تھا۔ اس طرف سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی پولیس افسر آیا ہوا ہے۔ کسی کسی وقت ٹانگن درگا کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے جسم کی خوشبو مجھے برابر آرہی تھی۔ کچھ دیر تک یہ کانفرنس جاری رہی پھر پولیس والے جانے لگے۔ رانی اور چوٹی رام پولیس افسر کے ساتھ باہر گیلری میں سے گزرے، دونوں پولیس افسر سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چوٹی رام کہہ رہا تھا۔

”ہمیں تو آپ کی پولیس پر اور آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔“

پولیس افسر کی آواز آئی۔

”آپ لوگ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پولیس آپ کی

پوری پوری حفاظت کرے گی۔“

سب لوگ میزبیاں اتر کر کھلی منزل والے ہال کمرے میں سے ہوتے ہوئے باہر

چلے گئے۔ ان کی آوازیں دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ پھر جیب شارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چوٹی رام اور رانی ہائی پہلی منزل کے ہی کسی کمرے میں بیٹھ گئے تھے شاید۔ میں بھی کینٹ کے نیچے اپنی خفیہ جگہ پر واپس آگیا۔ ابھی مجھے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے پر میں باہر جانے کا کوئی طریقہ تلاش کر سکتا تھا۔ دن گزر گیا مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ بیڈ روم میں کوئی کلاک وغیرہ بھی لگا ہوا نہیں تھا۔ مجھے انتظار کی کوفت تو ہوتی نہیں تھی۔ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کسی کسی وقت دور سے ملازمہ شانتی کی کسی کو بلانے کی آواز آ جاتی۔ ان آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ رات ہو گئی ہے۔ بیڈ روم میں باہر سے کھانے کی خوشبو بھی ایک بار محسوس ہوئی۔ مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی ٹانگن درگا کے جسم کی خوشبو سے غافل نہیں ہوا تھا جو مجھے برابر ایک ہی مقدار سے محسوس ہو رہی تھی۔

ماحول ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وقفے سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں سمجھ گیا کہ رات گہری ہو گئی ہے۔ میں بھی اپنے خیالوں اور سوچوں میں گم ہو گیا۔ جیل کی طرف سے مجھے بڑا اطمینان تھا کہ وہ پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اپنی کلیا پلٹ کا خیال آتا تو میں کچھ سمجھتا بھی جاتا کہ یہاں اچانک انسانی شکل میں واپس آگیا تو ٹانگن درگا تو شاید مجھے بالکل ہی نہ پہچانے۔ یہاں کے لوگ مجھے چور ڈاکو ہی سمجھیں گے لیکن میری ذہنی کیفیت بتا رہی تھی کہ ابھی کلنی مدت تک میرے سہارے سے انسانی روپ میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کی طرح آنکھیں بند کر کے سو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ سہارے آنکھیں بند نہیں کر سکتا البتہ جب میں سہارے کی شکل میں ہوتا تھا اور مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا تھا تو میں عالم بے خودی میں چلا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی تھی کہ ارد گرد کا احساس تقریباً ختم ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی میں اسی عالم بے خودی میں جا چکا تھا۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے کہ سہارے اس حالت میں کئی دن بے حس و حرکت مل کے اندر پڑا رہتا ہے۔

اچانک شور مچا بلند ہوا، جس نے مجھے چونکا دیا۔

”رانی بائی! میں نے کسٹمر صاحب کو فون کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ لڑکی شام تک برآمد ہو جائے گی اور جاگیردار بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہم نے پولیس پارٹی دھام پور روانہ کر دی ہے۔“

رانی بائی سر پکڑ کر کلاچ پر بیٹھ گئی۔

”میری تو قسمت پھوٹ گئی جب میں نے اس حرام زادے جاگیردار کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ ہمارے ساتھ یہ حرکت بھی کرے گا۔ چونی رام! تمہارا کیا خیال ہے، چند رانی کو اس کے آدمی کہاں لے گئے ہوں گے۔“

یہ سنتا تھا کہ میرے نیچے سے جیسے زمین کھکھک گئی۔ میرے انسانی ذہن میں بیٹیلیں بجنے لگیں۔ جاگیردار نے آخر انتقام لے لیا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ناگن درگا کو دوسری رات ہی اغوا کر لیا تھا۔ غصے سے میرا سٹپ والا جسم پیچ و تاب کھانے لگا۔ میں اسی وقت درگا ناگن کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے فضا کو سونگھا۔ یہ میں اس افراتفری کے ماحول میں بھول ہی گیا تھا۔ فضا میں ناگن درگا کی بو موجود نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ جاگیردار کے آدمی اسے راتوں رات اغوا کر کے وہاں سے بہت دور کہیں لے گئے ہیں۔ چونی رام کہہ رہا تھا۔

”رانی بائی! ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کلام سوائے جاگیردار رانا کے اور کسی نے نہیں کیا۔ دوسری یہ بات بھی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جاگیردار کے آدمی چندا کو لے کر دھام پور نہیں گئے ہوں گے۔“

”تو پھر وہ کہاں لے گئے ہوں گے میری چندا کو؟“

رانی بائی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ اسے تو غم لگتا ہی تھا، اس کے ہاتھ سے سونے کی چڑیا اڑ گئی تھی۔ چونی رام بولا۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا رانی بائی۔ دھام پور کے آس پاس بڑا شہر کلکتہ ہی ہے یا پھر ہماری طرف آجائیں تو آگے بہتی ہے۔“

رانی بائی نے بے اختیار کہا۔

بڑی تیزی سے میری تمام حسیات واپس آ گئیں۔ میں نے سر اٹھا لیا۔ آوازیں نیچے سے آرہی تھیں۔ یہ آوازیں گھبرائی ہوئی تھیں۔ کوئی تیز قدموں سے دوڑتا، کوئی کسی کو آواز دے کر بلاتا۔ ان میں سے رانی بائی، چونی رام اور ہلاڑی گارڈز کی آوازیں بھی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ میں زیادہ پریشان اس لیے تھا کہ ان آوازوں میں مجھے ناگن درگا کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ کے ساتھ مجھے رانی بائی اور چونی رام کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں گھبرائے ہوئے تھے اور بید روم کی طرف آ رہے تھے۔ رانی بائی کی آواز آئی۔

”چونی رام! یہ سارا کلام اسی حرام زادے کا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

ارے جلدی سے دروازہ کھول۔“

چونی رام کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”بائی جی! تلا نہیں کھل رہا۔“

پھر تلا کھل گیا، دروازہ بھی کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ رانی بائی اور چونی رام تیز تیز قدموں سے اندر آئے۔ رانی بائی نے ایک سوچ دیا جس سے کمرے میں روشنی ہو گئی۔ دونوں کچھ تلاش کرنے لگی۔ رانی بائی نے کہا۔

”یہ سگریٹ کیس کس کا ہے؟“

چونی رام نے تپائی پر سے سگریٹ اٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

”یہ اسی حرامی جاگیردار کا ہے۔“

”اس کو عتاب کر دو، یہاں کوئی ایسی چیز نہیں رہنی چاہیے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ یہاں رات گزارنے آیا تھا۔ میں اس کے خلاف ڈاکے اور اغوا کا مقدمہ درج کراؤں گی۔“

اغوا کے لفظ سے میں چونک پڑا۔ چونی رام میز پر سے شراب کی بوتل، گلاس اور اینٹیں اٹھا کر ایک لفافے میں ڈالتا جاتا تھا۔ کہنے لگا۔

”وہ کتے کا بچہ چندا کو ضرور بھیج لے گیا ہے۔ یہی بت بڑا شر ہے وہاں پولیس بھی اسے تلاش نہ کر سکے گی۔“

چوٹی رام بنگ کی چادر ہٹا کر نیچے کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔ بولا۔

”رانی بلی! میں نے بھی اپنے آدمیوں کو فون کر کے دوڑا دیا ہے۔ کل تک ضرور کچھ نہ کچھ سراخ مل جائے گا۔“

رانی بلی نے ایک بار پھر لٹھا اسٹنس بھر کر کھد

”اگر اس حرام زلوے کے خنڈے میری چندا کو بھیج سے دوغنی لے گئے تو سمجھو وہ ہمارے ہاتھ سے گئی۔“

چوٹی رام بولا۔

”رانی بلی! اگر تو چندا بھارت کے کسی شرم میں ہے تو میں تمہیں پورا دشواش دلاتا ہوں کہ میرے آدمی اسے نکل کر لے آئیں گے۔ میرے بھی بازو بڑے لمبے ہیں۔“

”یہ تم اتنی دیر سے کیا ڈھونڈ رہے ہو۔“ رانی بلی نے کھوج سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

چوٹی رام بولا۔

”میں یہاں کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا جس سے یہ معلوم ہو کہ جاگیردار سلا یہاں رات کو آیا تھا۔“

مجھے معلوم تھا کہ اب یہ لوگ باہر گئے تو بیڈ روم کو باہر سے تھکا لگا جائیں گے اور میں نہ جانے کتنی مدت کے لیے یہاں بند ہو کر وہ جوں گاہ میں باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ انہوں نے جو جی جلائی تھی اس کی روشنی میں بیڈ روم کی ایک ایک شے نظر آ رہی تھی۔ اگر میں کینٹ کے نیچے سے نکل کر دروازے کی طرف کھسکا ہوں تو رانی بلی کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی لیکن رانی بلی نے مجھے موقع دے دیا۔ وہ خود بھی بنگ کی طرف جا کر جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔

”میں تو کچھ بھی نہیں ہے چوٹی رام۔ یہاں سے چلو اب۔“ کشتر صاحب کا فون بھی آ رہا ہو گا۔“

جیسے ہی رانی بلی کی پینہ میری طرف ہوئی۔ میں کینٹ کے نیچے سے کھسک کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر بھی دن کی روشنی تھی۔ گیلری کے فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ میں جتنی تیز ریک سکھا تھا ریٹکا ہوا قالین کے کنارے کنارے سے ہوتا رانی بلی کے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں میرے چھپنے کے واسطے بہت سی جگہیں تھیں کیونکہ یہاں کافی فرنیچر وغیرہ تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ہی گھوم گیا اور دیوار کے ساتھ لگے ایک بھاری بھر کم صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں چوٹی رام اور رانی بلی بھی اندر آ گئے۔ چوٹی رام کے ہاتھ میں سیاہ پلاسٹک کا بوا لفافہ تھا جس میں شراب کی خلی بوتلیں، گلاس اور اینس زے وغیرہ تھے۔ رانی بلی بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چوٹی رام بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

رانی بلی ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر نمبر کھانے لگی۔

”میں خود کشتر صاحب کو فون کر کے پوچھ لیتی ہوں کہ کچھ پتہ چلا یا نہیں۔“

نمبر ڈائل کرنے کے بعد رانی بلی نے دو تین بار ہیلو ہیلو کہا اور بولی۔

”ہیلو کشتر صاحب! میں کیا؟ اگر ہوں تو انہیں کہو کہ رانی بلی بات کرے گی۔“

رانی بلی نے رسیور کے ہاتھ میں پر ہاتھ رکھ کر چوٹی رام سے کہا۔

”صاحب! میں نے اے تھا کتا ہے دیکھا ہوں کہیں میٹنگ میں نہ بیٹھے ہوں۔“

چوٹی رام نے سرکٹ سلگتے ہوئے کہا۔

”اے رانی بلی! مشکل پڑتی ہے تو کوئی کام نہیں آتا۔ یہ لوگ تو خود رات کے

اندھرے میں چھپ چھا کر یہاں آتے ہیں یہ کسی سے چندا کے بارے میں کیا پوچھیں گے۔“

”ہیلو! جی۔ میٹک میں ہیں؟ ٹیک ہے میں پھر فون کر لوں گی۔“

رانی ہائی نے ہبوسی کے ساتھ رسیور رکھ دیا۔ چونی رام کہنے لگی۔

”رانی ہائی! تم دیکھ لینا اب چونی رام ہی تمہارے کام آئے گا۔ چندا ہمارے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرئی تھی لیکن تم شانت رہو میرے آدمی آج کل میں ہی اس کا کھوج لگا لیں گے۔“

اس کے بعد چونی رام کچھ دیر بعد آئے تاکہ کر چلا گیا۔ رانی ہائی نے دو تین فون کیے اور پھر وہ بھی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

مجھے اگر فضا میں کسی طرف سے ناگن درگا کی خوشبو آ رہی ہوتی تو میں وہاں سے ضرور نکل پڑتا۔ لیکن اس کی خوشبو بالکل ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں مجبور تھا کہ اس وقت تک رانی ہائی کے بنگلے پر ہی چھپا رہوں جب تک کہ چونی رام کے آدمی چندا کے بارے میں کوئی خبر نہیں لے کر آتے کہ وہ بسپتی میں ہے یا نکلتے ہیں۔ اس روز پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ میں نکلتے کے قریب کسی بڑے شہر میں ہوں۔ وہ دن گزر گیا رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ دوسری رات بھی گزر گئی۔ اس دوران پولیس کا ایک انسپکٹر اور دو سپاہی وہاں آئے۔ رانی ہائی سے اپنی خاطر مدارات کروائی۔ یونہی ایک بیان لیا اور یہ تسلیم دے کر چلے گئے کہ لڑکی کو بہت جلد پولیس پر آمد کر لے گی۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت رانی ہائی اپنے بڑے کمرے یعنی دوسری منزل والے ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی کہ چونی رام کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

”رانی ہائی! آخر میرے آدمیوں نے چندا رانی کو تلاش کر ہی لیا۔“

رانی ہائی نے رسالہ پرے پھینک دیا اور بے تاب ہو کر پوچھا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو چونی رام؟ کہاں ہے میری چندا رانی؟“

چونی رام سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی کھن کھڑے کر لیے تاکہ مجھے بھی معلوم ہو کہ ناگن درگا کو جاگیردار کے فنڈے اغوا کر کے کہاں لے گئے

ہیں۔ چونی رام نے صوفے پر آگے کو جھک کر کہا۔

”رانی ہائی! ہماری سونے کا انڈا دینے والی مرئی اس وقت بسپتی میں ہے۔“

رانی ہائی نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

”آتی جلدی وہ اسے بسپتی بھی لے گئے؟“

چونی رام بولا۔

”میں سے وہ لوگ اسے نکلتے لے گئے تھے وہاں سے ہوائی جہاز میں بٹھا کر بسپتی لے گئے۔“

”بسپتی میں وہ کس جگہ پر ہے؟“

چونی رام نے سر ہلا کر کہا۔

”رانی ہائی! اب اس کا خیال چھوڑی دو تو اچھا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچا دی گئی ہے جہاں سے زندہ یا مردہ حالت میں اسے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ جاگیردار کے فنڈوں نے اسے مبادیوی کے مندر میں پہنچا دیا ہے اور کون نہیں جانتا کہ مبادیوی کے پجاریوں کے چگل میں پھنسی ہوئی عورت کو یم دوت بھی چائے تو نہیں چھڑا سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کسی دوسری لڑکی کو لے آتے ہیں۔ بھارت میں خوبصورت بے سارا لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔“

مجھے ناگن کا سراغ مل گیا تھا۔ میرے لیے اتنا سراغ ہی کافی تھا۔ بسپتی میں اگر ناگن درگا موجود تھی تو وہاں پہنچ کر اس کی خوشبو مجھے آسانی سے اس تک پہنچا سکتی تھی۔ میرے سامنے اب دو کام تھے۔ جن میں ایک کام تو بسپتی پہنچنا تھا جو بے حد مشکل تھا کیونکہ میں سٹپ کے روپ میں تھا۔ دوسرا کام اس چونی رام کو ٹھکانے لگانے کا تھا تاکہ یہ کسی دوسری بے سارا لڑکی کی زندگی برباد نہ کر سکے۔ دوسرا کام بڑا آسان تھا۔ رانی ہائی بھی نامید ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”مبادیوی کے مندر کے پجاریوں کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تم ایسا کرو کہ کل ہی نکلتے روانہ ہو جاؤ۔ وہاں جہیں مشرقی پاکستان سے اغوا کی ہوئی کوئی نہ کوئی لڑکی مل

جلے گی۔ اسے لوٹے پوٹے خرید کر لے آؤ۔ بس بڑی خوش حال اور جوں ہونی
جاسیے، بقی ہم اسے سب سکھا پڑھالیں گے۔“
چوٹی رام بولا۔

”کل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میل ایکسپریس شام کو رانچی پہنچی ہے
میں اس میں بیٹھ کر نکلتے روانہ ہو جاتا ہوں۔ سٹیشن کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف
ایک بیگ گھر سے لانا ہے۔“
رانی بلی نے کلمہ

”اچھا خیال ہے تم ابھی گھر جا کر اپنا بیگ لے آؤ۔ چلو۔“

چوٹی رام چلا گیا۔ میں نے اسے اس لیے زندہ جانے دیا کیونکہ اسے بیگ لے کر
واپس آنا تھا اور اس کے بیگ کے اندر یا بیگ کے نیچے چھٹ کر مجھے رانچی ریلوے
سٹیشن پہنچنا تھا۔ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ اس شرکاء نام رانچی ہے جو نکلتے سے ناگ
پور اور جھید پور کی طرف جلتے ہوئے ایک مشہور شر ہے۔ چوٹی رام کے جانے کے
بعد رانی بلی نے شائق کو آواز دے کر اپنے لیے چائے منگوائی اور پانچوں میں سے ایک
پان نکل کر منہ میں رکھا اور بے دلی سے اخبار کھول کر پڑھنے لگی۔ چوٹی رام کو اسی
کمرے میں واپس آنا اور اسی کمرے سے واپس سٹیشن جانا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ
میں اس کے بیگ کے اندر نہیں گھس سکوں گا۔ مجھے اس کے بیگ کے باہر نیچے کی
جانب چھٹنا ہو گا اور یہ کام مجھے بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑے گا۔ اس وقت صرف
چوٹی رام ہی مجھے ریلوے سٹیشن تک پہنچا سکتا تھا۔ اگر یہ موقع نکل جاتا ہے تو مجھے بہت
جھل خواری کر کے سٹیشن تلاش کرنا ہو گا۔

آخر چوٹی رام آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چڑے کا وہی بیگ تھا جس کے اندر گھس
کر میں رانی بلی کے بچکے تک آیا تھا اور اتفاق سے ناگن درگا مجھے مل گئی۔ اس
دوران میں اپنی جگہ سے کھسک کر دیوار کے ساتھ ساتھ قلعین کے کنارے سے ہوتا ہوا
دروازے کے پاس دہلیز کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور چوٹی رام کے باہر نکلنے کا انتظار

کر رہا تھا۔ میں چھوٹے سائیز کا سٹپ تھا جس کی وجہ سے مجھے چھپنے کے لیے تھوڑی
سی جگہ ہی درکار ہوتی تھی۔ چوٹی رام رانی بلی کے پاس بیٹھا اس سے ہدایت لیتا رہا۔
بیگ اس کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس
کے بائیں ہاتھ میں تھلہ بیگ فرش سے زیادہ سے زیادہ فٹ اونچا تھا۔ میں نے پورا
زور دیا تاکہ وہ اٹھ جائے۔ چوٹی رام دروازے میں سے باہر نکلا۔ میں اچھل کر اس کے
بیگ کے نیچے چھٹ گیا۔ یہ کام میں نے اتنی بھرتی اور احتیاط کے ساتھ کیا تھا کہ چوٹی
رام کے بیگ کو ہلکا سا دھچکا ہی لگا چلتے ہوئے چونکہ بیگ اس کے ہاتھ میں مل رہا تھا
اس لیے اس نے یہ جھٹکا محسوس نہ کیا۔ نیچے رانی بلی کی گاڑی کھڑی تھی۔ چوٹی رام
نے ڈرائیور سے کلمہ

”کھسی رام چلو پھلی سٹیشن پر لے چلو۔“

”جو حکم سرکار۔“

چوٹی رام نے بیگ پھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ میں نیچے سے کھسک کر گاڑی کی سیٹ
کی ایک طرف چھپ گیا۔ کار چل پڑی۔ چوٹی رام ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا
تھا۔ وہ سارا راستہ ڈرائیور سے لوہر لوہر کی باتیں کرتا رہا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن کے
باہر کھڑی ہوئی تو میں دوبارہ بیگ کی ایک جانب چھپ گیا۔ یہ رانچی شرکا ریلوے سٹیشن
تھا۔ میں سٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے مجھے صرف بسنی جانے والی گاڑی معلوم کر کے
اس کی چھت پر سوار ہونا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ایک ضروری کام کرنا تھا اور وہ کام
چوٹی رام دلال کو ہمیشہ کی نیند سلاتا تھا تاکہ آئندہ وہ کسی کی ماں، بہن کی عزت اور
زندگی برباد نہ کر سکے۔ رانچی سٹیشن پر اتنی زیادہ روشنی نہیں تھیں جتنا میرا خیال تھا
کہ ہوں گی۔ یہ میرے لیے اچھی بات تھی۔ چوٹی رام بیگ اٹھائے بگگ وینڈو کے پاس
آ کر کھڑا ہو گیا۔ بیگ اس نے نیچے رکھ دیا۔ میں بیگ کی دوسری طرف ہو گیا تھا۔ یہاں
دوسرے مسافر بھی کھڑے تھے۔ میرے لیے چوٹی رام کو گرا کر باہر نکلنے کا موقع کم تھا۔
لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے۔

چونی رام نکٹ لے کر پلیٹ فارم پر آگیا۔

پلیٹ فارم پر بھی کئی لوگ تھے۔ وہ ایک طرف رکھے ہوئے بج پر بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک بیگ کے ساتھ چمٹا ہوا تھلہ بج کے پیچھے تھوڑا اندھیرا تھلہ میں لے موقع کا جائزہ لیا۔ یہاں سے میں فرار ہو سکتا تھلہ چونی رام بج پر دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھلہ بیگ اس کی ٹانگوں میں رکھا تھلہ اس نے دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک پنڈلی میرے سامنے تھی۔ میں ذرا سا کھٹک کر آگے ہوا اور پلک جھپکنے میں اس کی پنڈلی پر ڈس دیا اور اس کے ساتھ ہی بج کے پیچھے دیوار کی آڑ میں ہو گیا جہاں ہلکا اندھیرا تھلہ میں چونی رام کا انجام دیکھ کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھلہ میرے ذہن کی تاثیر بڑی ہلاکت خیز تھی اور کوئی بھی انسان اسے ایک سیکنڈ کے سوویں حصے سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھلہ چونی رام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جیسے ہی میں اسے ڈس کر دیوار کی لوٹ میں آیا اتنی دیر میں وہ آگے کو گر پڑا تھا اور دوسرے مسافروں میں شور مچ گیا تھا اور وہ لوگ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب کو بعد میں پتہ چلا ہو گا کہ اسے سب لے ڈسا تھلہ اتنی دیر میں میں وہاں سے نکل کر پلیٹ فارم کے بست آگے اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں کوئی مسافر نہیں تھا صرف ریلوے مل گودام کا سلن پڑا تھلہ میں سلن کے پیچھے اطمینان سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب یہ کس طرح سے معلوم ہو کہ رانچی سے بسبھی جانے والی گاڑی کس وقت اور کون سے پلیٹ فارم سے جاتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھلہ سمجھتا تھا کہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مشرق کی طرف جس گاڑی کا رخ ہو گا وہ کلکتے کی طرف جاری ہوگی اور مغرب کی طرف جس کا رخ ہو گا وہ ناگ پور، بسبھی یا زیادہ سے زیادہ پنڈ، بنارس، دلی کی طرف جاری ہوگی۔ اگر میں بنارس، پنڈ یا لکھنؤ بھی پہنچ جاتا ہوں تو وہاں سے بسبھی جانے والی گاڑی پکڑنے کی کوشش کر سکتا تھلہ لیکن یہ مجھے علم تھا کہ رانچی سے براستہ بلاس پور، رائے پور، ناگ پور، دھولائی اور ٹٹک بھی گاڑیاں بسبھی جاتی ہیں اور یہ راستہ لمبا نہیں ہے اور رانچی اور بسبھی کے متوازی ہی ہے اور ٹرین بھارت کی مشرقی

مکھٹ سے مغربی مکھٹ کی طرف جاتی ہے۔

مگر یہ معلوم کرنا ایک سب کے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ رانچی سے براستہ پنڈ، بنارس کون سی گاڑی جاتی ہے اور براستہ ناگ پور، امرلوٹی، ٹٹک کون سی گاڑی جاتی ہے۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ رانچی کے پلیٹ فارم پر زیادہ دیر تک پڑا رہوں۔ ایک تو مجھے جلدی بسبھی پہنچ کر ٹٹک درگا کو تلاش کرنا تھلہ دوسرے دن کی روشنی میں میرا نظر آ جاتا تھلہ جب ایک سب نظر آ جاتا ہے تو پھر انسانوں سے اس کا بچ کر لکھنا اتنا آسان کام نہیں ہوتا کہ میں نے یہی سوچا کہ جو گاڑی بھی مغرب کی طرف جاتی ہوگی اللہ کا نام لے کر اس کی چمت پر بیٹھ جاؤں گا۔ اگر پنڈ وغیرہ پہنچ گیا تو وہاں سے بسبھی جانے والی گاڑی کی چمت پر سوار ہونے کی کوشش کروں گا اور اگر یہ گاڑی بسبھی جاری ہوگی تو اسی گاڑی کی چمت سے چپکا رہوں گا۔ میں بنگل کے علاقے میں کئی پھر چکا تھلہ مجھے معلوم تھا کہ رانچی کے بعد بڑا شہر رائے پور ہی آتا ہے۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی ہوگی کہ جس پلیٹ فارم پر میں چپا ہوا تھا وہاں ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس گاڑی کا رخ مغرب کی طرف تھا اور یہ کلکتے سے آرہی تھی۔ اس میں بست مسافر تھے۔ کچھ اتر گئے۔ زیادہ مسافر وہاں سے سوار ہو گئے۔ میں نے بست کھن لگا کر لوگوں کی باتیں سنیں کہ شلید پنڈ چل جائے کہ یہ گاڑی دلی جاری ہے یا بسبھی مگر معلوم نہ ہو سکا کہ میں اللہ کا نام لے کر دوسری طرف سے آ کر ٹرین کے پیلوں پر سے گزر کر ٹرین کے ایک ڈبے کی چمت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔ ٹرین بقی ساری رات چلتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد ایک ایسے بڑے سٹیشن پر پہنچی جو صوبہ بہار کا شہر نہیں لگتا تھلہ وہاں اردو نہیں بولی جاری تھی۔ لوگ تمل یا سنگو یا مراٹھی میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ ٹرین بسبھی کی طرف ہی جاری ہے۔ پنڈ، بنارس کی طرف سے ہو کر دلی نہیں جاری۔

ٹرین آگے چل پڑی۔ پھر جب رائے پور کا شہر آیا تو مجھے یقین ہوا کہ میں اتفاق

سے یا خوش قسمتی سے اس گاڑی میں سوار ہو گیا ہوں جو رلے پور، بلاس پور، ناگ پور، امراتوی اور ٹانک سے ہوتی ہوئی پہنچی جا رہی ہے۔ قصہ مختصر اس ٹرین نے مجھے بمبئی کے پوری بندر سٹیشن پر پہنچا دیا۔ پہنچی گاڑی بڑا سٹیشن پیسے سنٹرل تھا مگر یہ ٹرین بمبئی کے پہلے بڑے سٹیشن پوری بندر آ کر رکی تھی۔ یہ بہت وسیع اور کشادہ ریلوے سٹیشن ہے۔ ٹرمینل سٹیشن ہے، یعنی یہاں سے آگے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ جس وقت ٹرین بمبئی پہنچی اس وقت وہاں بارش ہو رہی تھی۔ میں ٹرین کی چھت سے رینگ کر ریلوے ٹریک کی دوسری جانب اترا اور پلیٹ فارم کی دیوار سے لگ کر رینگ رینگ کر اس جگہ پہنچ کر چھپ گیا جہاں بڑے بڑے دو بفر Buffer لگے ہوئے تھے یعنی یہاں لائنیں بند ہو جاتی تھی۔

میں نے سب سے پہلے فضا کو سو گھٹا مجھے فضا میں ناگن درگا کی خوشبو محسوس ہوئی ضرور مگر یہ خوشبو بہت کمزور اور لطیف تھی۔ اگر ناگن درگا سٹپ کی شکل میں ہوتی تو یہ خوشبو بہت تیز ہوتی مگر وہ انسان یعنی عورت کی شکل میں تھی جس کی وجہ سے اس کی سٹپ کی بو ہلکی پڑ گئی تھی اور صرف عورت کی خوشبو ہی اس کے جسم سے خارج ہو رہی تھی۔ جو بہت ہلکی تھی اور باہر چونکہ شرمیں بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ خوشبو اور بھی لطیف ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کمزور خوشبو بھی ناگن درگا تک میری راہ نمائی کر سکتی تھی۔ ٹرین بمبئی دن کے وقت پہنچی تھی۔ مجھے رات کا اندھیرا ہو جانے کا ہر حال میں انتظار کرنا تھا۔ میں بڑی محظوظ جگہ پر چھپا ہوا تھا۔ چنانچہ وہیں چھپا رہا۔

جب سورج ڈوب گیا۔ پلیٹ فارم پر روشنیاں ہو گئیں تو میں وہاں سے نکل کر چل پڑا۔ میں اندھیرے کونوں اور دیواروں وغیرہ کی آؤ لیتا سٹیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بمبئی بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ سڑکیں اتنی چوڑی تھیں کہ میں اسے عبور کرتے ہوئے کسی گاڑی کے نیچے آ کر کھلا جاسکتا تھا۔ روشنی اتنی تھی کہ مجھے کسی بھی سڑک کو پار کرتے ہوئے لوگ دیکھ کر میرے پیچھے پڑ سکتے تھے۔ میں سٹیشن سے باہر نکل آیا تھا لیکن جس طرف سے باہر نکلا

تھا اگرچہ وہ بل گودام چپ کا علاقہ تھا پھر بھی وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی میری دشمن تھی۔ میں نے فضا کو سو گھٹا ناگن درگا کی ہلکی ہلکی خوشبو کی لہریں ایک سمت سے آ رہی تھیں۔ میں اسی سمت کی طرف بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے رینگنے لگا۔ سڑک پار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سڑک پر ہمیں بھی چل رہی تھیں، ڈکٹوریہ گاڑیاں بھی چل رہی تھیں، موٹر سائیکلیں اور موٹر کاریں بھی آ جا رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک گرین بیلٹ بنی ہوئی تھی۔ میں اس میں چھپ کر آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہا تھا جس طرف سے مجھے ناگن درگا کی خوشبو آ رہی تھی۔ سڑک شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔

آخر سڑک ایک طرف کو مڑی تو سامنے ایک بہت بڑا گول چوک آگیا۔ درمیان میں گول دائرے کی شکل میں گھاس کا پلاٹ تھا۔ گاڑیاں اس کا چکر لگا کر گزر رہی تھیں۔ جس گرین بیلٹ پر میں جا رہا تھا وہ سڑک وہاں آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ گرین بیلٹ کے آخر میں ٹاربل کے درخت تھے۔ میں ایک درخت کے تنے میں چھپ کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ اتنا بڑا چوک جہاں روشنیوں نے دن چڑھا رکھا ہے میں کیسے پار کروں گا کیونکہ ناگن درگا کی خوشبو چوک کے پار سے آ رہی تھی۔ شاید مہا دیوی کا مندر اسی طرف تھا میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بس کا ٹیڈ بنا ہوا ہے۔ وہاں دو منزلہ بیس آ کر کھڑی ہوتی ہیں اور آگے چل پڑتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ وہاں جانا چاہیے شاید مہا دیوی کے مندر کو جانے والی کوئی بس مل جائے۔ مہا دیوی کا مندر بمبئی کی مشہور جگہ تھی۔ کسی نہ کسی بس کی پیشانی پر اس کا نام ضرور لکھا ہوا ہوگا۔ میں درخت کی آڑ سے نکل آیا اور چھپتا چھپاتا بس سٹینڈ پر آگیا۔ اس وقت وہاں کوئی بس نہیں تھی۔ ایک مسافر عورت بچے کو لیے ٹیڈ کے اندر بیٹھی تھی۔ میں تیزی سے ٹیڈ کی چھت پر آگیا۔ اتنے میں ایک بس آ کر رکی۔ کنڈکٹر بولے لگا اس نے بمبئی کی تین چار جگہوں کے نام لے کر مسافروں کو سوار ہونے کی دعوت دی مگر اس میں مہا دیوی کے مندر کا نام نہیں تھا۔ وہ بس نکل گئی۔ دوسری دو منزلہ بس آئی تو کنڈکٹر نے

باہر نکل کر کھلے

”پاری بت“ ادھیرا ہوس“ مہا میا کا مندر۔“

میرا مقصد حل ہو گیا تھا۔ میں شیڈ کی چھت پر سے ہی چھلانگ لگا کر دو منزلہ بس کی چھت پر اٹھ گیا اور وہیں چھٹ گیل۔ بس آگے چل پڑی۔ بس بمبئی کی روشن کشادہ نور باروفتی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی دو تین جگہوں پر رکی۔ ہر جگہ کنڈکٹر اس مقام کا نام لیتا اور مسافر اتر جلتے۔ آخر ایک جگہ بس رکنے لگی تو کنڈکٹر نے آواز دی۔

”مہا میا جی کا مندر۔“

وہاں اتنی روشنی تھی اور اس پاس اسنے لوگ تھے کہ میں بس کی چھت سے ہی چھٹا رہا۔ جب بس آگے چل پڑی تو میں نیچے چھلانگ لگانے کے لیے موقع تلاش کرنے لگا۔ ایک چوک پر آ کر بس دائیں طرف گھومی تو اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ فٹ پاتھ کا ایک درخت نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ میں اچھل کر درخت کی شاخوں سے لپٹ گیا۔ بس آگے نکل گئی تھی۔ بس سٹاپ خالی ہو گیا تھا۔ سڑک پر بھی کسی کسی وقت کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک بڑے مندر کی عمارت دکھائی دی جس کے دروازے پر خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر سے کسی وقت مندر کے ٹل بننے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ مہادیوی کا مندر ہی ہو سکتا تھا۔ ناگن درگا کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی اسی طرف سے آ رہی تھی۔

میں فٹ پاتھ اور سڑک کے کنارے کے درمیان رہنٹا ہوا مندر کی طرف بڑھتا ہوں۔ میں کافی تیزی سے جا رہا تھا۔ مندر کے عقب کی طرف آیا تو رک گیا۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ناگن درگا کی خوشبو مندر کے اندر سے نہیں بلکہ مندر کے عقب میں کچھ فاصلے پر جو اونچی اونچی عمارتیں جگہ رہی تھیں اس طرف سے آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگن درگا مندر میں نہیں تھی۔ ان بلند عمارتوں میں کسی جگہ تھی۔

میں نے مندر کی پچھلی دیوار کے ساتھ دو تین چکر لگائے۔ درگا کی خوشبو مندر سے نہیں بلکہ عقبی عمارتوں کی جانب ہی سے آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے

غور کیا اور پھر بلند عمارتوں کی طرف رہنٹے لگے مندر اور عمارتوں کے درمیان ایک بے آبو خللی جگہ تھی جہاں کھدائی کا کام ہو چکا تھا اور مٹی کے ڈھیر پڑے تھے۔ شاید یہاں کوئی نئی عمارت بن رہی تھی۔ میں مٹی کے ڈھیروں کے درمیان سے ہو کر نکل گیا۔ بلند عمارتوں کے آگے سے ایک سڑک گزرتی تھی جس کی درمیانی گرین بیلٹ میں درخت اور پھولدار پودے آگے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دوسری جانب سے موٹر کاریں تیزی سے گزر جاتی تھیں۔ میں سڑک پار کر گیا۔ شروع رات کا وقت تھا۔ بلڈنگوں کے فلیٹوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ٹی وی اور کیسٹ پلیئر پر لگے ہوئے انڈین فلمی اور انگریزی گانوں کی ہلکی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ تین تین چار چار بلڈنگوں کے درمیان پیچھے جانے کو راستہ بنا ہوا تھا جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔

ایک جگہ سچے کھیل رہے تھے۔ ایک بلڈنگ کے باہر تین چار نوجوان لڑکے بیٹھے سرکٹ پیتے ہوئے آہیں میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ یہاں کہیں روشنی تھی اور کہیں اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں سے ہو کر ناگن درگا کی خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ بلڈنگوں کے ایک بلاک کے پیچھے ایک پرانی ٹاپ کی کوٹھی نما عمارت تھی جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف برآمدے میں ایک جلی ہوئی روشنی تھی۔ گیٹ کوئی نہیں تھا لگتا تھا یہ انگریزوں کے زمانے کی کوئی کوٹھی ہوگی جہاں اب شاید کوئی نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ باہر نہ کوئی گاڑی کھڑی تھی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا اور نہ ہی کوٹھی کے کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ مگر ناگن درگا کی خوشبو اسی کوٹھی سے آ رہی تھی اور خوشبو پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ کوٹھی کے لان میں جنگلی جھاڑیاں آگ رہی تھیں۔ یہ کوئی آہنی کوٹھی نکلتی تھی۔ میں جھاڑیوں میں سے ہو کر کوٹھی کے برآمدے میں آ گیا۔ ناگن درگا کی خوشبو کو بڑی توجہ کے ساتھ ایک جگہ رک کر محسوس کیا۔ یہ خوشبو کوٹھی کے عقب کی جانب زیادہ تھی۔ میں کوٹھی کے عقب میں اٹھ گیا۔ اس طرف کوٹھی کی پرانی دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اندھیرا تھا مگر سٹاپ ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

کوٹھی کے پیچھے بھی ایک برآمدہ تھا۔ اس طرف ایک سنے لٹل کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔ گاڑی کے اندر کوئی نہیں تھا۔ میں برآمدے کی طرف بڑھ کر درگا کی خوشبو ایک دروازے میں سے نکل رہی تھی۔ یہاں خوشبو کافی تیز اور گرمی تھی۔ میں اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ پرانی کوٹھی تھی اوپر روشندان پر لٹکا ہوا روشندان پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دیوار پر رینگتا ہوا روشندان پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرے کی ساری چیزیں بھی ہوئی تھیں۔ اندر سے درگا کی خوشبو کے ساتھ مجھے شراب کی بو بھی محسوس ہوئی۔ شراب کی بو کی مجھے کافی شناخت ہو گئی ہوئی تھی۔ ضرور کوٹھی کے کسی کمرے میں شراب پی جا رہی تھی مگر کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ٹوٹے ہوئے روشندان میں سے نیچے کمرے میں اتر گیا۔ کمرے میں ڈرم اور چھوٹے بڑے ٹکڑے کے کھوکھے پڑے تھے۔ وہاں بھی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ پرانا دروازہ تھا۔ دلیز کے اوپر کافی جگہ تھی۔ مجھے دوسری طرف سے دو آدمیوں کے دھیمی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دلیز کے اوپر چڑھ کر دروازے کے پٹ کے نیچے سے سر نکال کر دیکھا۔

دوسری طرف ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ٹکڑے ٹکڑے کے زلمنے کے بھاری بھر کم صوفے پر دو آدمی آسنے آسنے بیٹھے تھے۔ چھت پر چمکا چل رہا تھا۔ دیوار پر جی جل رہی تھی۔ درمیان میں چھوٹی میز پر شراب کی بوتل گلاس وغیرہ پڑے تھے۔ دونوں آدمی شراب کی چٹکیں لیتے اور باتیں کر رہے تھے۔ ناگن درگا کی خوشبو برابر آ رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک آدمی پختہ عمر کا تھا۔ اس کے گھٹکھریالے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ دوسرا گھٹھے ہوئے بدن کا نوجوان تھا۔ اس نے ٹی شرٹ پتلون پہنی ہوئی تھی۔ نوجوان نے پختہ عمر کے آدمی کو مخاطب کر کے کہا۔

”گورو کا دل اس لڑکی پر آ گیا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لے گا ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا دیو چاہا۔“

ادویز عمر کے آدمی کا نام دیو چاہا تھا۔ دیو چاہا بولا۔

”جیک! کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ آخر ہم جو لڑکی کو اتنی مصیبت سے پولیس کا خطرہ سول لے کر اٹھا کر لائے ہیں تو ہمیں کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں، لڑکی کو گورو نے سنبھال لیا ہے۔“

جیک نے کہا۔

”میں تو کہتا ہوں کہ ہم لڑکی کو کسی بہانے میں سے دوئی لے جاتے ہیں۔ وہاں اپنا ایک ایجنٹ ہے۔ کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار میں لڑکی کو ضرور خرید لے گا۔“

دیو چاہا نے فنی میں سر ہلا کر کہا۔

”نہیں جیک! یہ کام خطرناک ہے۔ گورو کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ اس کے گینگ کے آدمی دوئی، شارج وغیرہ میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اسے خبر ہو گئی تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا اور پھر لڑکی بھی تو گورو کے ساتھ بڑی چمک چمک کر باتیں کرتی ہے۔ ابھی اسے یہاں آئے دو دن ہی ہوئے ہیں اور گورو کی دیوانی ہو رہی ہے۔“

جیک نے کہا۔

”چاہا! یہ لڑکی۔ کیا نام بتایا تھا اس نے؟“

”چند رانی۔ یہی نام بتایا تھا۔“ دیو نے کہا۔

اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لوگ ناگن درگا کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کی گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ چندا یعنی درگا ناگن ابھی تک منحوس دیوتا کی بد دعا کے زیر اثر ہے اور اس کی یادداشت واپس نہیں آئی اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو ایک طوائف زلی یا عیاش قسم کی سوسائٹی گرل ہی سمجھ رہی ہے اور اسی طرح وہ کر زندگی کا بھرپور لطف اٹھاتا چاہتی ہے اور نہیں جانتی کہ اس طرح اس کی زندگی جہنم کے دہانے پر پہنچ رہی ہے۔ منحوس دیوتا نے اسی لیے اس کو بد دعا دی تھی اور اس کی یادداشت سلب کر کے اس کے دل و دماغ کو اپنی مرضی کے مطابق بنا دیا تھا۔

ہوئے بھاری بھرکم آدمی کو پر نام کیا۔ ویرو چاچا نے کہا۔

”گورو دیو نے ہمیں یاد کیا، ہم حاضر ہو گئے۔“

یہ وہی گورو دیو تھا جس کے بارے میں یہ دونوں آدمی تھوڑی دیر پہلے گفتگو کر رہے تھے۔ گورو دیو نے چٹکی بجا کر سکرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

دونوں ایک طرف ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ گورو دیو نے ناگن درگا کی طرف سکرارتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”رائی جی! تم بیڈ روم میں چلو ہم ابھی آتے ہیں۔“

ناگن درگا نے بڑی خاص ادا سے گردن ایک طرف ڈھلکائی اور بولی۔

”جلدی آ جانا گورو دیو۔“

گورو نے ناگن درگا کا کال چوم لیا۔

”جلدی آ جاؤں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ بزنس کی باتیں کرنی ہیں۔“

ناگن درگا اٹھ کر بڑے بانگپن سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد گورو نے ویرو چاچا سے مخاطب ہو کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور بڑے راز دارانہ انداز میں کہا۔

”ویرو! رامیشورم کے بڑے پجاری کا ایجنٹ آیا تھا۔ اس نے چندا کو پسند کر لیا

ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار میں سودا طے ہو گیا ہے۔ ایک لاکھ روپیہ وہ مجھے دے گیا ہے۔

کل شام سات بجے تم دونوں چندا کو لے کر جوہو والے جنگل پر جاؤ گے۔ وہاں وہ تمہیں

باقی کی رقم بیس ہزار روپے ادا کر دے گا۔ تم چندا کو اس کے حوالے کر دو گے اور ہاں

یہ بیس ہزار روپے تم دونوں کا انعام ہو گا۔ کو سالو! اب تو خوش ہو میں؟“

ویرو چاچا اور جیکی جینے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے۔

”گورو دیو! یہ سب آپ کی کپا ہے۔“

ویرو نے سکرارتے ہوئے کہا۔

جیکی کہہ رہا تھا۔

”یا تو یہ کوئی بڑی سی بھولی بھولی لڑکی ہے اور یا پھر بے حد ہلاک اور خزانہ قسم

کی لڑکی ہے جو گھٹ گھٹ کا پانی پی چکی ہے۔“

ویرو چاچا نے چٹکی لگائی، سکرٹ کا سٹ لگایا اور بولا۔

”جیکی بیٹا! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہمیں ابھی خاموش رہ کر دیکھنا چاہیے کہ اونٹ

کس کوٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

سانے والی دیوار کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی اندر آئی جس نے صرف بلاؤز

اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

”چاچا! ہمیں لور جیکی کو گورو دیو نے یاد کیا ہے۔“

دونوں جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کے پیچھے پیچھے دوسری طرف نکل

گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ادھ کھنے دروازے کی دوسری طرف ایک

مختصر سا کوریڈور تھا۔ آگے ایک دروازہ تھا جس میں سے درگا کی خوشبو کے تیز جھوٹے

نکل رہے تھے۔ ناگن درگا اسی کمرے میں تھی۔ دونوں آدمی لڑکی کے ساتھ دروازہ

کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ میں

بھی دروازے کی دوسری طرف آ گیا اور جلدی سے دیوار کی طرف مڑ کر ایک جگہ

چھپ گیا۔ جہاں میں چھپا تھا وہاں ایک لکڑی کی پیٹی پڑی تھی۔ میں اس پیٹی کے پیچھے

ہو گیا تھا۔ اس کمرے میں بھی شراب کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سر ذرا سا باہر

نکل کر کمرے کا جائزہ لیا۔

میں نے دیکھا کہ یہاں بڑا قیمتی فرنیچر بچا ہوا تھا۔ چھت کا فانوس جگمگا رہا تھا۔

اے سی بھی لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کی فضا میں گرمی لور جس بالکل نہیں

تھا۔ سانے صوفے پر ایک گول مٹول پھولی ہوئی توند والا آدمی پتلون کی چٹی ڈھیلی کیے

ہاتھ میں شراب کا گلاس پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ناگن درگا بڑی قیمتی ساڑھی

پننے بیٹھی سکرارہی تھی۔ جیکی لور ویرو چاچا نے اندر آ کر ہاتھ جوڑ کر صوفے پر بیٹھے

درگا کی یادداشت ہی کم نہیں کی تھی بلکہ اس کی عقل پر بھی پرہ ڈال دیا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس کی عزت آبرو کی حفاظت کرنی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یادداشت واپس آ جانے کی صورت میں جو کہ ایک نہ ایک دن ضرور واپس آتی تھی، جب نامن درگا پر یہ بھائی انکشف ہوگا کہ اس کے ساتھ کیسی کیسی ہولناک زیادتیاں ہوئی ہیں اور اس کی عزت و حرمت کی دھجیاں اڑ چکی ہیں تو وہ ضرور خود کشی کر لے گی۔ اس کے علاوہ مجھ پر نامن درگا کے بڑے احسان تھے۔ اس نے بڑے موقعوں پر اپنی جان پر کھیل کر میری زندگی بچائی تھی۔ میرا انسانی فرض بھی بنتا تھا کہ میں اس لڑکی کو جو انتہائی بے خبری کے عالم میں تھی، جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس کی مدد کروں اور اسے تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرنے سے بچاؤں۔

چنانچہ میں بھی گورو جس طرف گیا تھا اس طرف چل پڑا۔

پرانے بنگلے میں میرے لیے چھپنے کے کئی امکانات تھے۔ میں دوسرے دروازے کی دلیز کے اوپر سے رینگ کر دوسری طرف آگیا جہاں ایک اور چھوٹی سی راہ داری تھی۔ گورو دیو ایک کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بینہ روم ہے اور گورو اندر جانے کے بعد اس کا دروازہ ضرور بند کر کے اندر سے چٹنی لگا دے گا۔ اس لیے میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی اور راہ داری میں تیزی سے رینگ کر ابھی بینہ روم کا دروازہ کھلا ہی تھا کہ میں اندر گھس گیا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر کمرے کی دیوار کے ساتھ ہی مڑ کر اپنے آپ کو قالین کے کنارے کے نیچے چھپا دیا۔ پتا دہلا اور مختصر سانسپ ہونے کی وجہ سے مجھے چھپنے میں آسانی ہوتی تھی۔

یہ واقعی بینہ روم تھا اور خوب سجا سجا ہوا تھا۔ روشنی مدھم اور خواب انگیز تھی۔ درگا نامن چنگ پر نیک لگائے بیٹی سکرٹ پی رہی تھی۔ گورو نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی اور چنگ پر چڑھ کر نامن درگا کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا شراب کا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ درگا کا کھل چوم کر بولا۔

”لیکن گورو دیو! آپ کو تو چندا پسند آگئی تھی۔“

گورو نے سکرٹ کا کش لگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔

”ارے دیو! چاہا پسند تو ضرور آگئی تھی لیکن تم جانو ایک لاکھ کی رقم بھی بست ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو بستی میں اور بھی مل جائیں گی۔“

جیکی نے کہا۔

”گورو دیو! یہ رایشورم والا بڑا پجاری کوئی بست بڑا سینہ معلوم ہوتا ہے۔“

گورو نے کہا۔

”ارے وہ تو اس لڑکی کو سارے تامل ناڈو کے افسروں، منتریوں اور سینھوں میں چلائے گا اور لاکھوں کمائے گا۔ اس کا تو دھندا ہی یہی ہے۔ مندروں کی دکھتا سے انہیں کیا ملتا ہے۔“

میرا جسم غصے سے پھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ نامن درگا گڑھے میں سے نکل کر اندھے کونوئیں میں گرنے والی تھی جسے میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دیو اور جیکی اٹھ کر جانے لگے تو گورو نے کہا۔

”چند اکل اس بنگلے سے باہر نہیں جائے گی۔ وہ شاپنگ وغیرہ کرنے کو کہے بھی تو تم لوگوں نے کوئی بمانہ بنا کر اسے ٹل دینا ہوگا۔ تم لوگ کل شام ٹھیک سات بجے چندا کو ایک پارٹی میں جانے کا بمانہ بنا کر اسے اپنے ساتھ گاڑی میں سیدھا جوہ والے بنگلے پر لے جاؤ گے۔ وہاں بڑے پجاری کا ایجنٹ موجود ہوگا۔ اس کا نام کرشنا پٹی ہے۔ میں نے اسے تمہارے فونو دکھا دیئے ہیں۔ تمہیں بھی اس کا فونو دکھا دوں گا۔ تم میرا خط بھی ساتھ لے جاؤ گے، جاؤ اب۔“

دونوں بد معاش کمرے سے نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی گورو بھی اٹھ کر اس دروازے کی طرف بڑھا جس دروازے میں سے نامن درگا باہر گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بینہ روم میں جا رہا ہے جہاں نامن درگا انتہائی بے خبری کی کیفیت میں خود کو ایک عیاش طوائف سمجھتے ہوئے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ منوس دیوتا کی بد دعا نے نامن

”رانی تم نے تو مجھ پر جلد کر دیا ہے۔ تمہارے بغیر ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔“

ناگن درگاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گورو جی! میں تو دو دن میں ہی آپ کی دیوانی ہو گئی ہوں۔“

گورو دیو اس کا منہ چومنے لگا تو ناگن درگاہ نے ہاتھ سے اسے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے یہ گلاس تو ختم کر لیں۔“

گورو غنائٹ گلاس دلا دارو چڑھا گیا۔ گلاس کو پنگ کے پاس رکھی تپائی پر رکھ دیا اور ناگن درگاہ سے دست درازیاں شروع کر دیں۔ ناگن درگاہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ منحوس دیوتا کی بد دعا کے زیر اثر وہ خود اپنے آپ کو بد معاش گورو کو پیش کر رہی ہے۔ گورو بھی چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لڑکی اس کے پاس صرف ایک رات کے لیے ہی ہے۔ چنانچہ وہ اس رات کا بھرپور فائدہ اٹھاتا چاہتا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ گورو حد سے آگے بڑھ رہا ہے تو میں تیزی سے ایک طرف سے رینگتا ہوا پنگ کی بائیں ہڈی کی طرف آ گیا۔ گورو اس طرف لینا ہوا تھا اور ناگن درگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں گورو کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح اس کی موت کا الزام ناگن درگاہ پر لگ سکتا تھا۔ کسی نے یقین نہیں کرنا تھا کہ گورو کو سانپ نے کاٹا ہے۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور گورو کے جسم میں کتنا زہر داخل کرنا ہے۔ میں صرف اتنا ہی زہر اس کے خون میں شامل کرنا چاہتا تھا کہ جس سے وہ ساری رات بے ہوش پڑا رہے اور دوسرے دن بھی اس قاتل نہ رہے کہ ناگن درگاہ کی عزت برباد کر سکے۔ یہ بات سانپ کا جسم اور انسان کا ذہن ہونے کے ناطے میرے اختیار میں تھی۔ میں پنگ کی ہڈی پر چڑھ گیا۔ بیڈروم میں روشنی بڑی مدھم تھی۔ ویسے بھی اس وقت گورو پر جذباتی بیہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ میں

پنگ کی پانسی کی جانب آ گیا اور گورو دیو کی تنگی پنڈلی پر تیزی سے اس طرح ڈس دیا جس طرح کوئی آدمی کس کے بدن پر ذرا سی سوئی چبھو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اتنے مختصر سے وقفے میں ہی میں نے جتنا زہر گورو کے خون میں شامل کرنا تھا وہ میں نے کر دیا تھا۔

میں اپنا کام کرنے کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر چھپ گیا۔

زہر نے فوراً اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ گورو ناگن درگاہ کا بازو پکڑ کر کسی بات پر ہنس رہا تھا کہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ناگن درگاہ نے پوچھا۔

”کیا ہوا گورو دیو؟“

بد معاش گورو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سر پر ہاتھ رنہ کر ماتھے کو دہانے لگا۔

”پکڑ سا آ گیا ہے۔“

ناگن درگاہ نے کہا۔

”زیادہ تو نہیں پی لی گورو جی؟“

گورو ناگن درگاہ کے اس سوال کا جواب نہ دے سکا اور پنگ پر لیٹ گیا۔ ناگن درگاہ اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ گورو نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے۔ سونے دو سونے دو۔“

اور اس کے بعد اس کی کوئی آواز نہ آئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اب اسے دوسرے دن دوپہر تک بے ہوش ہی رہنا تھا۔ ناگن درگاہ یہی سمجھی کہ گورو نے زیادہ شراب پی رکھی ہے۔ وہ پنگ پر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ ساری رات میں دیوار کے پاس قالین میں سے سر باہر نکالے لینا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں ان دونوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ناگن درگاہ نے دو تین بار پہلو بدلا مگر گورو کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا جسم حرکت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسے صرف بے ہوش کیا تھا۔ ورنہ میں اسے ہلاک بھی کر سکتا تھا۔

دن نکلا تو وہی خلی بلاؤز اور پتلون والی لڑکی نے آکر ناگن درگاہ کو جگایا اور کہا۔

”جائے پی لو چندا۔ گورو جی کو بھی جگا دو۔“

گورو جی کو جگانا ممکن نہ تھا۔ دونوں اسے جگا رہی تھیں اور وہ ہر بار پہلو بدل کر کہتا۔

”مجھے سونے دو۔ مجھے سونے دو‘ دفع ہو جاؤ۔“

اس بد معاش کے تھوڑا تھوڑا بولنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ گورو بے ہوش ہے، ورنہ وہیں ضرور کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور ڈاکٹر بلا لیا جاتا اور حالات کوئی دوسری شکل اختیار کر جاتے۔ تاہم درگا بلاؤز والی لڑکی کے ساتھ یہ کہہ کر چل دی کہ گورو جی نے رات زیادہ پی لی تھی انہیں آرام کرنے دو۔ گورو کو دوپہر کے بعد ہوش آیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ گورو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے سر اور بازوؤں کو ہاتھوں سے دبائے لگا۔ اتنے میں ویدو چاچا اور جیکی اندر آ گئے۔

گورو دیو! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

گورو نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”بھگوان جانے یہ شراب کیسی تھی ایسا بے سدھ ہو کر پڑا کہ اب آنکھ کھلی ہے۔

اب بھی جسم درد کر رہا ہے۔ ارے جیکی! سالے یہ شراب تم کہاں سے لائے تھے؟“

اس نے کہا۔

”گورو دیو! مائیکل کی دکان سے لایا تھا۔ روز ہی وہاں سے لاتا ہوں۔“

”کل اس نے تمہیں کچی شراب دے دی تھی آج اس کی طبیعت درست کرتا

ہوں۔“

گورو نے چلا کر کہا۔

”ارے میرے لیے کلنی بنا کر لاؤ سو؟“

پھر وہ پتنگ پر نیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ویدو چاچا نے پوچھا۔

”سب معاملہ تیار ہے گورو دیو۔“

گورو بولا۔

”بس شام کو لڑکی کو لے کر جو ہو پہنچ جاؤ۔ آج رات وہ میرے ساتھ ہی سوئی تھی

ابھی اٹھ کر گئی ہے۔“

اوہیز عمر گورو شاید ان دونوں پر اپنی مردانگی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ ویدو چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گورو دیو! وہ تو آپ پر جبن چھڑکتی ہے۔“

گورو نے بڑی شان سے سر اٹھا کر کہا۔

”ہم بھی تو اپنے مرد ہونے کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ رات کو میرے چہنوں میں پچھی جا رہی تھی۔ سالی جمل بھی ہوگی یاد کرے گی میرے ایسا مرد اسے کیس نہیں ملے گا۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ جیکی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

بلاؤز چٹون والی لڑکی کلنی کی پیالی لے کر آگئی۔ گورو جی نے پیالی لے لی اور کہا۔

”وہ چندا کہاں ہے؟“

لڑکی نے کہا۔

”وہ ہاتھ روم میں تیار ہو رہی ہے۔“

گورو دیو نے کہا۔

”اے کوکو! اچھی سی ساڑھی پہنے‘ آج شام اسے جو ہو کی پارٹی میں جانا ہے۔“

”اوکے۔ ہاں۔“

بلاؤز والی لڑکی چلی گئی۔ گورو نے ویدو سے کہا۔

”مدر اسی ایجنٹ کرشنا پٹی سے سو سو کے نوٹوں میں بیس ہزار لینا۔“

پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”اس سالے کے پاس سو سو کے نوٹ کہاں ہوں گے۔ چلو، جو بھی نوٹ دے لے

لینا۔ مگر خاص خاص نشان دیکھ لینا۔ کیس نقلی نوٹ نہ ہوں۔“

”گورو دیو! وہ ایسی جرات نہیں کر سکتا کہ آپ کو دھوکہ دے۔ جعلی نوٹ دے کر وہ جائے گا کبھی؟“

”ہاں یہ تو ہے۔“

یہ کہہ کر گورو کلنی پینے لگا۔ پھر اپنی ایک ٹانگ کو اوپر نیچے کرتے ہوئے بولا۔

”سلا ٹانگوں میں جیسے جان نہیں ہے۔“

جیکی نے کہا۔

”گورو دیو! دبا دوں؟“

”نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

پھر ان دونوں کو سمجھانے لگا

”تم دونوں لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل کر دائر کی طرف سے ہو کر جو ہو جاؤ

گے۔ میں تمہیں ایجنٹ کی فونو دکھائے دیتا ہوں۔“

اس نے سرہانے کے نیچے سے ایک بنوہ نکالا۔ بنوہ کھول کر اس میں سے ایک

تصویر نکل کر دونوں کو دے دی۔

”یہ کرشن پٹی ایجنٹ ہے۔ یہ تمہیں جو ہو والے پنگلے میں ملے گا۔ لڑکی اس کے

حوالے کر کے اس سے بیس ہزار روپے لے لیتا۔ مگر لڑکی وہاں موجود نہیں ہونی

چاہیے۔ اسے اندر بھجوا دینا سمجھ گئے؟“

”جی ہاں۔“ دونوں بیک زبان ہوئے۔

”ایجنٹ کو میں نے تمہاری فونو بھی دکھائی ہے اور اس نے تم دونوں کو پہلے بھی

دیکھا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا میں جیکی اور دیو چاچا کو پہچانتا ہوں۔“

دروازے کا پردہ ہٹا اور ناگن درگا اندر داخل ہوئی، اس نے نیلے رنگ کی ریشمی

سازھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے

اسے اتنا خوبصورت کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گورو نے اس کی طرف دیکھ کر کلنی کی پیالی تپائی

پر رکھ دی اور جیکی سے کہا۔

”اچھا تم لوگ جاؤ، ٹھیک سات بجے یہاں آ جانا۔ آؤ چندا رانی آ جاؤ۔“

ناگن درگا نے پٹنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”گورو دیو! سات بجے کوئی خاص کام ہے کیا؟“

گورو نے کہا۔

”تم بیٹھو تو سسی میری جان، ابھی بتاتا ہوں۔“

گورو نے ناگن درگا کے گلے میں ہازد ڈال کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ناگن درگا

مسکرا رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ناگن درگا میں اس قدر انقلاب بھی آ سکتا

ہے۔



”نہیں یہی ٹھیک رہے گی۔“

وہ ناگن درگا سے دست درازی کرنے لگا۔ ناگن درگا نے پہلے کی طرح کوئی مزاحمت نہ کی۔ گورو رات کا غصہ دن کے وقت شاید اتارنا چاہتا تھا۔ میں اسے دوسرا انجکشن دینے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن میرے پہلے انجکشن کا ابھی اثر باقی تھا۔ ادھر ادھر ہاتھ چلانے کے بعد گورو کو احساس ہو گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ فوراً ”ہاتھ کھینچ لیا اور بولا۔

”اچھا اب تم جا کر اپنے اور میرے لیے کھانا تیار کراؤ۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔“

ناگن درگا اوکے کہہ کر چلی گئی۔ گورو نے اس کے جانے کے بعد اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

”سارے گورو دیو کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

اس کے بعد پنگ پر سے اٹھ کر وہ بھی کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے کمرے سے مجھے ناگن درگا کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی کو کھانے کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے بیس رہ کر شام ہو جانے کا انتظار کرنا چاہیے یا بنگلے کے باہر کسی جگہ چھپ جانا چاہیے تاکہ جب ویدو چاچا اور جبکی ناگن درگا کو لے کر باہر نکلیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہو جاؤں۔ مجھے کیا کرنا تھا میں نے سوچ لیا ہوا تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کوئی پتہ نہیں یہ لوگ بیڈ روم میں واپس نہ آئیں اور باہر کے باہری نکل جائیں۔ چنانچہ میں وہاں سے کھسک کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے کی راہ داری سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں گھس گیا اور اس کے روشندان میں سے ہو کر بنگلے کے عقبی برآمدے میں اتر آیا۔ یہ ایک ویران سا پرانا بنگلہ تھا۔ وہاں چھپنے کی بہت جگہیں تھیں۔ میں برآمدے کے بالکل سامنے ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ جب سورج مغرب کی طرف ڈوب گیا تو بنگلے میں ایک نئی کار داخل ہوئی۔ یہ وہی ماڈل کی گاڑی تھی جو میں نے یہاں آتے وقت



ناگن درگا نے کہا۔

”گورو جی! رات آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ معلوم ہوتا تھا زیادہ پی گئے تھے۔“
گورو نے فوراً ”کہا۔

”لیکن تمہیں تو خوش کر دیا تھا ناں؟“

ناگن درگا نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

”ہاں، میں بہت خوش ہوں۔“

بد معاش گورو کو کچھ یاد نہیں تھا کہ رات اس نے کیا کیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا۔ بس اس کے بعد ایسی گہری نیند سویا کہ اب جاگا ہوں۔“
پھر سگریٹ سٹاک کر کہنے لگا۔

”ہاں چندا رانی۔ آج شام تمہیں ویدو اور جبکی کے ساتھ جوہو والے بنگلے پر جانا ہے، وہاں ایک خاص ڈانس پارٹی ہے۔“

ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔

”میں ضرور جاؤں گی گورو جی۔ کیا یہ ساڑھی ٹھیک رہے گی یا کوئی دوسری پن

لور؟“

گورو نے کہا۔

کے اندر نہیں جا سکوں گا۔ اندھیرا تھا، میں جلدی سے نمبر پلیٹ سے نیچے اتر آیا اور تیزی سے ریگلتا ہوا پچھلے ادھ کھلے دروازے میں سے کھٹک کر سیٹ کے نیچے گھس گیا۔ اس وقت جبکی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔

دیرو چاچا نے اگلی سیٹ سے آواز لگائی۔

”ارے جبکی کی اولاد دروازہ بند کر۔“

جبکی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور بولا۔

”ہاں چاچا پارٹی میں وقت پر پہنچنا چاہیے۔“

ناگن درگاہ نے پوچھا۔

”یہ کس کی پارٹی ہے؟“

جبکی نے کہا۔

”ولایت سے گورو جی کا ایک دوست آیا ہوا ہے۔ اس نے ڈانس پارٹی کا انتظام کیا ہے۔ بڑی فیشن ایبل لڑکیاں آئیں گی قلم اکیٹریس بھی ہوں گی۔“

”اچھا؟“ ناگن درگاہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”پھر تو بڑا مزا آئے گا۔“

جبکی نے کہا۔

”ہمیں تو صرف تم سے باتیں کر کے ہی مزا آتا ہے میری جان۔“

اگلی سیٹ پر دیرو چاچا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے جبکی! چپکے سے بیٹھے رہو۔“

”ٹھیک ہے چاچا، ٹھیک ہے۔ اوکے اوکے۔“

ناگن کی ہلکی سی ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ گاڑی کسی بڑی سڑک پر آ کر پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ گاڑی جوہو کے علاقے والے بنگلے کے پورچ میں جا کر رک گئی۔ سب لوگ گاڑی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی موقع دیکھ کر سیٹ کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا۔ جبکی اور دیرو چاچا بنگلے کے برآمدے کی طرف بڑھے تو اندر سے ایک کالے رنگ کا نمٹنی سا آدمی مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا۔

دیکھی تھی۔ گاڑی برآمدے کے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں سے دیرو چاچا اور جبکی اترے۔ جبکی نے کہا۔

”چاچا تم گاڑی میں ہی رہو، میں چندا کو لے کر آتا ہوں۔“

دیرو چاچا بولا۔

”کوئی پتہ نہیں گورو دیو نے کوئی خاص پیغام نہ دیا ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی

چلتا ہوں۔“

دونوں برآمدے میں سے ہو کر کوٹھی کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ اسی گاڑی میں ناگن درگاہ کو لے کر جوہو جا رہے تھے۔ جوہو بمبئی شہر کے ایک پرانے مگر فیشن ایبل علاقے کا نام تھا۔ وہاں اس بد معاش گورو کا کوئی بنگلہ تھا جہاں اس قسم کے مذموم دھندلے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی سے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ جانا چاہیے۔ چنانچہ میں جھانپوں میں سے نکلا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے سارے دروازے بند تھے۔ کسی طرف سے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس خیال سے کہ جب دونوں آدمی ناگن درگاہ کو لے کر آئیں تو ممکن ہے میں گاڑی میں داخل نہ ہو سکوں، میں گاڑی کے پچھلے حصے میں جہاں گاڑی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی اس پر چڑھ کر اس کے پیچھے چٹ گیا۔ ان لوگوں نے اندر کافی دیر لگا دی تھی۔ شاید وہ لوگ سلت بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر ان کی آوازیں سنائی دیں۔ برآمدے کی بتی روشن کر دی گئی تھی۔ کیونکہ شام کا جھٹ پڑا پھیل گیا تھا۔ دیرو چاچا اور جبکی ناگن درگاہ کو لے کر باہر آ گئے۔ ناگن درگاہ اسی نیلی ریشمی ساڑھی میں تھی اور دونوں بد معاشوں سے ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ دیرو چاچا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جبکی ناگن درگاہ کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ ابھی آدھا کھلا تھا۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ اگر راستے میں جبکی کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے ناگن درگاہ سے زیادتی کی کوشش کی تو میں اس کی عزت بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ دروازہ بند ہو گا اور میں گاڑی

دیرو چاچا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

میرا نام کرشنا پٹی ہے۔ تم لوگ جیکی اور دیرو چاچا ہو؟

”ہاں میں جیکی ہوں، یہ دیرو چاچا ہے۔“ جیکی نے کہا۔

کرشنا پٹی نے ناگن درگا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”ویری بیوٹی فل۔ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

ناگن درگا ان لوگوں کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا

صرف پردہ گرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک طرف سے رینگ کر کمرے میں داخل ہو کر ایک

طرف چھپ گیا۔ ناگن درگا نے جیکی سے پوچھا۔

”پارٹی کب شروع ہوگی؟ دوسری عورتیں کہاں ہیں جیکی؟“

جیکی بولا۔

”ابھی آجائیں گی۔“

مدراسی دلال نے جیکی اور دیرو سے کہا۔

”تم لوگ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“

جیکی اور دیرو چاچا اٹھ کر مدراسی دلال کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ناگن درگا کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر مدراسی دلال ناگن درگا

کو ساتھ لے کر رامیشورم کی طرف چل دیا تو میرے لیے کئی مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔

خدا جانے یہ دلال ناگن درگا کو لے کر ریل گاڑی میں سفر کرے گا یا ہوائی جہاز میں

سوار ہو کر رامیشورم جائے گا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ رامیشورم بھارت کے جنوب میں

واقع ہے اور بمبئی سے بڑے طویل فاصلے پر ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اسی وقت کر

گزرنا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میں کیا کر سکتا تھا۔ میں ناگن درگا کے سامنے

ظاہر ہونے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی یادداشت ختم ہو چکی

تھی۔ وہ تو مجھے بالکل نہیں پہچانے گی اور سانپ کو سامنے دیکھ کر شور مچا دے گی اور

بنگلے کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں ناگن کو ذرا سا ڈس دوں تو یہ تو یقینی بات تھی کہ

سانپ کا زہر اسے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے مجھے اگر کوئی سانپ کاٹتا تو میں بھی ہلاک

نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے زہر کے اثر سے ناگن درگا کی یادداشت واپس آ

جائے۔ یہ اندھیرے میں تیر چلانے والی بات تھی۔ ہو سکتا تھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر جا کر

لگے۔ اس کے امکانات سو میں سے ایک فیصد تھے۔ لیکن میں ایک فیصد کو آزمانا چاہتا

تھا۔

ناگن درگا سامنے والے صوفے پر بڑے انداز دلربائی سے ساڑھی سنبھال کر بیٹھی

دیوار پر لگی تصویروں کو اور کبھی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ میں وقت ضائع کرنے کی

پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں رینگتا ہوا صوفے کے پیچھے آ گیا۔ ناگن درگا صوفے پر بازو

پھیلائے ہوئے تھی۔ اس کا بازو آستین سے نیچے تک عریاں تھا۔ یہی میرا ٹارگٹ تھا۔

میں صوفے کی پشت پر چڑھ گیا اور مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر ناگن درگا کے بازو پر ڈس

دیا۔ ناگن درگا نے جلدی سے اپنا بازو جھٹک کر اٹھالیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پیچھے

دیکھنے لگی۔ میں اتنے میں صوفے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

ناگن درگا اپنے بازو کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہو گئی۔ اچانک ناگن درگا میری آنکھوں کے سامنے سے غائب

ہو گئی۔ میں اچھل کر صوفے کے اوپر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے

دیکھا کہ ناگن درگا کی جگہ ایک چھوٹا سانپ صوفے کے قریب قالین پر بیٹھا میری طرف

دیکھ رہا تھا۔ مجھے ناگن درگا کے سانپ کے جسم کی تیز بو آنے لگی۔ ناگن درگا سانپ کا

روپ اختیار کر چکی تھی۔ میں نے انسانی آواز میں کہا۔

”درگا! درگا! میں کرم داد ہوں۔“

ناگن درگا تیزی سے رینگ کر میرے پاس آ گئی اور عورت کی آواز میں بولی۔

”ہے بھوان۔ کرم داد! میں کہاں ہوں؟“

میں نے کہا۔

”یہ لمبی کمٹی ہے، پھر بتاؤں گا۔ ابھی تم میرے ساتھ ایک طرف چھپ جاؤ۔ جلدی کرو، وہ لوگ آرہے ہیں۔“

مجھے مدراسی دلال، جیکی لور ویرو چاچا کی آوازیں سنائی دی تھیں جو کمرے میں واپس آرہے تھے۔ ناگن درگا جلدی سے میرے ساتھ رینگ کر بڑی الماری کی اوٹ میں ہو گئی۔ تینوں آدمی اندر آکر حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مدراسی دلال نے پوچھا۔

”وہ چندا کمل چلی گئی ہے جی؟“

ویرو اور جیکی گھبرا سے گئے تھے۔ ویرو نے کہا۔

”ہمیں کہیں ہوگی، کمل جاسکتی ہے۔“

پھر انہوں نے ناگن درگا کو چندا رانی، چندا رانی کہہ کر آوازیں دینی شروع کر دیں۔ مگر ناگن درگا وہیں عورت کے روپ میں ہوتی تو انہیں دکھائی دیتی۔ وہ تو سانپ کی شکل میں میرے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ میرا چلایا ہوا تیر اندھیرے میں ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا اور ناگن درگا کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔

”کرم دادا! یہ کون لوگ ہیں؟“

میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”اس وقت خاموش رہو، تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

مدراسی دلال نے جھنجھلا کر کہا۔

”اوپر جا کر دیکھو جی، باہر جا کر دیکھو جی۔ عورت بھاگ گئی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی جی۔“

ویرو بلا۔

”گھبراؤ نہیں سیٹھ، چندا کہیں نہیں جائے گی۔ آؤ جیکی باہر چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ دونوں باہر گئے تو مدراسی دلال بھی بڑبڑاتا ہوا ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ ناگن

درگا نے سرگوشی میں پوچھا۔

”کرم دادا! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے اسے کہا۔

”میرے ساتھ آ جاؤ، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

میں ناگن درگا کو لے کر بنگلے کے ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا اسے بنگلے کے پیچھے لے آیا جہاں اندھیرا تھا اور چھوٹا سا ویران باغیچہ تھا۔ ناگن درگا مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ ہم لوگ کمل ہیں، یہ کون سی جگہ ہے؟ میں اسے یہی کہہ رہا تھا کہ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی آئے۔

”پہلے یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔“

بہائی شہر کے اس علاقے میں میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس طرف کھلی جگہ تھی۔ دور سمندر تھا اور ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ کہیں کہیں ٹاریل کے جھنڈ تھے ہم ان درختوں میں آگئے۔ یہاں میں نے ناگن درگا کو شروع سے لے کر آخر تک ساری کمٹی، سارے واقعات بیان کر دیے۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ کہنے لگی۔

”کرم دادا! یہ بھیروں دیوتا کے سراپ (بد دعا) کا اثر تھا تمہارے ڈننے سے اس بد دعا کا اثر ختم ہو گیا ہے۔ مگر کچھ پتہ نہیں کہ میری یہ حالات کب تک برقرار رہ سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے یقین ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو گئی ہو اور تم پر بد دعا کا اثر باقی نہیں رہا۔“

ناگن درگا نے اداس ہو کر کہا۔

”لیکن میں انسانی روپ سے ایک بار پھر سانپ میں تبدیل ہو گئی ہوں۔ بڑی مشکل سے مجھے اس سے نجات ملی تھی۔“

میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور ساتھ ہی مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے ناگن درگا سے کہا۔
 ”درگا! میری کلیا پلٹ ہونے والی ہے۔ میرا جسم بھاری ہونے لگا ہے۔ مجھے جھٹکا بھی لگا ہے۔“

ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔
 ”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، اس طرح نہ صرف تم انسانی روپ میں آ جاؤ گے بلکہ میرا منہ چوم کر مجھے بھی عورت کی شکل میں واپس لا سکو گے۔“
 میں نے اسے کہا۔

”یہاں سے باہر چلے چلتے ہیں۔“
 ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک طرف ریٹکنے لگے۔ مجھے بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں رک گیا۔
 ”درگا! یہاں رک جاؤ۔“

ناگن درگا بالکل میرے سامنے آ کر کنڈل مار کر بیٹھ گئی۔ اس کے فوراً بعد میں سانپ کی بجائے انسانی شکل اور انسانی جسم کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔

”کرم دادا! جلدی سے میرا منہ چوم لو تاکہ میں بھی عورت کی شکل میں واپس آ جاؤ۔“
 میں نے کہا۔

”کہیں کچھ اور نہ ہو جائے درگا۔ پہلے بھی اس طرح تمہارا منہ چومنے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔“
 اس نے کہا۔

”تم جلدی سے میرا منہ چومو۔“
 میں نے ناگن درگا کو اٹھایا اور پھر اس کے سانپ والے منہ کو سخت پیزاری کے

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا درگا!“
 وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔

”کرم دادا! تم نے میری خاطر جو کچھ کیا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ مگر ہم دونوں اس وقت سانپوں کے روپ میں ہیں اور ہمیں میں ہیں۔ یہاں سے ہم جہاں بھی گئے راستے میں ہمارے لیے بے شمار خطرے ہوں گے۔“
 میں نے کہا۔

”ہم یہاں سے بھوپال جائیں گے، میں وہاں اپنے دوستوں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔“
 ناگن درگا کہنے لگی۔

”مجھے معلوم ہے میں جہاں بھی گئی بھیروں دیوتا کی بد دعا میرا پیچھا کرے گی۔ کچھ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔ میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ میں تمہیں بھوپال چھوڑ کر آگے اپنے گاؤں لکشمی پور چلی جاؤں گی۔ میرا جو بھی انجام ہوگا میں اسے جھیل لوں گی۔“
 یہاں ایک بات میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ اگر راستے میں میرے ساتھ کوئی حلوہ پیش آگیا اور دیوتاؤں کی بد دعا کے اثر سے میں زخمی ہو گئی یا میرا جسم کٹ گیا تو تم میری محبت کی خاطر صرف اتنا کرنا کہ میرا زخمی یا کٹا ہوا جسم لے کر سیدھا ستھرا شرچلے جانے۔ وہاں شر سے باہر ایک ویران شمشان بھوی ہے۔ اس کو راجہ کی شمشان بھوی کہتے ہیں۔ وہاں جس جگہ ہندو لوگ اپنے مرنے والے جلاتے ہیں اس کی راکھ میں مجھے دبا دیں۔ دو دن کے بعد رات کے وقت آ کر مجھے وہاں سے نکال لینا، میں بالکل ٹھیک ہو چکی ہوں گی۔“

میں نے کہا۔
 ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر راستے میں ایسا کوئی حلوہ پیش آگیا تو میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا۔“

ساتھ اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر چوم لیا۔ مگر جیسی کہ مجھے توقع تھی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ناگن درگا سانپ ہی کی شکل میں رہی۔ اس نے کہا۔

”کرم دادا! ایک بار پھر میرا منہ چومو۔“

میں نے ایک بار پھر ایسا ہی کیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور ناگن درگا ویسے سانپ کی شکل میں ہی رہی۔ اس نے بڑی آزر دگی سے کہا۔

”کرم دادا! میں دیوتا کی بد دعوئوں کے اثر میں ہوں، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔“

تم بھوپال چلے جاؤ مجھے قسمت جمل لے جائے گی، چلی جاؤں گی۔“

لیکن میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ اپنی ایک مخلص دوست کو جو مجھ سے بے پناہ محبت بھی کرتی تھی یوں کمپرسی کے عالم میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے ناگن درگا کا منہ پھر چوم لیا۔ لیکن اس بار صرف محبت کی وجہ سے چوما اور کہا۔

”درگا! میں تمہیں اکیلی نہیں چھوڑوں گا۔ ایک طرف تمہارے دیوتا تمہارے

دشمن ہیں، دوسری طرف دنیا والے تمہیں مارنے کو دوڑیں گے۔ تم میرے ساتھ چلو

گی۔ جہاں میں رہوں گا تم بھی اس وقت تک میرے ساتھ رہو گی جب تک تم اپنی

اصلی شکل میں واپس نہیں آ جاتی۔ پھر میں تمہیں خود تمہارے گاؤں چھوڑ آؤں گا۔“

میں نے ناگن درگا کو اپنی جیکٹ کی باہر والی جیب میں ڈالا اور جس طرف بمبئی شہر

کی روشنیوں نظر آ رہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ میدان پار کر کے میں بڑی سڑک پر

آیا تو وہاں میں نے جیکلی اور دیو چاچا کو دیکھا جو ناگن درگا یعنی چندا کی تلاش میں ناکام

ہو کر ایک طرف کھڑے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔ انہیں معلوم ہی نہیں

تھا کہ جس عورت کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں وہ اس وقت

میری جیب میں ہے۔ اس وقت اگر میں سانپ کے روپ میں ہوتا تو ان بد معاشوں کو

کبھی زندہ نہ چھوڑتا۔

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میری جیب میں کوئی پیسہ

نہیں تھا۔ ناگن درگا میری جیب میں سے سر تھوڑا سا باہر نکالے ہوئے تھی۔ اس نے

جیکلی اور دیو چاچا کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں بالکل نہیں پہچانا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”ابھی جو دو آدمی پیچھے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے جانتی ہو وہ کون لوگ ہیں؟“

ناگن درگا نے کہا۔

”معلوم نہیں، کون تھے وہ؟“

میں نے کہا۔

”بس کوئی تھے، اب ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔“

وہ ضد کرنے لگی آخر میں نے اسے بتا دیا کہ وہ دیو چاچا اور جیکلی تھے۔ درگا ناگن نے کہا۔

”کرم دادا! تمہیں خدا کی قسم ہے، میںیں ٹھہر جاؤ۔“

میں ذرا ٹھہرا تو ناگن درگا جیکلی کی طرح میری جیب میں سے اچھل کر سڑک پر

گری اور فٹ پاتھ کی روشنی میں میں نے اسے دیو چاچا اور جیکلی کی طرف دوڑتے

دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ جیکلی اور دیو فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ

واپس جا رہے تھے۔ میں ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اچانک پہلے دیو چاچا گرا۔ اس

کو سنبھالتے ہوئے جیکلی بھی فٹ پاتھ پر اس کے اوپر ہی گر پڑا۔ گرنے کے بعد دونوں

میں سے کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ اتنے میں ناگن درگا فٹ پاتھ پر ایک طرف

لہرا لہرا کر تیزی سے ریگیتی میری طرف آتی دکھائی دی۔ قریب آئی تو میں نے اسے

جھک کر اٹھایا۔ وہ بولی۔

”میں نے ان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ ان لوگوں کو زندہ رہنے کا

کوئی حق نہیں ہے۔“

میں نے اسے جیب میں ڈال لیا اور کہا۔

”تم نے ٹھیک کیا ہے۔ اب ہمیں بمبئی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچنا ہے اور میرے

پاس بس کا بھی کرایہ نہیں ہے۔ بھوپال کے کرائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

نامن درگا نے کہا۔

”کرم دادا! تم نے کمائیوں میں ضرور پڑھا ہو گا کہ زمین کے اندر جو خزانے دفن ہوتے ہیں ان پر ایک سبب ہمیشہ ہوتا ہے جو ان خزانوں کی حفاظت کرتا ہے۔“

”ہاں۔ پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے۔“ میں نے چلتے ہوئے کہا۔

نامن درگا بولی۔

”میل زمین کے نیچے کسی خزانے کا تو مجھے علم نہیں ہے مگر میں کسی کو مٹی کے اندر سے تمہیں کچھ نوٹ لا کر دے سکتی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”میں تمہیں ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ کو مٹی میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا؟ کسی کی نظر بھی پڑ گئی تو سب ڈانگ سوئے لے کر تمہارے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔“

”تو پھر تم کیا کرو گے؟ ریل گاڑی میں تو تم بغیر ٹکٹ کے سفر کر سکتے ہو مگر بس میں تو کنڈکٹر تمہیں ٹکٹ کے بغیر داخل نہیں ہونے دے گا۔“

میں نے کہا۔

”میں شیش تک پیدل بھی جا سکتا ہوں۔“

درگا خاموش رہی۔ میں نے راہ گیر سے شیش کا راستہ پوچھا اور اس طرف چل پڑا۔ سڑکیں بڑی طویل تھیں۔ بڑا شر تھا۔ ایک سڑک شروع ہوتی تو ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ ویسے بھی شہر کے باہر کے علاقے میں تھا۔ چلتے چلتے لوگوں سے پوچھتے پوچھتے میں بمبئی شہر کی بارونق سڑکوں پر آ گیا۔ ان سڑکوں کی دونوں جانب روشن عمارتیں اور ان کے قلیٹ تھے۔ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا اس بازار میں ایرانی ہوٹل بھی تھے۔ نامن درگا میری جیب میں سے سر ڈرا سا نکالے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ایرانی ہوٹل کے مالک کو کرنسی نوٹ کاؤنٹر پر ایک طرف رکھتے دیکھا تو بولی۔

”تم یہیں ٹھہرو“ میں ابھی آتی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔

”کمال جا رہی ہو؟“

مگر وہ میری جیب سے سڑک پر چلا گیا لگا چکی تھی۔ یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ میرے لیے بمبئی سے بھوپال تک کے کرائے اور کھانے پینے کے لیے ایرانی ہوٹل کے کاؤنٹر پر سے کچھ کرنسی نوٹ چرانے کے لیے گئی تھی۔ میں بکا بکا سا ہو کر اسے سڑک پر ہوٹل کی طرف دوڑتے دیکھتا رہ گیا۔ سڑک پر کلنی روشنی تھی۔ ایک لڑکے کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اس نے شور مچا دیا۔

”سبب! سبب!“

یہ سنتے ہی میں نامن کو بچانے کے لیے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ مگر اتنے میں کچھ لوگ نامن درگا کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ کوئی زمین پر سے پتھر اٹھا کر مار رہا تھا، کوئی اس پر جوتا پھینک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں نامن کے پاس پہنچوں ایک آدمی نے نامن درگا پر زور سے ایک پتھر پھینکا جو اس کو جا کر لگا اور اس کا جسم دم سے ذرا اوپر کٹ کر الگ ہو گیا۔ اس کی دم الگ تڑپنے لگی اور باقی کا دھڑا لگ تڑپنے لگا۔ میں نے فوراً نامن درگا کے جسم کے دونوں ٹکڑوں کو اٹھایا اور جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگتا چلا گیا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کوئی بھی میرے پیچھے نہ آیا۔ میں ایک چھوٹی سڑک میں مڑ گیا۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر نامن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ دونوں خون آلود تھے۔ میں نے غم آلود آواز میں کہا۔

”درگا! یہ تم نے کیا کر دیا۔ تمہیں باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔“

تب نامن درگا نے کمزور آواز میں کہا۔

”کرم دادا! تم بغیر ٹکٹ تو بھوپال تک سفر کر سکتے تھے مگر تمہارے پاس کھانے پینے کے لیے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میں ایرانی ہوٹل سے تمہارے لیے کچھ رقم چرانے کے

لے گئی تھی۔

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ناگن درگا کے دونوں گلہوں کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

”درگا! تم نے ایسا کیوں کیا؟“

ناگن کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

”کرم دادا! مجھے جتنی جلدی ہو سکے ستر اشہ کے راجاؤں کے پرانے شمشان میں لے چلو اور جیسا میں نے تمہیں کہا تھا ویسے ہی کرو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی، میرا جسم جڑ جائے گا۔“

میں نے پوچھا۔

”تمہیں تازہ مردے کی راکھ میں تین دن تک ہی دفن رکھنا ہے؟“

اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ ناگن درگا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اب مجھے بھوپال نہیں جانا تھا، مجھے ناگن درگا کے جسم کے گلہوں کو لے کر ستر ا جانا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ ستر اشہ بہی سے دلی کی طرف جاتے ہوئے آتا تھا اور بہی سے کلنی دور تھا۔ ایک ٹرین اندور سے ہوتی ہوئی اجیر شریف کی طرف جا رہی تھی۔ ایک آدمی نے مجھے بتایا اس ٹرین میں بیٹھ جاؤ۔ اندور سے دلی کے لیے گاڑی بدل لینا۔ میں بغیر ٹکٹ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ناگن درگا کے گلے میں نے روہل میں پیٹ کر جیب میں رکھ لیے تھے۔ اندور سے میں دلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں گاڑی بھوپال، جھانسی، آگرہ، ستر اشہ سے ہوتی ہوئی دلی کی طرف جا رہی تھی۔ یہ ستر بھی بڑا لمبا تھا۔ رات گزر گئی، دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رات ہو چکی تھی جب گاڑی ستر اشہ پہنچی۔ راستے میں ناگن درگا کو میں دیکھ لیتا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ میں نے اسے بلانے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

سفر کے دوران ایک مسافر سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ کھانا

وغیرہ کھلا دیا تھا۔ ستر اشہ میرے لیے بالکل نیا شہر تھا۔ یہ ہندوؤں کا پوتر شہر ہے اور میں بے شمار مندر ہیں۔ اسے مندروں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ میں نے ایک آدمی سے راجا کی شمشان بھوی کا پتہ پوچھا اور پیدل ہی اس طرف چل پڑا۔ شہر بڑا عجیب تھا۔ تنگ گلیاں بازار تھے۔ ہر قسم کی سواری دیکھنے میں آ رہی تھی۔ کوئی بازار ایسا نہ تھا جہاں ایک آدھ مندر نہ ہو۔ راجا کی شمشان بھوی شہر سے باہر ایک پرانے کھنڈر کے پاس تھی۔ نوٹی پھوٹی چار دیواری کے اندر ایک طرف بوسیدہ سی کوٹھڑی تھی۔ صحن میں مٹی اڑ رہی تھی۔ کونے میں چٹا کا چوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چوترے پر ہندو اپنے مردے رکھ کر جلاتے تھے۔ جس طرح مسلمانوں کے قبرستانوں میں گورکن ہوتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کی شمشان بھوی میں بھی مردے جلاتے والے ہوتے ہیں، انہیں شمشان کے بلوے کہتے ہیں۔ یہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ میں شمشان گھاٹ کے دروازے کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ناگن درگا نے کہا تھا کہ میرے زخمی جسم کو کسی تازہ مردے کی ٹھنڈی راکھ میں دھانا اور پھر تین دن بعد آکر نکالنا۔

میں کسی نئے مردے کی آ رہی کے انتظار میں تھا۔

اتنے بڑے شہر میں مردے آتے ہی رہتے ہوں گے۔ میں کلنی دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ کوٹھڑی میں بھی اندھیرا تھا۔ ناگن درگا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس شمشان گھاٹ پر کبھی کبھار ہی کوئی مردہ لایا جاتا ہے۔ اتفاق سے ایک آ رہی آ گئی۔ مردے کو ہانسی کے بنے ہوئے بھوپال پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے رشتے دار، دوست احباب رام رام کرتے ساتھ چل رہے تھے۔ مردے کو چٹا پر رکھ دیا گیا۔ دیر تک مختلف رسمیں ادا کی جاتی رہیں۔ ایک بلوا بھی کہیں سے آ گیا تھا۔ مردے کی چٹا تیار کی گئی۔ پھر اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ مردے کی راکھ صبح سے پہلے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس آ گیا۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں شہر کی عجیب آہوی والے ایک مندر میں گیا۔ وہاں یاتریوں کو بھوجن پلنی کرایا جا رہا تھا۔ میں نے بھی یاتریوں کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا کھانا کھایا اور یاتریوں کے آشرم

میں جا کر دری پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس جیب میں ڈال رکھا تھا جس میں ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے روہل میں لپٹے ہوئے رکھے تھے۔

میں نے ہاتھ جیب کے اندر اس لیے رکھا ہوا تھا کہ اگر مجھے نیند آ جائے تو کوئی میری جیب میں سے روہل میں لپٹی ہوئی ناگن درگا کو کوئی قیمتی چیز سمجھ کر چرانہ لے جائے۔ نیند نے آنا ہی تھا۔ مجھ پر بھی رات گہری ہو جانے کے بعد نیند کا غلبہ ہو گیا اور میں سو گیا۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب دن کافی ٹھنک آیا تھا۔ مندر کے سدا ورت سے ہی ہلٹے کیا اور شمشان گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شمشان گھاٹ کا چوتراہ خلل تھا۔ مردے کے لواحقین اس کی ہڈیاں جن کو پھول کتے ہیں اکٹھی کر کے لے جا چکے تھے۔ چوتراہ پر صرف راکھ ہی بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی آدمی اوپر لوہر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جیب سے روہل نکالا۔ اس میں سے ناگن درگا کے کٹے ہوئے سانپ کے دونوں ٹکڑوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ناگن درگا مر چکی ہے۔ کیونکہ اس کا جسم آہستہ آہستہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ مجھے وہم سا ہونے لگا کہ ناگن درگا کہیں مرنے تو نہیں گئی۔ میں نے ویسے ہی کیا جیسا ناگن درگا نے مجھے ہدایت کی تھی۔

میں نے ایک طرف سے کلنی راکھ کرید کر ہٹائی اور درگا سانپ کے جسم کے دونوں ٹکڑے رکھ کر لوہر اچھی طرح سے راکھ ڈال کر انیس ڈھلپ دیا۔ اب مجھے اس کی خبر گیری بھی کتنی تھی۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر لگا تھا کہ اگر اس دوران کسی دوسرے مردے کی اڑتھی آگئی اور اسے چتا پر رکھ کر نذر آتش کیا گیا تو ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اگرچہ درگا نے مجھے کہا تھا کہ اس مرگھٹ میں کبھی کبھار ہی کوئی مردہ لایا جاتا ہے جس کا تعلق قدیم راجاؤں کے خاندان سے ہوتا ہے۔ پھر بھی کوئی اڑتھی مردے کو لے کر آسکتی تھی۔ راجاؤں کے قدیم خاندان والوں میں بھی کوئی نہ کوئی مرتا ہی ہو گا۔ میں دیر تک شمشان گھاٹ

یعنی مرگھٹ کی چار دیواری کے اندر ایک طرف ہو کر بیٹھا رہا۔
دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر مندر میں گیا۔ لنگر پر کھانا کھایا اور پھر واپس آکر شمشان گھاٹ میں بیٹھ گیا۔ اسی طرح رات کو بھی مندر سے کھانا کھا کر واپس آ گیا۔ رات مرگھٹ میں گزارنی مشکل تھی۔ یہ خیال بھی تھا کہ میں اگر واپس چلا گیا تو پیچھے کسی مردے کی اڑتھی نہ آ جائے۔ رات کلنی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد جانے لگا تو کسی طرف سے نکل کر ایک کالا بھنگ دہلا پٹلا آدمی میرے سامنے آ گیا۔ پہلے تو وہ مجھے کوئی بد روح لگا کہنے لگا۔

”بھائی میں دیکھ رہا ہوں تم صبح سے یہاں بیٹھے ہو۔ تم کس کی براہ دیکھ رہے ہو؟ یہاں تو مردوں کے بھون بھی کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔“

اس نے مجھے وہ بات بتادی تھی جو میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
”بھیا! میری ماما جی کو یہاں جلایا گیا تھا۔ کسی نے مجھے کیا ہے کہ اگر میں تین راتیں یہاں آکر بیٹھوں تو ماما جی کی آتما مجھے درشن دیں گی۔“
وہ آدمی ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”بھیا! میں یہاں کا بلوا ہوں۔ بیس برس سے یہاں مردے جلا رہا ہوں۔ مجھے تو آج تک کسی کی آتما یہاں دکھائی نہیں دی۔ جلاؤ اپنے گھر جا کر آرام کرو۔“
میں نے کہا۔

”نہیں بھیا! میں تین دن پورے کر کے ہی جاؤں گا۔ مجھے اپنی ماما جی سے بڑی محبت تھی۔ میرا وشواش ہے کہ ان کی آتما مجھے درشن دینے ضرور آئیں گی۔“
بلوا میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ بولا۔

”اپنی ماما سے سبھی کو پیار ہوتا ہے۔ تم نے وشواش کی بات کی ہے تو میں تمہیں یہاں بیٹھنے سے منع نہیں کروں گا۔“

میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس سے مزید وضاحت کی خاطر پوچھا۔
”ہم لوگ سورج نہیں گوت کے ہیں۔ ہم دلی سے مسٹر آئے تھے کہ ماما جی بیمار

ہو کر سورمباش ہو گئیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ ایک شمشان گھاٹ ہے جس پرانے سورج
ہنسی راجا مہاراجوں کے رشتے داروں کی اڑتیاں جلائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے ماتا جی
کے بھوپن کو یہاں لا کر جلايا۔ یہ بتاؤ بھیا! کہ یہاں دن میں دو ایک اڑتیاں تو ضرور
آتی ہوں گی؟“
ہوا کہنے لگا۔

”یہاں صرف سورج ہنسی راجاؤں کی گوت کے مردوں کو جلايا جاتا ہے اور مینے
میں ایک آدھ اڑتیاں ہی آتی ہے۔“
مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھیا میں گھر چلتا ہوں۔ کل رات پھر آؤں گا۔ شاید ماتا جی کی آتما درشن
دینے آجائے؟“

وہ ہنسنے لگا۔ پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”بھگوان کی لیلایاری ہے بھیا۔ میں بھی چلتا ہوں یہاں سے کچھ دور میری
کوٹھڑی ہے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے پاس آ جاؤ۔“
میں نے کہا۔
”شکریہ بھیا!“

شمشان کا ہوا دوسری طرف چل دیا۔ میں شمشان کے پرانے دروازے میں سے
گزر کر شرکی طرف چل پڑا۔ وہ رات بھی میں نے مندر میں گزار دی۔ دو راتیں گزر
گئیں تیسرے دن میں شمشان گھاٹ آیا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں کوئی تازہ مردہ
نہیں جلايا گیا تھا۔ چوتھے پر چتا کی راگہ اسی طرح ٹھنڈی تھی۔ یہ وہاں میری تیسری
اور آخری رات تھی۔ اگلے دن صبح مجھے ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو باہر نکالنا
تھا۔ میں نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔

مندر کے سدا ورت لنگر سے میں تھوڑی سی کچوریاں لے آیا تھا۔ وہی کھا کر بیٹھا
رہا۔ وقت مشکل سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناتا تھا۔ کھلی راتوں کی طرح وہ رات بھی

مجھے آہستہ رات لگ رہی تھی۔ لیکن مجھے ہر حالت میں وہ رات وہیں گزارنی تھی۔
میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں وہیں
لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی میں نیند میں کھو گیا۔ اچانک
میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر زور سے ہلایا ہو۔
میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر صبح کلاب کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔
ناگن درگا نے اپنے جسم کو راگہ سے نکالنے کا یہی وقت بنایا تھا۔ ابھی دن کی روشنی
نہیں ہوئی تھی اور رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا تھا۔ صرف آسمان کے مشرقی افق
پر نیلی نیلی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

میں اٹھ کر چتا کے چبوترے پر آ گیا۔

جس میں نے ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو دھپا تھا وہاں سے راگہ کو کریدنا
شروع کر دیا۔ راگہ کی یہاں موٹی تہ تھی۔ میں راگہ کریدنا چلا گیا مگر ناگن درگا کے
جسم کے ٹکڑے مجھے کہیں نہ ملے۔ میں نے ساری چتا کی راگہ لوہیز ڈالی مگر ناگن درگا
کے جسم کے ٹکڑے جیسے بالکل غائب ہو گئے تھے۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہ خیال بھی آیا
کہ کیسے میری عدم موجودگی میں کوئی کتا آ کر سناپ کے ٹکڑوں کو کھل کر نہ کھا گیا
ہو۔ اسی تذبذب اور ذہنی انتشار کے عالم میں چتا کے کنارے بیٹھا تھا کہ مجھے ایسی آواز
سنائی دی جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہاں کسی جانب بھی کوئی نہیں تھا۔ ماحول پر گہری
خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف شرکی جانب سے مندروں کی گھنٹیوں کی آوازیں کسی
کسی وقت آ جاتی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر چتا کی ساری راگہ کو کھنگال ڈالا۔ ناگن
درگا کے جسم کے ٹکڑے اب بھی نہ ملے۔ اتنے میں وہی درد ناک کراہ کی آواز پھر
سنائی دی۔ میں غور سے آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز دو تین بار سنائی دے کر
خاموش ہو گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ ناگن درگا کی آواز تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے
پکارا۔

”درگلا درگلا کیا یہ تم ہو؟“

درگلا کی تحیف اور بست مدھم آواز آئی۔

”کرم دادا! میں سے چلے جاؤ، چلے جاؤ، چلے جاؤ۔“

اور وہ پھریوں آہستہ آہستہ کراہنے لگی جیسے انتہائی تکلیف کی حالت میں ہو۔ میں

نے فوراً کہا۔

”درگلا! میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو

اور اس طرح کیوں کرا رہی ہو؟“

اب ناگن درگلا کی آواز بڑی دور سے آئی۔

”کرم دادا! چلے جاؤ بھگوان کے لیے چلے جاؤ۔“

اور آہستہ آہستہ اس کی آواز ڈوب کر غائب ہو گئی۔ تب مجھے وہی خوف سا

محسوس ہونے لگا۔ میں چوتھے سے اتر آیا اور شمشان گھاٹ کے شکستہ دروازے کی

طرف بڑھ گیا جیسے ہی میں دروازے سے باہر نکلا میرے سامنے وہی کالا بھینگہ بولا کھڑا

تھلا اندھیرے میں اس کا رنگ اور زیادہ سیاہ ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا تو مجھے اس کے ٹیڑھے

دانت نظر آئے۔ کہنے لگا۔

”ماتا جی کی آتما کے درشن ہو گئے؟“

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہیں۔ درشن ہو گئے ماتا جی کے۔“

اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کہا تمہاری ماتا جی نے؟“

میں نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہہ دیا۔

”ماتا جی نے کہا ہے کہ اب یہاں مت آنا، میں ہانگل ٹھیک ہوں۔“

بولا بولا۔

”تم پر بھگوان نے خاص کرپا کی ہے مورکھ! تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک

مرچکا ہوتا۔“

میں نے کہا۔

”ہاں بھیا! بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔ اچھا رام رام۔“

اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا شرکی طرف چل پڑا۔

سورج نکلنے سے پہلے میں اس مندر میں پہنچ گیا جہاں میں رات کو آکر سو گیا کرتا

تھا اور جس کے لنگر سے میں پوریاں، کچوریاں وغیرہ بھی کھلیا کرتا تھا۔ مندر میں خوب

پوجا پاتھ ہو رہی تھی۔ گھنٹیں بج رہی تھیں۔ میں وہاں ہندو بن کر رہ رہا تھا۔ چنانچہ

مندر کے دروازے میں سے گزرتے ہوئے میں بھی دوسرے پجاریوں کی طرح چھت

کے ساتھ لٹکتی گھنٹیوں کو ہاتھ مار کر بجاتا تھا۔ یہاں یاتریوں کے لیے ایک لمبی بیرک

سی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے یاتری بھی رات کو یہیں سوتے تھے۔ میں اپنی جگہ پر آکر

بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ناگن درگلا ضرور کسی عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ میں دل میں

اس منحوس دیوتا کو برا بھلا کہنے لگا جس کی بد دعا ناگن درگلا کو لگ گئی تھی۔

میرا اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ خود درگلا نے مجھے وہاں سے چلے

جانے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے بھوپال واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔ ایک یاتری سے

پوچھا۔

”بھیا! میں بھوپال واپس جاؤں گا کیا تمہیں معلوم ہے، مستر! سے بھوپال کی طرف

کون سی گاڑی جاتی ہے۔“

یاتری بولا۔

”بھیا! تم تو اپنے شر کے آدمی نکلو۔ میں بھی بھوپال سے آیا ہوں۔ یہ بتاؤ تم

بھوپال میں کھل رہے ہو بھیا؟“

مجھے اس محلے کا نام معلوم تھا جس محلے میں کاننڈو خالد کی کزن سسز کا گھر تھا۔ میں

نے اسی محلے کا نام لے لیا۔ وہ بولا۔

”ہاں ہیں وہ محلہ ہمارے گھر سے کلنی دور ہے۔“

میں نے مزید گفتگو سے بچنے کی خاطر اس سے کہا۔

بھیا! دن کے وقت تو کوئی نہ کوئی گاڑی بھوپال کی طرف ضرور جاتی ہوگی۔“

وہ بولا۔

”صرف ایک ٹرین مسٹر! سے سیدھی بھوپال جاتی ہے جو شام کو سات بجپاس پر دلی سے آتی ہے۔ وہ سیل ٹرین بھی ہے، راستے میں کسی چھوٹے سٹیشن پر نہیں رکتی۔ بلقی گاڑیاں ہر سٹیشن پر رکتی ہیں۔“

میں نے دل میں سوچا کہ سٹیشن پر چل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ بھوپال کی طرف جاتی جو گاڑی بھی ملی اس میں بیٹھ جاؤں گا۔ میں نے دوپہر کا کھانا یا بھوجن مندر میں ہی دوسرے یاتریوں کے ساتھ کھایا اور مندر سے نکل کر سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت آسمان پر ادھر ادھر سے ہول جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سورج کبھی ہالوں میں چھپ جاتا تھا، کبھی دھوپ نکل آتی تھی۔ میں پیدل ہی سٹیشن پر آ گیا۔ ٹکٹ چیکر کی آنکھ بچا کر بج پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک دن کافی چڑھ آیا تھا مگر دھوپ غائب ہو گئی تھی۔ ہالوں نے سارے آسمان کو ڈھلپ لیا تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوائیں بھی چلنے لگی تھیں۔ ویسے بھی شمالی ہندوستان میں سردیوں کا موسم تقریباً گزر گیا تھا اور بہار کی رت ڈیرے ڈال رہی تھی۔

ایک مسافر نے جو میرے قریب ہی بج پر بیٹھا تھا اپنے ساتھی سے کہا۔

”بھیا! اس رات میں برکھا کا ہونا ٹھیک نہیں پر بھگوان کی لیلایاری ہے۔“

بارش کے خیال سے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ریلوے سٹیشن پر بارش سے محفوظ تھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ رہتا تھا۔ اچانک مجھے ناگن درگا کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک سا پڑا۔ آواز میں نے صاف پہچان لی تھی۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ کہیں انہوں نے تو آواز نہیں سنی۔ کیونکہ آواز خاصی قریب سے آئی تھی۔ مگر ان میں سے کسی نے آواز نہیں سنی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے موسم کے بارے میں فصلوں کے

بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

آواز ایک بار پھر آئی۔ ناگن درگا اسی طرح کرا رہی تھی جیسے اسے شدید اذیت دی جا رہی ہو۔ میں بج سے اٹھ کر پیٹ فارم پر ٹھٹھنے لگا۔ تیسری بار آواز سنائی دی تو میں نے آہستہ سے کہا۔

”درگا! کیا یہ تم ہو؟“

ناگن درگا نے کراہتے ہوئے کہا۔

”کرم! دلو! میری مدد کرو، میری مدد کرو۔“

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ یا سن تو نہیں رہا۔ میں ٹھٹھنے ٹھٹھنے پیٹ فارم کے خلیے کے طرف آ گیا تھا۔ درگا کی کرب ناک آواز پھر آئی۔

”کرم! دلو! کرم! دلو! مجھے بچالو، مجھے بچالو۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔

”درگا! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

ناگن درگا نے رک رک کر کہا۔

”کرم! دلو! میں پرانے راج محل کے اندھے کنوئیں میں ہوں۔ مجھے آکر یہاں سے باہر نکالو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اس اندھے کنوئیں سے نکالو۔“

چپکلیں میرا گوشت فوج دی ہیں۔“

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”یہ پرانا راج محل کہاں ہے درگا؟“

اس نے بین کرنے کے انداز میں کہا۔

”کرم! دلو! مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ میں پرانے محل کے تہ خانے کے اندھے کنوئیں میں پڑی ہوں، ہائے ماتا جی، ہائے ماتا جی۔“

اور درگا کے رولے اور بین کرنے کی آواز آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ میں بے چین ہو گیا۔ میں نے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پیٹ فارم پر ہی ایک شخص

سے پرچھا کہ ستر اسی کوئی پرانا راج محل بھی ہے؟ اس نے کلد

مشر سے دو میل چٹم میں آگہ جانے والی ریلے لائن کے پار ہے مگر تم وہاں کیا لینے جاو گے؟ وہاں تو کوئی انسان نہیں جاتا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور ریلے سٹیشن سے نکل کر پرانے راج محل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میں پیدل ہی جا سکا تھا۔ چلتے چلتے میں ستر اشرفی محل کی تہذیب سے چٹم کی طرف دور نکل آیا۔ مجھے ریلے لائن دکھائی دی جو زمین سے اونچی جگہ پر تھی۔ یہاں چھانک تھا ایک بوڑھا اتوی چھانک بند کر رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ جب بوڑھا چھانک بند کر کے ہاتھ میں سبز جھنڈی لیے میری طرف آیا تو میں نے اس سے پرانے راج محل کا پتہ پوچھا۔ اس نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

”وہاں کہیں جا رہے ہو؟ پر وہی معلوم ہوتے ہو؟“

میں نے کلد

”بھابھیں اسے دیکھنا چاہتا ہوں اندر سے آیا ہوں۔“

بوڑھے نے کلد

”گھڑی آ رہی ہے گھڑی گزر جائے۔“

دور سے انجی نے دسل کی سٹی بجلی۔ بوڑھا سبز جھنڈی کھڑی کر کے کھڑا ہو گیا۔ زمین نے وہاں سے دن تھو کر گزرا جتنا تھا زمین آئی اور شور مچائی، زمین ہلاتی، گرد اڑاتی گزر گئی۔ بوڑھے نے جھنڈی لپیٹ کر بٹل میں دھپی۔ ایک طرف کا چھانک کھولا، مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف کا پھونک کھولا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

”اسے سامنے ہے تھلا راج محل۔“

”یہ کہہ کر وہ اپنی کوشنری کی طرف چل دیا۔“

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس طرف مجھے درختوں کے جھنڈوں میں ایک تھک غما غم کی لوہر والی حلق نظر آئی، میں اس طرف چل پڑا۔ یہ جگہ بالکل ویران پڑی تھی۔ سوائے درختوں اور جنگلی خشک جھاڑیوں اور لوہر لوہر ٹھکری ہوئی لہٹیوں اور

دونوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ درخت کبک کے تھے جن کی شاخیں ٹوکیے کھنوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے آنا دیکھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹا ایک کتا بڑبا کر اٹھا اور دوتا ہوا راج محل کے کھنڈر کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے پہلے میں نے کسی کتے کو اس طرح دوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں پرانے راج محل کے کھنڈر کے سامنے کھڑا تھا اس کے ٹوٹے پھوٹے پوسیدہ دروازے کو دیکھ کر ہی بھوتوں اور بدروحوں کا خیال آ جاتا تھا۔ میں نے سوچا میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا دم ہو اور مجھے درگا کی آواز نہ آئی ہو۔

میں نے درگا کا نام لے کر اسے آواز دی۔ جواب میں درگانے ہوئے ہوئے دوتے ہوئے کلد

”کرم دلو! مجھے آکر اندھے کوئیں سے ٹھو“ میری مدد کو۔ کپڑے کھڑے میرا جسم فوج رہے ہیں۔“

میں فوراً اندر جانے کو تیار ہو گیا۔ میں نے پوچھا

”درگا وہ تہہ خندہ کہاں ہے جہاں اندھا کھنوں ہے؟“

درگا کی آواز آئی۔

”راج محل کے بائیں جانب میز صحن لوہر جاتی ہیں لوہر گیلری ہے۔ گیلری کی دوسری طرف سے ایک چھوٹی نیچے اتر کر تہہ خندے میں جاتی ہے۔ دیر نہ کرو کرم دلو! نہیں تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔“

درگا کی آواز پہلے کی طرح دور دورے ہوتے غائب ہو گئی۔ اب مجھے اس بھوت محل میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں بے دھڑک ہو کر کھنڈر محل کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں ہلکا ہلکا اندھیرا اور ٹھنڈک تھی۔ راج محل کے کھنڈر میں داخل ہوتے ہی کچھ اس قسم کی خاموشی نے مجھے گھیر لیا تھا جس میں سے سنہنٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں آگے بڑھا گیا۔ ڈیوڑھی کے آگے بائیں جانب ایک دیوار کے ساتھ میز صحن بنی ہوئی تھیں جو کس بجلی تھیں اور گرد میں ڈھکی ہوئی

تھیں۔ اوپر ایک تنگ سادروازہ نظر آ رہا تھا، دروازے کے پٹ غائب تھے۔

میں آہستہ آہستہ بیڑھیاں چڑھ کر دروازے میں آ کر رک تیل میں نے اندر بھاگ کر دیکھا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی نور ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک گیلری کی دھمکی دی۔ میں گیلری میں آگیا۔ گیلری کا فرش میرے پاؤں تلے اس طرح چرچا رہا جیسے ابھی گر پڑے۔ گد میں سنبھل کر دیوار کے ساتھ ہو گیا۔ بھت اندھیرے میں پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے الو کے بولنے کی آواز آئی۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔ الو کبھی دن کے وقت نہیں بولا کرتے۔ عام طور پر وہ رات کو بولتے ہیں اور ان کی آواز بدھگنی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر مجھ پر ناگن درگا کی مدد کرنے کا بھوت سوار تھا۔ حلاکتہ اس وقت متصل سلیم سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ اب میں آپ کو اپنے دل کی بات بتاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مجھے بھی ناگن درگا سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن اس جذبے کو میں نے اپنے دل میں چھپایا ہوا تھا۔ میں خود اس حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔

گیلری کی دوسری طرف جیسا کہ ناگن درگا کی آواز نے مجھے بتایا تھا کہ ایک تنگ بیڑھی نیچے جاتی تھی۔ بیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے بیڑھیاں اترنے لگا۔ جیسے جیسے میں نیچے اتر رہا تھا بیڑھیوں میں پھٹکی پھٹکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ خدا جانے یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ کیونکہ وہاں کوئی موسم ہی یا چراغ بھی نہیں جل رہا تھا۔ آخری بیڑھی کے آگے مجھے ہلکی روشنی میں ایک تہوت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں برا حیران ہوا۔ ہندوؤں کے مٹوں اور قلعوں میں اس قسم کے تہوت دیکھنے میں نہیں آتے۔ یہ تہوت عام طور پر بیسیائیوں کے قلعوں کے کنڈروں میں ہوتے ہیں۔ تہوت پر گرد کی تہ جی ہوئی تھی۔ اس تہوت کے بارے میں ناگن درگا نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ چھوٹا سا تہ خنہ تھا جس میں آدمی سے زیادہ جگہ تہوت نے گھیر رکھی تھی۔ وہاں کوئی اندھاکنواں بھی نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں غلط تہ خالے میں تو نہیں آگیا۔ میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ناگن درگا کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ

کہہ رہی تھی۔

”کرم دلو! اندھاکنواں اس صندوق کے اندر ہے۔ اس کے اندر آ کر مجھے باہر نکالو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں کرم دانا میری مدد کرو۔“

ناگن درگا کی آواز میں رحم کی التجا تھی۔ میں نے کہا۔

”درگا! گھبراؤ نہیں میں تمہاری مدد کرنے آ رہا ہوں۔“

ناگن درگا کی آواز آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی۔ میں نے جھک کر تہوت کو غور سے دیکھا کہ اس کا کوئی کنڈا نظر آ جائے جس کو اٹھا کر میں تہوت کے اندر داخل ہو سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ تہوت کے اندر ضرور کوئی بیڑھیاں ہیں جو نیچے اندھے کنوئیں میں اترتی ہیں۔ میں تہوت پر جی ہوئی گرد کی تہ کو ہاتھ سے ادھر ادھر ہٹانے لگا۔ تہوت پر سنسکرت یا ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جسے میں نہ پڑھ سکا۔ ایک جگہ مجھے تہوت کا کنڈا مل گیا۔ میں نے اسے اٹھا چلا تو معلوم ہوا کہ تہوت کا ڈھکتا بڑی مضبوطی سے بند ہے۔ میں نے زور لگنا شروع کیا۔ تین چار مرتبہ کی کوشش سے تہوت کا ڈھکتا کھل گیا۔ ڈھکن کے کھلنے ہی میرے ارد گرد بھیاک چیخوں اور رونے کی آواز گونجنے لگیں اور پیچھے سے کسی نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں منہ کے بل تہوت میں گر پڑا۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے تہوت کا ڈھکتا زور سے بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھیاک مردانہ آواز بلند ہوئی۔

”تم درگا کے پریمی ہو۔ میں تمہیں بھی سراپ دیتا ہوں۔ اب تم ساری عمر اس تہوت کے اندر رہو گے۔ تمہاری ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی۔“

ایک ہولناک قسم کے قہقہے کی آواز آئی اور تہوت والی کوٹھڑی میں موت کا سناہ چھا گیا۔ میں گھپ اندھیرے میں پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ میرا خیال تھا کہ تہوت میں اتنی ہی جگہ ہوگی کہ میں سٹ کر لیٹ سکوں گا لیکن تہوت میں کٹنی جگہ تھی۔ میرا ہاتھ کسی گول ٹھنڈی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اسے ٹھلا۔ یقین کریں دہشت سے میری مٹی ٹٹکتے ٹٹکتے رہ گئی۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ

بیچے کر لیا۔ پھر تہمت یوں اپنے آپ تلے لگا جیسے باہر بھونچل آگیا ہو۔ میں تہمت کے فرش سے چٹ گید۔ تہمت لوہر کو اٹھا پھر نیچے ہو گیا پھر لوہر کو اٹھا اور جیسے وہ ایک طرف کو چلے لگا میں خوف زدہ بھی تھا اور سخت گھبرایا ہوا بھی تھا کہ یہ اچانک سب کچھ کیسے ہو گیا۔ یہ بات حجت ہو چکی تھی کہ مجھے بھیسوں کے منحوس دیوتا نے دھوکے سے مانگن درگا کی توازن دے کر وہاں لا کر بند کر دیا ہے۔ میں نے تہمت کے اندر لوہر کو زور زور سے کئے مارے کہ شاید تہمت کھل جائے مگر وہ تو جیسے لوہے کا بنا ہوا قلعہ ڈھکن اس طرح بند ہو گیا تھا کہ جیسے لب قیامت تک نہیں کھلے گا۔ مجھے آدمیوں کے قدموں کی بھاری چاپ سٹکی دے رہی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے چیخ کر کہا۔

”تم لوگ کون ہو؟ مجھے باہر نکالو۔“

میں نے وہ تین بار توازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ قدموں کی چاپ ایک جگہ رک گئی۔ تہمت کو زمین پر رکھ دیا گیا۔ اس کے ساتھ قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی اور پھر قبر بیا سکت چھا گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ تہمت کن لوگوں نے اٹھایا اور اسے کھل رکھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے چوں پھیلانے تو وہ تہمت کی پانچنی کی دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ میں نے تہمت کے اندر اندر میرے میں ہاتھوں سے ٹٹلا۔ ایک بار پھر میرا ہاتھ انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ میں نے کھوپڑی کو اٹھایا۔ کھوپڑی کے سر پر ہاتھ پیرا تو وہاں دو لٹخ لبا لٹک قلعہ لگا تھا کہ یہ کسی ایسے آدمی کی کھوپڑی ہے جس کو سر پر کھوار یا کھڑے کی ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس صو کے جتوؤں اور ہانگوں کی ہڈیاں بھی تہمت کے اندر ہی پڑی تھیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر درگا کو توازن دے کر پھار۔ مگر درگا وہاں ہوتی تو مجھے جواب دیتی۔ یہ سارا آسمانی کھیل تو اس منحوس دیوتا نے کھیلا تھا اور وہ درگا نہیں تھی بلکہ کوئی بد مدح تھی جس نے مجھے روئے رلانے کے جل میں پھنسا کر یہاں لا پھنسیا تھا۔

مجھے آہستہ آہستہ یاد تھی۔ میں نے دل میں آہستہ آہستہ پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک ماری اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر سوچنے سمجھنے اور بھاری سے

بھاری شکل کا مقابلہ کرنے کی طاقت آگئی ہے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تہمت کی ہمت کو قہقہہ کر پورا زور لگا دیا مگر تہمت نہ کھٹک کر تہمت میں تہہ ہوا ضرور کسی طرف سے آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس میں ہوا کے لیے چھوٹے سوراخ کیسے کھسے ہوں۔ جس گری، جس اور پیسے نے میرا براہِ عمل کر دیا تھا میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے تہمت میں لینے لینے کتاوت کر دیا تھا۔ انسانی قدموں کی چاپ ایک بار پھر آنے لگی۔ اسی طرح میرے تہمت کو لوہر اٹھایا گیا اور جیسے اسے لے کر پر اسرار لوگ ایک طرف کو چل پڑے۔ وہ ایک جگہ زینہ اترے۔ پھر ایک زینہ لوہر چڑھنے لگے اور اسی جگہ سے گزرے۔ جس نے مجھے تہمت کے اندر باہر کی تہہ ہوا کا احساس ہوا۔ میں نے تہمت کی ہمت اور دیواروں پر اندر سے ہمت کے مارے، چھٹا چھٹا مگر باہر کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پر اسرار قوی میرے تہمت کو اٹھانے چلے رہے۔ پھر پر اسرار قوی ایک جگہ رک گئے۔ یہاں میرے تہمت کو کسی جگہ نکلیا جانے لگا۔ تہمت نیچے نیچے جا رہا تھا۔ پھر وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔ تہمت کے لوہر کسی جگہ کے کرنے کی توازن آئی۔ شاید یہ وہ رستہ تھا جس کی مدد سے تہمت کو کسی کو نہیں یا کسی کھنڈ میں اٹھا دیا گیا تھا۔ ایک بار پھر موت کی خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سہیل کی پھنکار کی توازیں سٹکی دیں۔ سہیل سے مجھے کوئی ڈر خوف نہیں تھا بلکہ مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا تھا کہ تہمت کے اندر آ کر کوئی سہل مجھے دس دے اور میں انہیں سے سہل کے روپ میں تبدیل ہو جاؤں۔ سہل کے روپ میں بدل جانے سے میں تہمت کے قلعہ میں منحوس جگہ سے بھی فرار ہو سکتا تھا۔



رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

سناپ اسی طرح مجھے مسلسل دیکھ رہے تھے۔

کھائی کی دیوار جہاں زمین کے ساتھ ملتی تھی وہاں ایک جگہ مجھے گول پتھر لگا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے فوراً سے دیکھا یہ پتھر تھوڑا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ میں نے اسے زور لگا کر اپنی طرف کھینچا تو وہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے پتھر ہٹا دیا۔ اس کے پیچھے مجھے غار سا نظر آیا۔ میں نے جلتا ہوا دیا ہاتھ میں لے کر غار میں روشنی ڈالی۔ اندر پتھر بلا راستہ تھا جو اوپر کو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس راستے کے ذریعے باہر سے بارش و فیوہ کا پانی کھائی میں جمع کیا جاتا ہو گا۔ میں پتھر لیے راستے کی چھانکی چڑھنے لگا۔ اس غار نے مجھے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں دیواروں پر بڑی ڈراؤنی صورتیں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی صورتی ایسی نہیں تھی جس کے دانت اور زبان باہر نہ نکلی ہوئی ہو۔ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا میں وہیں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں منہس صورتوں کو دیکھنے لگا کہ شاید ان کے پیچھے یا درمیان میں کوئی راستہ وہاں سے باہر نکلتا ہو۔ ان صورتوں میں جو سب سے بڑی اور ڈراؤنی موتی تھی اس کی زبان سب سے زیادہ لمبی تھی اور اس کے چہیت تک نیچے آئی ہوئی تھی۔ اچانک زبان نے ہٹا شروع کیا۔ وہ میری طرف بڑھنے لگی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ سرخ رنگ کی زبان کسی سناپ کے پھن کی طرح میری طرف لہرا لہرا کر چلی آ رہی تھی جیسے مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر نگل جانا چاہتی ہو۔ میں جس طرف بچ کر جاتا تھا زبان اسی طرف آ جاتی تھی۔ اس دور میں دوسری صورتوں نے بھی اپنی اپنی سرخ زبانیں ہلاتا شروع کر دی تھیں۔ ان کے منہ سے ڈراؤنی آوازیں بھی نکلنے لگی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس طرح ڈرتا رہا تو یہ صورتیں جو ضرور کسی جلدوٹونے کے زیر اثر ہیں مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی، مجھے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جیسے ہی بڑی صورتی کی سب سے لمبی زبان میری طرف بڑھی میں نے اسے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ مجھے زور وار جھٹکا لگا اور میں دیوار



سناپوں کی پینکار بڑے قریب سے تہوت کے چاروں سے آنے لگی تھیں۔ سناپ تہوت کے کے لوہر بھی ریگتے محسوس ہو رہے تھے۔ اچانک تہوت نے اسی طرح ہٹا شروع کر دیا جس طرح وہ پہلے بھی ہٹا تھا مگر اس دفعہ وہ دائیں بائیں ہٹنے کے علاوہ اوپر نیچے بھی ہو رہا تھا۔ تہوت کی حرکت میں شدت آنے لگی۔ پھر وہ لوہر کو اٹھا اور زور سے فرش پر آن کر 'ا' کرتے ہی وہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک گہری کھائی میں ہوں جس کی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے دیسے جل رہے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے بے شمار سناپ لوہر لوہر حرکت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر سناپوں نے اپنا پھن اٹھا کر اپنے چہرے میری طرف کر لیے۔ ان میں سے کچھ سناپ مجھے ڈسنے کے لیے لپکے مگر کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر وہیں رک گئے اور پیچھے ہٹ گئے۔ سارے سناپ کھائی کی دیوار کے ساتھ پھن کھولے بیٹھے میری طرف ٹنگی ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے جسم میں سے کسی ایسے سناپ کی بو آ رہی تھی جو ان کے لیے بڑا مقدس سناپ ہو گا۔ ویسے بھی مجھے ان کے ڈسنے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ پر کسی بھی سناپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں وہاں سے نکلتا چاہتا تھا۔ میں نے لوہر کی جانب دیکھا۔ یہ کھائی ایک کشادہ کنوئیں کی طرح تھی۔ لوہر رات کی تاریکی میں ہڈیوں میں چھپا ہوا آسمان پھیکا پھیکا سا نظر آ رہا تھا۔ دیوئوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ کھائی یا کنوئیں کی گول دیوار اوپر تک گئی ہوئی ہے۔ وہاں پاؤں

”درگا باب مجھے چھوڑ کر نہ چلا۔“

میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اکلکد محبت نے مجھے عشق میں بے باک کر دیا تھا اور مجھے سوائے درگا کی محبت کے اور کسی چیز کا خیال نہیں رہا تھا۔ درگا کا چہرہ اواس اور سادگت تھا۔ وہ اواس اور خلک آواز میں کہنے لگی۔

”جب یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی“ میں جا رہی ہوں۔ میرے جانے کے بعد یہاں دیوار میں جھیس ایک راستے طے گا وہ جھیس اس منحوس جگہ سے باہر نکل دے گا۔“

ناگن درگا کی شکل زیادہ دھندلی ہونے لگی تو میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

”درگا! پھر کب درشن ہوں گے“ پھر کب ملاقات ہوگی۔“

محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ محبت ایک حیرت انگیز جذبہ ہے۔ ناگن درگا کی شکل عتاب ہوتے ہوئے ایک بار پورے آب و تاب سے چمک اٹھی۔ درگا کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پرسکون روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہ میرے بس میں نہیں ہے لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ مرنے سے پہلے جھیس ایک بار ملنے ضرور آؤں گی۔“

اور ناگن درگا کی شکل عتاب ہو گئی۔ میں دیوار کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا رہا تھا جیسے میں کسی ویرانے میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف تند و تیز آندھیلیں چل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں۔ میں فوراً سنبھل گیا۔ جس ناگن درگا کی شکل عتاب ہوئی تھی وہاں ایک راستہ بن گیا تھا۔ میں اس میں داخل ہوا تو کچھ فاصلے پر روشنی دکھائی دی۔ میں آگے چلا گیا۔ یہ روشنی ایک مٹی کے دیبے کی تھی جو غار کے دلہنے پر جل رہا تھا۔ میں غار سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ میں کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ آسمان پر اسی طرح ہل چلائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جس طرف شرکی روشنیوں نظر آ رہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ رات تھی مگر گئی تھی مجھے کچھ پہنہ نہیں تھا۔ میں ایک سڑک پر آیا تو سامنے سترہ

سے جا کھرایا۔ سوریوں کی آوازیں زیادہ ڈر لگتی ہو گئیں۔ بڑی سورتی کی زبان میری گردن کے گرد لپٹ گئی۔ خدا جانے یہ کوئی کلا جلود تھا یا کیا تھا میرا سارا جسم سر ہونے لگا۔ میں نے زبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی مگر میری گرفت ڈھیل پڑ گئی۔ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔

سورتی کی سرخ زبان میری گردن کے گرد لپٹنے لگی۔ سورتی کے منہ سے زبان نکلتی چلی آ رہی تھی۔ میرا دم کھٹنے لگا۔ میں نے خدا کو بلوایا اور سورتی کی زبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک بار پھر جھکا دیا چلا لپٹیں میرے ہاتھ پھسل گئے۔ زبان میں سے تل سا نکلنے لگا تھا۔ میرا سانس رکے لگا۔ میں اس وقت وہاں کسی سہل کی اتنی اندر وار پھنکار کی آواز آئی کہ میری گردن کے گرد لپٹی ہوئی زبان وہیں رک گئی۔ میری آنکھیں سامنے والی دیوار کی طرف تھیں۔ دیوار پر ناگن درگا کی دھندلی سی شکل ابھر آئی۔ اس نے اپنے منہ سے ایسی توانائی نکالی جیسے بجلی کڑک رہی ہو۔ سورتی کی زبان میری گردن پر ڈھیل پڑ گئی اور وہ تیزی سے وہیں سورتی کے منہ میں چلی گئی۔ اسی طرح دوسری سورتیوں کی زبانیں بھی بے حس و حرکت ہو گئیں۔ میں نے درگا کی ابھری ہوئی شکل کی طرف دیکھ کر اس کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

”درگا! درگا! تم میرے پاس کیوں نہیں آتی؟ درگا میں ترج تھلے سلسلے لپٹا دل کھول رہا ہوں میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں میں جھیس اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔“

ناگن درگا کی دیوار میں سے ابھری ہوئی اواس شکل نے ایک ٹھنڈی کہ بھری اور کہا۔

”اکرم دادا! تم نے اس وقت میری طرف ہاتھ بڑھایا ہے جب میں تھلیدی پہنچے سے بہت دور جا چکی ہوں۔ کاش یہ بات تم پہلے کہہ دیتے پھر شاید تھلیدی محبت کی طاقت مجھے دیوتوں سے بھی زیادہ طاقتور بنا دیتی۔“

میں نے کہا۔

شر کے پرانے دروازے پر روشنی ہو رہی تھی۔ یہ دروازہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ مجھے یہاں سے گزر کر ریلوے سٹیشن کی طرف جانا تھا۔ میں ستر اشرف کے گنجان غلوں کی خلی اور سنلن گلیوں میں سے گزرتا ہوا ایک بازار سے باہر نکلنے لگا تو اچانک سامنے سے ایک عورت میری طرف آئی۔

وہ سیدھی میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چیل کی ایک گزوی تھی۔ رات کے سنانے میں وہ عورت مجھے کوئی بد روح لگی لیکن عورت خوش شکل اور نوجوان تھی۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا۔

”یہ گزوی لے جاؤ۔ تمہارے کام آئے گی۔“

اس نے گزوی میری طرف بڑھائی۔ میں نے گزوی پکڑ لی اور پوچھا۔

”تم کون ہو؟ اس گزوی میں کیا ہے؟“

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور گلی میں آگے بڑھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ چند قدم چلنے کے بعد غائب ہو گئی ہو۔ چیل کی گزوی پر ڈھکن چڑھا ہوا تھا۔ میں تیز قدم اٹھاتا بازار سے نکل کر اس میدان میں آ گیا جس کی دوسری جانب ریلوے سٹیشن کی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ میدان میں اندھیرا تھا۔ میدان پار کرنے کے بعد میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گزوی کا ڈھکن کھول کر اندر ہاتھ ڈالا تو ایک پونلی میرے ہاتھ میں آگئی۔ پونلی کو نکال کر کھولا تو اس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا بنڈل تھا۔ بنڈل کو کھولا تو اس میں سے سو سو روپے کے نہ جانے کتنے نوٹ تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھوں میں ناگن درگا کا اداس چہرہ آگیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”درگا! درگا! میرے پاس تمہارا شکر یہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ درگا! میں تم سے پریم کرتا ہوں۔“

یہ میں زبان سے نہیں دل سے کہہ رہا تھا۔ میں نے نوٹوں کو گنا وہ چار ہزار روپے تھے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ لباس گندا

اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ شیو اور سر کے بال کٹنی بڑھ آئے تھے۔ میں نے سٹیشن پر جا کر بھول جانے والی گاڑی پکڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سٹیشن کے باہر آ کر ایک رکشے والے سے پوچھا کہ یہاں سب سے اچھا ہوٹل کون سا ہے۔ اس نے کہا۔

”ہوٹل تو بہت سے ہیں پر کرشنا ہوٹل سب سے اچھا ہے۔ انگریزی فیشن کا ہوٹل ہے۔“

میں نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے کرشنا ہوٹل لے چلو۔“

کرشنا ہوٹل لاہور، اسلام آباد کے اعلیٰ ہوٹلوں کی طرح کا کوئی تھری سٹار ہوٹل تو نہیں تھا لیکن ستر ایسے پرانے شہر میں شاید اس سے بہتر ہوٹل ملنا مشکل تھا۔ سنگل بیڈ روم کا چوبیس گھنٹوں کا کرایہ دو سو روپے تھا۔ کلونٹر پر ایک آدی سوٹ بوٹ پہنے موجود تھا۔ میں نے دو سو روپے ادا کر دیے تو اس نے ایک ملازم کو چابی دے کر کہا۔

”صاحب کو روم نمبر پندرہ میں لے جاؤ۔“

ملازم لڑکے نے مجھے ساتھ لیا اور ہوٹل کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں لے آیا۔ سنگل بیڈ روم تھا صاف ستھرا۔ بستر لگا تھا۔ ہاتھ روم بھی ساتھ ہی تھا۔ میں نے باقی رات نرم آرام دو بستر پر سو کر گزار دی۔ دن کے دس گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ ملازم لڑکا آگیا۔ اس نے ٹاشٹے کا پوچھا۔ میں نے کہا لے آؤ۔ وہیں کمرے میں بیٹھ کر میں نے چائے، مکھن، جام، نوٹ کا بیٹھ کید۔ نوٹ میں نے اپنی بوسیدہ جیکٹ کی اندر والی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ ملازم لڑکے سے میں نے شہر میں کسی ایسی دکان کا پتہ پوچھا جہاں ریڈی میڈ کپڑے ملتے ہوں۔ اس نے ایک مارکیٹ کا پتہ بتایا۔ میں رکشا پکڑ کر مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ ایک دکان پر ریڈی میڈ کلا تھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس دکان میں سے اپنے لیے نئی چٹون، نئی ٹھنڈی جیکٹ، قبض اور جرابیں خریدیں۔ دوسری دکان سے نئے جوتے خریدے اور ہوٹل واپس آگیا۔ کمرے میں آ کر میں نے غسل کید۔ نئے کپڑے پہنے اور بازار میں آ کر بل بنوائے۔ شیو بنوائی اور وہیں

سے ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیا۔ دوپہر کے بعد ایک گاڑی بھوپال جانے والی تھی۔ میں نے ریلوے سٹیشن کی ریفرشمنٹ روم میں کھانا کھلیا۔ گاڑی آئی تو اس میں بیٹہ کر بھوپال کی طرف روانہ ہو گیا۔ بھوپال گاڑی رات کے پچھلے پہنچی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے فضا کو سوگھل فضا میں کلنڈو خالد کی خوشبو نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھوپال میں نہیں ہے۔ میں نئی خفیہ کمین گاہ کے آس پاس ہی تھا کہ وہ جگہ اندھیرے میں سے نکل آئے۔

”کون ہو؟“

میں نے خفیہ کوڈ کے الفاظ بھی بولے اور ساتھ ہی کہہ

”میں کلنڈو کرم دلو ہوں۔“

ان میں سے ایک جگہ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے کلنڈو خالد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ کلنڈو کو کشمیر کے محلہ پر جانا پڑ گیا تھا وہاں بھارتی فوجیوں نے ایک درگاہ شریف کو نذر آتش کر دیا ہے۔ کشمیری مسلمانوں نے احتجاج کرتے ہوئے جلوس نکالا تو ڈوگرہ فوج نے اندھا دھند فائرنگ کر کے کتنے ہی کشمیریوں کو شہید کر دیا۔

”حریت پسند کشمیریوں نے ایک بھارتی فوجی کیمپ پر شب خون مار کر سولہ بھارتی فوجی ہلاک کر ڈالے ہیں جن میں دو افسر بھی تھے۔ اسی لیے کلنڈو خالد کل ع کشمیر کے محلہ کی طرف چلا گیا۔“

میں نے رات خفیہ کمین گاہ میں گزاری۔ میرا وہاں رہنا بیکار تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں کلنڈو خالد سے ملاقات کرنے کے بعد پاکستان اپنی بیوی جیلہ کے پاس جاؤں گا۔ لیکن جب مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی خلدانہ کاروائیوں کے بارے میں سنا اور خاص طور پر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بھارتی فوج نے مسلمانوں کی ایک مشہور درگاہ شریف کو نذر آتش کر دیا ہے تو میرا خون کھول اٹھا اور میں اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ جہاد کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

کلنڈو منظر خالد جاتے ہوئے ان جگہوں کو کہہ گیا تھا کہ اگر کلنڈو کرم دلو آئے تو

اسے کشمیر کے محلہ پر بھیج دینا وہاں جا کر مجھے جس سے ملنا تھا اس کا نام اور خفیہ کوڈ اور حریت پرستوں کی کمین گاہ کے بارے میں بھی بتا گیا تھا۔ بھوپال کے محلہ نے مجھے وہ سب سے روز جب میں کشمیر کی طرف جانے لگا تو کہہ

”حریت پسندوں کی کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک دکان ہے۔“

میں اس دکان کا محل وقوع آپ کو نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی ان حریت پسند کشمیری جگہوں کے اصلی نام بتاؤں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بھوپال کے محلہ نے مجھے بتایا کہ اس خاص دکان پر مجھے ایک توی ٹی گاڑو مجھے کلنڈو اکبر (یہ نام بھی فرضی ہے) کے پاس پہنچا دے گا۔ مجھے کشمیری حریت پرست کلنڈو اکبر کے پاس ہی جانا تھا۔ اسی روز میں بھوپال سے مل جانے والی گاڑی میں بیٹہ گیا۔ مل پہنچ کر میں نے مشرقی پنجاب جانے والی گاڑی پکڑی۔ یہاں میں چلا ہو گیا تھا کیونکہ مل اور مشرقی پنجاب کی پولیس اور ملٹری پولیس کو میں مطلوب تھا اور اٹھلی جینس میری تلاش میں تھی۔ جلدھر کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں پوری طرح سے چوکس تھا۔ یہاں سے مجھے جوں تو ہی کی طرف جانے والی گاڑی پکڑنی تھی جس کے چلنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں جلدھر سٹیشن پر انتظار کرنے کا خطوط مل نہیں لے سکا تھا۔ میں سٹیشن سے نکل آیا۔ قریب ہی لاریوں کے دو ٹوے تھے جن سے ہوشیار پور، گورداسپور اور جوں کی طرف لاریاں چلی تھیں۔

میں جوں جانے والی ایک لاری میں دو سرے مسافروں کے ساتھ بیٹہ گیا۔ میری آنکھیں چاروں طرف ماحول کا روبرو جاننے لے رہی تھیں۔ وہاں مجھے کوئی مشتبہ آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ جس طرح اٹھلی جینس والے مفور طرم کو ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں اسی طرح میں بھی ایک نظر میں اٹھلی جینس کے توی کو پہچان لیتا تھا۔ لاری میں بعد کے سواریاں ہی تھیں۔ کچھ عورتیں بھی بچوں کو لیے بیٹھی تھیں۔ ڈرائیور کہہ تھا جو بار بار شور مچاتا اور مسافروں سے کہتا

”پلو لوئے بیٹہ جوتو میں“ معنی نہیں نہ پڑے۔“

لاری جاندر سے جموں کی طرف چل پڑی۔ لاری سارا رستہ جگہ جگہ رک کر مسافر اٹھاتی رہی۔ کوئی باخبر گھوڑا واقعہ پیش نہ آیا۔ میں خبیثت سے جموں پہنچ گیا۔ جموں سے بے حد حساس علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں جگہ جگہ فوجی بازداروں میں کھڑے نظر آئے۔ بھارت کی حکومت کشمیر پر ناجائز قبضہ جملے کے لیے اپنی فوج کو اندھا دھند موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔ جموں سے مجھے سری نگر جانے والی لاری میں سوار ہونا تھا۔ یہاں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اپنے صاف ستھرے لباس سے میں کوئی سرکاری ملازم لگتا تھا۔ میرے پاس کافی روپے تھے مگر ہتھیار کوئی نہیں تھا۔ کمانڈو چاقو تک نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اور موقع بھی نہیں تھا۔ میں ایک لاری میں بیٹھ گیا جو سری نگر جا رہی تھی۔ لاری جموں شہر سے نکلنے اور دریائے توی کا پل عبور کرنے کے بعد جموں ہانسل روڈ پر تو ایک جگہ فوجی چیک پوسٹ لگی تھی۔ مسلح فوجی سپاہیوں نے لاری کو روک لیا اور مسافروں کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ایک آدمہ مسافر سے اس کا نام وغیرہ پوچھ لیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بڑا معصوم لور بولا بھلا میں کر بیٹھا تھا۔ فوجی سپاہی نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا۔

”ہری کرشن۔“

”کمل جا رہے ہو؟“ دوسرے فوجی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

”سری نگر میں اپنے جیجائی کے پاس جا رہا ہوں وہاں من کی کپڑے کی دکان ہے۔“

ہنومن کلاتھ ہاؤس۔“

دکان کا نام اسی وقت میرے ذہن میں آیا اور میں نے بول دیا۔ فوجی پیچھے ہٹ گیا اور ڈرائیور کی طرف دیکھ کر بولا۔

”لو کے‘ جلو۔“

میں نے سکھ کا سانس لیا اور لاری سری نگر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سری نگر پہنچنے ہی میں شہر سے باہر اس دکان پر پہنچا جہاں بھوپال کے محلہ نے مجھے پہنچنے کی ہدایت کی

تھی۔ وہاں ایک گھوڑا چٹا کشمیری بیٹھا کھم کر رہا تھا۔ دکان میں دو اور آدمی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کوڑو دروازے میں ہات کی تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”مل دکان کے اندر ہے، چل کر پسند کر لیں۔“

وہ مجھے دکان کے اندر ایک کونٹری میں لے گیا۔ کہنے لگا۔

”کس سے ملنا ہے؟“

میں نے کمانڈو اکبر کا نام لیا تو کہنے لگا۔

”بھوپال سے آئے ہو؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں۔“

وہ بولا۔

”تمہاری اطلاع ہمیں پہنچ چکی تھی۔“

پھر اس نے مجھے کمانڈو اکبر کی خفیہ پنہ گاہ کی جگہ بتائی اور کہا۔

”سیدھا وہاں نہ جانا شہر کی دو تین مارکیٹوں میں گھومتے پھرتے رہنا۔ فوج نے

یہاں بڑی سی آئی ڈی چھوڑ رکھی ہے۔“

میں سلام دعا لے کر دکان سے باہر آیا اور اس آدمی کی ہدایت کے مطابق سیدھا کشمیری محلہوں کی خفیہ پنہ گاہ کی طرف جانے کی بجائے سری نگر شہر کے بارونق بازار میں آکر مختلف مارکیٹوں کی دکانوں میں اس طرح گھومتا پھرتا رہا جیسے مجھے کسی چیز کی تلاش ہے۔ ایک چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھلیا۔ چائے پی اور جب شام ہو گئی تو کمانڈو اکبر سے ملنے کشمیری محلہوں کے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ مشرقی پنجاب میں بارہا کا موسم شروع ہو رہا تھا مگر کشمیر میں ابھی سردی تھی اور شام کو سردی زیادہ ہو جاتی تھی۔ میں نے جیکٹ کا کالر چڑھا لیا اور جو راستہ کشمیری دکاندار نے بتایا تھا اس پر چلتے ہوئے محلہوں کی خفیہ پنہ گاہ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ علاقہ چھوٹی بڑی پھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ یہاں چنار کے بوے درخت تھے۔ ایک

درخت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ان کے چہرے بڑے
نعبوں میں چمپے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں بھی کوڑو درڑو دہرایا اور کہا۔

”مجھے کلنڈو اکبر سے ملنا ہے۔ میں بھوپال سے آیا ہوں۔ میرا نام کرم داد ہے۔“

انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے اوپر اوپر سے گھماتے پھراتے
ایک جگہ لے گئے اور میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ میں ایک کوٹھڑی میں کھڑا تھا
میرے سامنے ایک سرخ و سفید کشمیری جوان ٹخنوں پر شین گن رکھے چارپائی پر بیٹھا
مجھے گھور رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم انڈین آرمی کے جاسوس ہو۔ بتاؤ تمہارا اصل نام اور رینک کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”اگر تمہارا نام کلنڈو اکبر ہے تو یقین کرنا میں کلنڈو کرم داد ہوں اور مجھے بھوپال
کے محلہ کلنڈو منظر خلد سے ملنا ہے۔ میں کشمیر کی جنگ آزادی میں آپ لوگوں کے
شانہ بشانہ لڑنے آیا ہوں۔“

اس کشمیری محلہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اٹھ کر مجھے گلے لگا
لیا اور کہنے لگا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم کرم داد ہی ہو سکتے ہو۔ کلنڈو خلد نے مجھے تمہارا حلیہ وغیرہ
سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر بھی تم سے اس قسم کی بات کرنی ضروری تھی۔ میرے ساتھ
آؤ۔“

وہ مجھے وہاں سے ایک اور پنہ گاہ میں لے گیا جو نیلوں کے درمیان جنگی درختوں
اور جنگلی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہاں بھی مسلح کشمیری محلہوں کی مسلح ڈیوٹی گارڈ
موجود تھی۔ کلنڈو منظر خلد کو پتہ چلا تو وہ پنہ گاہ سے نکل کر باہر آ گیا۔ ہم دونوں ایک
دوسرے سے ہنسی ہو کر ملے۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ کلنڈو اکبر بھی ہمارے ساتھ تھا۔
کلنڈو خلد نے مجھ سے میرے سفر کی بہت پوچھا کہ راستے میں کوئی پیچھے تو نہیں لگا
میں نے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔“

چونکہ وہاں کشمیری محلہ کلنڈو اکبر موجود تھا۔ اس لیے خلد نے مجھ سے تاکن درگا
کے بارے میں دریافت نہ کیا۔ کہنے لگا۔

”میں بھارتی فوج نے نئے کشمیری عوام پر ظلم و برصت کی انتہا کر دی ہے۔
درگھ شریف کو غدر آتش کر دیا گیا ہے۔ کشمیری شہری بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شہید
ہو رہے ہیں۔“

میں کلنڈو اکبر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارے محلہوں نے بھی کئی بھارتی فوجی مار ڈالے ہیں۔ گھات لگا کر ان کے کئی
ٹرک اڑا دیے ہیں۔ مگر بھارتی فوج کو برابر کھک مل رہی ہے۔ دو دن میں کئی نئی انڈین
رینجس مقبوضہ کشمیر میں آچکی ہیں۔“

کلنڈو خلد بولا۔

”میں ایک ٹینک رجمنٹ بھی ہے۔ انڈین آرمی اس ٹینک رجمنٹ کی مدد سے
کشمیر میں مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کو جلا کر دینے کا ٹپاک منصوبہ بنا چکی ہے۔
کیونکہ انڈین آرمی کے خیال میں یہی وہ جگہیں ہیں جو کشمیری حریت پسندوں کی پنہ
گاہیں ہیں۔“

کلنڈو اکبر نے کہا۔

”ہم اپنی جگہ کن جواہی کاروائی سے انڈین آرمی ہالی کلنڈو کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ
ہم ان کا ایسا کوئی ٹپاک منصوبہ کھلیا نہیں ہونے دیں گے۔“

کلنڈو منظر خلد نے کہا۔

”اس ٹینک رجمنٹ کا کیمپ شوپیاں کے جنگل میں ہے۔ ہماری ایک پارٹی اس کا
جائزہ لے چکی ہے۔ میں اور کلنڈو اکبر چرواہوں کے بیس میں اس پارٹی کے ساتھ گئے
تھے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا ساری ٹینک رجسٹری اس ایک کیپ میں مقیم ہے؟“
کمانڈو اکبر نے جواب دیا۔

”یہ صرف اس رجسٹری کے ایک بریگیڈ کا کیپ ہے اور یہاں پچاس کے قریب ٹینک ہیں۔ اگر ہم کسی طرح ان ٹینکوں کو بریلو کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بھارتی ہائی کلن دوبارہ یہاں ٹینک رجسٹری کبھی نہیں لائے گی اور ہائی ٹینکوں کو بھی یہاں سے نکل کر جوں کی طرف لے جائے گی۔ ہم انڈین آرمی ہائی کلن کی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک بزدل قوم ہے اور اپنی جہن پچانے کی خاطر لڑتی ہے۔ ہماری طرح اللہ اور اس کے رسول پاک کے نام پر شہید ہونے کے لیے نہیں لڑتی۔“

میں بڑے غور سے کمانڈو اکبر کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے ہندو قوم کی ذہنیت کی بالکل صحیح عکاسی کی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”اس ٹینک بریگیڈ کی حفاظت کے لیے انفنٹری ضرور ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ٹینک رجسٹری کو سپورٹ کے لیے انفنٹری رجسٹری ساتھ رکھی جاتی ہے۔ اس کیپ میں میرے اندازے کے مطابق مارٹر پلاٹون بھی ضرور ہوگی۔“
کمانڈو اکبر کہنے لگا۔

”اس کے متعلق معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”ان معلومات کا حاصل کرنا ہمارے کمانڈو انٹیک کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔“

کمانڈو خالد نے کمانڈو اکبر سے کہا۔

”کیا کل شام تک ہمیں یہ معلومات مل سکتی ہیں کمانڈو اکبر؟“

”کیوں نہیں۔“ کمانڈو اکبر نے کہا۔ ”صبح ہوتے ہی میں دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا

دوں گا۔ شام تک ہمیں ساری معلومات فراہم کر دیں گے۔“

میں نے کہا۔

”اس کے بعد مجھے خود ایک بار اس بھارتی کیپ کا جائزہ لینا ہوگا۔“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”تم کل شام ہی یہ کام کر سکتے ہو۔ کمانڈو اکبر تمہارے ساتھ ہوگا۔ یہ اس

سارے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔“

وہاں سبز چائے کا ستوار آگیا۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ رات کو کھانا کھا کر ہم سو گئے۔ دوسرے دن کمانڈو اکبر نے دو مجاہدوں کو مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی خاطر بھارتی کیپ کی طرف بھیج دیا۔ دونوں مجاہد دوپہر کے بعد واپس آئے۔ انہوں نے واپس آکر جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ فوجی کیپ پر حسرت پسند مجاہدوں کے متوقع حملے کے ذریعے سے بھارتی بریگیڈ کمانڈر کے حکم سے سولہ کے سولہ ٹینک کیپ سے نکل کر چمپل کے نیم پھاڑی جنگل میں ایک جگہ چھپا دیے گئے ہیں۔ یہ جگہ کیپ کے جنوب میں ایک ٹیلے کے دامن میں دو میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں انفنٹری کی پوری ایک کمپنی ٹینکوں کی حفاظت کے لیے تعینات ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مارٹر گروپوں کی ایک پلاٹون بھی کیپ میں موجود ہے۔ میں نے کہا۔

”اگر وہ کیپ میں ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ اب ٹینک

کیپ کے اندر نہیں ہیں۔“

فیصلہ یہ ہوا کہ میں کمانڈو اکبر کے ساتھ چڑھاؤں کے بغیر میں دن کی روشنی میں چمپل کے ٹیلوں میں انڈین رجسٹری کے ٹینکوں کے ہائیڈ آؤٹ دیکھنے جائیں گے۔ یہاں میں یہ بات بتاتا چلوں کہ ہم میں سے اکثر حضرات کو یہ علم ہوگا کہ پھاڑی علاقوں میں کوئی بھی فوج اپنے ٹینک نہیں لے جاتی۔ ٹینک صرف میدانی علاقوں میں ہی اپنی بحرور کارکردگی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں۔ لیکن کشمیر کے علاقے پر مقبوضہ بھارتی فوجیوں کا حسرت پسند کشمیری مجاہدوں کے ہاتھوں اس قدر بھاری جلتی نقصان ہو رہا تھا اور اتنے فوجی مارے جا رہے تھے کہ بھارتی فوجی ہائی کلن وہاں اپنی ٹینک رجسٹری لے آیا تھا۔

اس خیال سے بھی کہ ٹینکوں کی توپوں کو توپ خانے کی توپوں کے طور پر استعمال کیا جائے دوسرے کشمیر کی داوی میں ٹینکوں کی نقل و حرکت نسبتاً آسان تھی اور ان ٹینکوں کی مدد سے مظلوم نئے کشمیری مسلمانوں کے گھروں اور مقدس مقامات کو بل ڈوز کر کے بغیر دھماکے کیے تباہ کیا جاسکتا تھا۔ حال ہی میں مقدس کشمیری خانقاہ کو ٹینکوں نے ہی شہید کیا تھا۔ اگلے روز میں اور کمانڈو اکبر کشمیری چرواہوں کے بھیس میں انڈین ٹینک رجمنٹ کی ٹینک بریگیڈ کے خفیہ ہیڈ آؤٹ دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ کمانڈو اکبر خفیہ نیم پہاڑی علاقوں سے گزر رہا تھا۔ ہمارے راستے میں کئی کھڈے تھے اور کھائیاں آئیں۔ آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہم بلندی پر سے نیچے پھیلی ہوئی چھوٹی سی داوی دیکھ سکتے تھے۔ ہم جھاڑی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اکبر نے مجھے درختوں کا ایک جھنڈ دکھایا۔ کہنے لگا۔

”میری اطلاع کے مطابق انڈین آرمی کے ٹینک ان درختوں میں چھپائے گئے ہیں۔ درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے ایک خشک تالہ ہے۔ میں حمیس دور بین دیتا ہوں۔ اس تالے کو غور سے دیکھو۔“

اس نے اپنے لیے کرتے کے اندر سے چھوٹی دور بین نکل کر مجھے دی۔ میں نے دور بین آنکھوں پر لگا کر درختوں کی جانب دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب مجھے دو فوجی نظر آئے جنہوں نے سروں پر بکس اٹھا رکھے تھے۔ وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف جارہے تھے۔ میں نے وہ فوجی کمانڈو اکبر کو بھی دکھائے اور کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہاں مارٹر گنوں کے مورچے بھی ہیں۔“

کمانڈو اکبر نے دور بین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم درختوں کے پیچھے جو خشک تالہ ہے اس کو بھی غور سے دیکھ لو۔ کیونکہ میرے پلان کے مطابق ہماری کمانڈو پارٹی رات کے وقت اسی طرف سے ایک کرے گی۔“

میں نے دور بین لگا کر درختوں کے عقب پر نگاہ ڈالی۔ وہاں مجھے اونچی جگہ نظر آئی

جس کے پیچھے ایک خشک تالہ تھا۔ تالہ درختوں کے پہلو سے ہو کر آگے چلا گیا تھا۔ یہ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر اس کے کنارے اونچے تھے۔ کمانڈو اکبر کہہ رہا تھا۔

”یہ برساتی تالہ ہے۔ اس میں بارش کے دنوں میں ہی پانی آتا ہے۔ باقی سارا موسم یہ خشک رہتا ہے۔ آج کل بھی یہ خشک ہی ہے۔ ہمیں اس تالے کے اندر سے ہو کر اپنے ٹارگٹ تک آنا ہوگا۔ تالے کے پیچھے ناشپاتیوں کا باغ ہے۔ ہماری پارٹی شام کے وقت وہاں آکر چھپ جائے گا۔ آج کل یہ باغ ویران پڑا ہے۔ ناشپاتیوں کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا۔“

میرے حسب سے جتنی معلومات ہمیں وہاں حاصل ہو سکتی تھیں وہ ہم نے حاصل کر لی تھیں۔ ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ میں نے کمانڈو خالد کو پوری رپورٹ دی اور اس سے پوچھا۔

”ہماری کمانڈو پارٹی میں زیادہ آدمی نہیں ہونے چاہیں۔“

کمانڈو اکبر کہنے لگا۔

”تمہارے خیال میں کتنے آدمی ہونے چاہیں؟“

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ہم تینوں کے علاوہ ایک چوتھا مجاہد ٹھیک رہے گا۔ اس سے زیادہ آدمیوں کی

ضرورت نہیں لیکن آپ کے پاس اسلحے کا کیا انتظام ہے؟“

کمانڈو اکبر بولا۔

”ہمارے پاس ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔ ہم یہ اسلحہ بھارتی فوجی کیپوں پر شب

خون مار کر لاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”ہمیں سب سے زیادہ راکٹ لانچروں کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ٹینک کو صرف

راکٹ لانچر سے ٹکرا ہوا گولہ ہی تباہ کر سکتا ہے۔ پنڈ گرنیز اس کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتے۔“

کمانڈو اکبر نے کہا۔

”ہمارے پاس راکٹ لانچر بھی ہیں اور اس کے گولے بھی ہیں، ہمیں کتنے چاہئیں؟“

شام ہونے تک چار راکٹ لانچر کے علاوہ پچاس ساٹھ گولوں کا انتظام ہو گیا۔ ہم نے چار چار پنڈ گرنیڈ بھی ساتھ رکھ لیے۔ رات جب آدمی سے زیادہ گزر گئی تو ہماری کمانڈو پارٹی بھارتی ٹینکوں کو برہو کرنے اپنے ہائیڈ آؤٹ سے چل پڑی۔ میں تھا، میرے ساتھ کمانڈو خالد تھا، کمانڈو اکبر تھا اور ایک کشمیری مجاہد تھا۔ اسے راکٹ لانچر فائر کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔

آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ ہم ستاروں کی پیمانی روشنی میں اپنے ٹارگٹ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ کمانڈو اکبر ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے راستے سے لے کر جا رہا تھا۔ ہم پیچھے سے ہو کر ٹینک نالے میں داخل ہو گئے۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ کیونکہ دشمن کا حساس علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ جلد جلد سے ایک طرف گھوم جاتا تھا وہیں پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے اپنے تین ساتھیوں کو ٹارگٹ دکھایا اور سرگوشی میں کہا۔

”یہاں سے نکھر جاؤ۔ درختوں کے نیچے ٹینک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ اب ہر کمانڈو کا ٹارگٹ اپنا اپنا ہو گا اور وہ اپنی عقل سے کام لے کر راکٹ لانچر فائر کرے گا۔ ٹارگٹ کا فاصلہ پندرہ بیس قدم سے زیادہ ہوا تو راکٹ ٹارگٹ پر نہیں لگے گا۔ ہر جوان کو کم از کم تین ٹینک ضرور تباہ کرنے ہوں گے۔ خدا حافظ! زندہ رہے تو پھر ملیں گے شہید ہو گئے تو اللہ کے دربار میں ملیں گے۔“

ہم چاروں نکھر گئے۔ میں نالے کے اونچے کنارے کے ساتھ ساتھ جبک کر چل رہا تھا۔ جب مجھے درختوں کے نیچے دو ٹینک بڑے بڑے سیاہ جھنڈوں کی طرح نظر آئے تو میں پیٹ کے بل لیٹ گیا، راکٹ لانچر میری پشت پر تھا۔ راکٹ ایک تھیلے میں تھے۔ میں آہستہ آہستہ ریگ کر ٹینکوں کو نظر میں رکھ کر بڑھ رہا تھا۔ میں فاصلہ کم کرنا

چاہتا تھا۔ میں اس بات سے غافل نہیں تھا کہ یہاں ٹینکوں کی حفاظت کے لیے انفنٹری کے جوان موجود ہیں اور جاگ کر پہرہ دے رہے ہوں گے۔ لیکن مجھے اپنی ڈیوٹی لہو کرنی تھی، اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ ہم لوگ موت کے منہ میں صرف اس لیے آ گئے تھے کہ کشمیریوں کے گھروں، خانقاہوں، مسجدوں کو شہید کرنے والے دشمن کو جتنا ختم کر سکتے ہیں ختم کر دیں اور آزادی کشمیر کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ زندہ واپس جانے کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم میں سے کوئی مجاہد بھی اس خیال سے اس آگ میں نہیں کودا تھا کہ وہ زندہ واپس آ جائے گا۔ ہمارے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کشمیر پر زبردستی قبضہ کرنے والے اور مظلوم کشمیریوں پر وحشیانہ ظلم توڑنے والے دشمن کو تباہ و برباد کیا جائے۔

مجھے یہ فکر ضرور تھی کہ میرے ساتھیوں میں سے اگر کسی سے ذرا سی بھی بھول چوک ہو گئی تو دشمن بیدار ہو جائے گا اور روشنی راؤنڈ فائر کر کے وہاں دن کی روشنی کر دے گا اور پھر مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر کرنی شروع کر دے گا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ میرے ساتھی عقل اور ہوش مندی سے کام لیں۔ میں تربیت یافتہ سابق فوجی کمانڈو تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کتنے فاصلے پر رہ کر مجھے راکٹ لانچر فائر کرنا ہے اور یکے بعد دیگرے تین چار ٹینکوں کا نشانہ لے کر گولے فائر کرنے تھے۔ یہ کام کوئی تربیت یافتہ کمانڈو یا زینڈ فوجی ہی کر سکتا تھا۔ میں کمینوں کے بل ریگ رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں مجھے تین ٹینک نظر آئے۔ تینوں ٹینک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے نیچے اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پہلو میری طرف تھے۔ یہ فوجی نقطہ نگاہ سے بڑا اچھا نشانہ تھا۔

ابھی تک میرے کسی ساتھی نے کوئی راکٹ فائر نہیں کیا تھا۔

میرے راکٹ لانچر میں گولہ موجود تھا۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ راکٹ لانچر کندھے پر رکھ کر دو گولے تھیلے میں سے نکل کر میں نے اپنے سامنے رکھ لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ٹینک میدان جنگ کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پہلا ٹینک ہٹ

ہونے کے بعد دوسرے ٹینک کا گولہ مجھ پر فائر نہیں ہوگا۔ مشین گنوں کا فائر آسکا تھا۔ میں نے پہلے ٹینک کا نشانہ لیا اور بسم اللہ پڑھ کر فائر کر دیا۔ گولہ شوں کر کے لاسچر سے نکلا اور تھوڑا سا خم کھا کر سیدھا ٹینک کے پہلو میں جا کر لگا۔

گولہ ٹینک کی سوئی آہنی چلار کو چیر کر اس کے اندر جا کر دھماکے سے پھٹا اور ساتھ ہی ٹینک بھی ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ میں دوسرا راکٹ لوڈ کر چکا تھا ٹینک کے شعلوں نے مجھے دوسرے ٹینک کو دکھا دیا۔ میں نے دوسرے ٹینک پر بھی گولہ فائر کر دیا۔ دوسرا ٹینک بھی پھٹ کر شعلوں میں بدل گیا۔ میں تیسرا ٹینک ہٹ کرنے والا تھا کہ فضا مشین گنوں کے فائر کے دھماکوں سے لرزنے لگی۔ ہر طرف سے مشین گنیں فائر ہو رہی تھیں۔ میں ہیٹ کے بل لیٹ گیا۔ میں راکٹ لاسچر لیٹ کر فائر نہیں کر سکا تھا۔ اس کے لیے گھنٹوں کے بل کھڑے ہونا ضروری تھا۔ اتنے میں دوسری جانب یکے بعد دیگرے تین زبردست دھماکے ہوئے اور تین جگہوں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ رات دن کی طرح روشن ہو گئی۔ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے یا تینوں نے دشمن کے تین ٹینک تباہ کر دیے تھے۔ فوجی جوانوں میں جکڈری عجیب گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو جیج جیج کر کچھ کہہ رہے تھے۔ دو اور زبردست دھماکے ہوئے۔ دشمن کے دو اور ٹینک پھٹ کر شعلے اگل رہے تھے۔ اس کے بعد دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے پیچھے رہنا شروع کر دیا۔ میرا مشن ختم ہو گیا تھا۔ اب مجھے واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنا تھا۔ مشین گنوں کی گولیاں چلتی ہوئی میرے لوہے سے گزر رہی تھیں۔ میں نے خشک ٹالے کی دیوار پر سے اندر چھلانگ لگا دی اور پیچھے کی طرف دوڑ پڑا۔

مجھے پیچھے ہینڈ گرنیڈوں کے دھماکے سنائی دیے۔ شاید یہ ہمارے ساتھیوں کے گرنیڈوں کے دھماکے تھے۔ میں ٹالے کی دیوار کی آڑ لے کر پیچھے کو دوڑتا جا رہا تھا کہ اچانک مارٹر گنوں کا فائر آنے لگا۔ مارٹر گنوں کے گولے اولوں کی طرح جگہ جگہ گر کر پھٹ رہے تھے۔ اڑتے پتھروں اور لوہے کے ٹکڑوں کی چھینیں سنائی دینے لگیں۔ دشمن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور اب وہ ہماری کلینڈو پارٹی کو ہلاک کرنے یا ہمیں گھیرے

میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مارٹر گنوں کے گولے ٹالے میں بھی آنے لگے۔ میں زمین پر ہیٹ کے بل لیٹ گیا۔ راکٹ لاسچر ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ اس میں گولہ لوڈ تھا۔ مارٹر توپوں کے گولے مجھ سے تھوڑے فاصلے پر پھٹ رہے تھے۔ میں نے سراپے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ جب مارٹر گنوں کی ریج ذرا دور ہوئی تو میں اٹھ کر آگے کو دوڑ پڑا۔ میں ٹالے کا کنارہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں ٹالے سے باہر نکل کر ایک طرف دوڑا تو اچانک سامنے سے مشین گن فائر ہوئی۔ میں فوراً "لیٹ گیا۔ گولیاں میرے لوہے سے نکل رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی روشنی راونڈ فائر ہوا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے راکٹ لاسچر سیدھا کیا اور گولہ فائر کر دیا۔ مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے گولہ نشانے پر نہ لگا۔ اچانک میری دائیں اور بائیں جانب سے فوجی دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھے جھج کر لیا۔

میرا راکٹ لاسچر پکڑ کر انہوں نے دور پیسٹک دیا اور مجھے گالیاں دیتے گھینے ہوئے فوجی گاڑی کے پاس لے آئے۔ میں بھی بھارتی فوجی پوزیشنیں لیے بیٹھے تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔

"بھارتی ایک کشمیری کلینڈو پکڑ لیا ہے۔"

بھارتی۔ بھارتی۔ بھارتی۔ بھارتی۔

"دوسروں کو بھی پکڑو جا لگی۔"

بھارتی۔ بھارتی۔ میری پسلیوں میں زور سے ٹھٹھا مارا اور گلے دے کر کہا۔

"کلن ہیں تمہارے دوسرے ساتھی؟"

میں خاموش رہا۔ انہوں نے مجھے بے تحاشا پینا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میرے ساتھ اس وقت تک یہی وحشیانہ سلوک ہوتا رہے گا جب تک میں مر نہیں جاتا یا فرار نہیں ہو جاتا۔ یہ جان کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بقی ساتھی نہیں پکڑے گئے۔ مجھے فوجی گاڑی میں ڈال کر میرے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ فوجی گاڑی تیزی سے کسی طرف روانہ ہو گئی۔ میری ایک آنکھ بری طرح درد کر رہی تھی۔ وہ سوچ بھی گئی

تھی۔ پیلوں میں بھی ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ گاڑی میں چھ سلت ڈوگرے فوجی بیٹھے تھے جنہوں نے مجھے اپنے پاؤں میں ڈال رکھا تھا۔

مجھے کسی دوسرے فوجی کیپ کے کوارٹر گاڑی میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ کوارٹر گاڑی میں جی جی بل رہی تھی۔ میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔ ایک ڈوگرہ فوجی انس آ گیا۔ اس نے پہلے تو مجھے خوب مارا پٹا پھر گالیاں دے کر پوچھا۔

”تم کشمیری نہیں لگتے۔ تم پاکستانی کمانڈو ہو۔ بتاؤ تمہارا ہائیڈ آؤٹ کمال ہے۔ تمہارے بقی ساتھی کمال روپوش ہیں؟“

میں نے کہا۔

”میں سولین رضا کار ہوں۔ پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔“

مجھے کوارٹر گاڑی میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ میرے سارے کپڑے اترا دیے۔ دو فوجی بید کی چھڑیوں سے مجھے بے دردی سے پیٹنے لگے۔ جب مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تو مجھے اتار دیا گیا۔ ایک فوجی نے میرے اوپر میرے کپڑے پھینک کر کہا۔

”چلو انیس پن لو۔“

میں ٹھنڈے فرش پر پڑے پڑے آہستہ آہستہ کپڑے پہننے لگا۔ بھارتی فوجی انس نے ایک فوجی سے کہا۔

”اس کو فوراً جیلنگھریٹ کے سپیشل سیل میں پہنچاؤ۔ وہاں اس کا باپ بھی سب

کچھ بتا دے گا“ اٹھا اسے۔“

مجھے تھمیت کر کوارٹر گاڑی سے نکالا گیا۔ باہر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی جو چاروں طرف سے بند تھی۔ مجھے اس میں پھینک کر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا گیا۔ دو مسلح فوجی میرے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے اور فوجی گاڑی چل پڑی۔ جیلنگھریٹ کا سپیشل سیل ضرور کوئی خطرناک مارچر سیل تھا جہاں یہ لوگ مجھے لے جا رہے تھے۔ میں اپنی کلیا پلٹ کی دعا مانگنے لگا۔ کاش میں انسان سے سلت بن سکتا۔ صرف یہی ایک صورت میرے بچنے کی تھی۔ مگر میری دعا قبول نہ ہوئی

اور میں اپنے انسانی وجود میں ہی رہا۔ فوجی گاڑی ساری رات چلتی رہی۔ راستے میں کسی جگہ گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔ گاڑی چھاڑی راستوں سے گزر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر دن کی سپیدی پھیلنے لگی تو میں سمجھ گیا کہ صبح ہو گئی ہے۔ دوپہر کے وقت فوجی گاڑی میدانِ علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ ایک جگہ رک کر فوجیوں نے ہتھ دغیرہ کیا۔ مجھے پانی بھی نہ پوچھا گیا۔ گاڑی آگے چل پڑی۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ رات کے وقت فوجی گاڑی کسی بڑے شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ باہر سے دوسری گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو فوجی میری نگرانی کے لیے اندر بیٹھے تھے ان کی ہاتھوں سے معلوم ہوا کہ جیلنگھریٹ آ گیا ہے۔

فوجی گاڑی شہر کے مختلف بازاروں اور سڑکوں پر سے گزرتی ایک علاقے میں آگئی جہاں ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ میں باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ مجھے کھینچ کر باہر نکل گیا۔ یہ کوئی فوجی چھاؤنی لگتی تھی۔ مجھے ایک چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد کھانے کو ہاسی روٹی اور پانی دیا گیا۔ خدا کا شکر ادا کر کے کھا گیا۔ دن چڑھا تو وہی سری نگر والا فوجی میجر آ گیا۔ یہ ڈوگرہ تھا۔ اس کا پنجابی بولنے کا انداز ڈوگرہوں والا تھا۔ تشدد اور پوچھ گچھ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ تین دن اور تین راتیں مجھ پر تشدد کے نئے نئے لوازار آزمائے گئے۔ بجلی کی کرسی پر بٹھا کر اس وقت تک جھکے دیئے گئے جب تک کہ میں بے ہوش نہیں ہو گیا۔ تین دن کے بعد مجھے کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ دن میں ایک بار کھانے کو تھوڑا بہت دے دیا جاتا۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ دو روز تک مجھ پر کوئی تشدد نہ کیا گیا۔ میرے جسم کی اندرونی چونٹیں کچھ کچھ ٹھیک ہونے لگی تھیں کہ مجھے کوٹھڑی سے نکل کر ایک اور مارچر سیل میں لے گئے۔ بھارتی میجر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ شریچکر پر اپریشن کی مختلف چھریاں اور قینچیاں پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ آج شیلڈ میری زندگی کی آخری رات ہو۔ بھارتی میجر کے ساتھ دو حوالدار بھی تھے۔ مجھے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ بھارتی میجر کہنے لگا۔

”میں تمہیں ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب نہ دئے تو تمہیں اسی کوٹھڑی میں شوٹ کر کے تسماری لاش باہر گندے ٹالے میں پھینک دی جائے گی۔“

پھر اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔

”اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں پورے پندرہ منٹ بعد دوبارہ آؤں گا اتنی دیر میں تم سوچ سمجھ لو۔“

اتنا کہہ کر بھارتی میجر دونوں فوجیوں کے صحرانہ باہر نکل گیا۔ کوٹھڑی کے دروازے کو باہر سے تھما لگانے کی آواز آئی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میری زندگی صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ مجھ سے میجر نے جو پوچھنا تھا وہ میں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا اور اس ڈوگرہ میجر کے تیرہ بتا رہے تھے کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اس سے پہلے کئی ایک واقعات ہوئے تھے کہ بھارتی فوجی کشمیری مجاہدوں کو پکڑ کر لے گئے ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ جب انہوں نے زبان نہ کھولی اور اپنے ساتھی حریت پسندوں کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو انہیں وحشیانہ لڑتیتیں دے کر شہید کر دیا۔

میں نے اسی حالت میں اندازے سے قبلہ رو ہو کر اپنا سر خدا کے حضور سجدے میں ڈال دیا اور خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ سر اٹھا کر چست کی طرف دیکھا اور جیلہ کی شکل سامنے آگئی۔ میں نے اس سے بھی کہا کہ میری وجہ سے اسے جو تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں اور میری موت کے بعد آگے اٹھانی پڑیں گی اس کے لیے وہ مجھے معاف کر دے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کوٹھڑی میں بلب روشن تھا اچانک مجھے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالے سیاہ رنگ کا ایک بچھو دروازے کے سوراخ میں سے داخل ہو کر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف کو جا رہا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا خدا نے میری دعا قبول فرمائی ہو۔

سٹپ کے زہر سے میری کلیا پلٹ جاتی تھی اور میں انسان سے سٹپ کے روپ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ بچھو کے زہر کا مجھے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن بچھو اور سٹپ کے زہر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا اس کا زہر بھی میری کلیا پلٹ دے اور مجھے آنے والے عذاب سے نجات مل جائے۔ اس وقت دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ یہ ڈوبتے کوٹھنے کا سارا تھا۔ میں نے لپک کر بچھو کو پکڑ لیا۔ بچھو نے فوراً ”میرے ہاتھ پر ڈس دیا۔ میرے جسم میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ بچھو میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔

مجھے جھٹکا سا لگ گیا۔ درد کی تکلیف کو بھول گیا۔ دل میں خوشی کی لہری دوڑ گئی۔ کبھی میں ان جھٹکوں سے گھبرا جاتا تھا۔ اب یہ جھٹکا جیسے میرے لیے نئی زندگی کا پیام لایا تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ تیسرے جھٹکے کے ساتھ ہی میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ زمین کی کشش میرے لیے ختم ہو رہی تھی۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمکی اور دوسرے لمحے میں نے اپنے آپ کو ٹیالے رنگ کے چھوٹے سے سٹپ کے روپ میں فرش پر کھڑی مارے بیٹھے دیکھا۔ مجھ پر اس وقت مسرت و انتہا کی جو کیفیت طاری تھی میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ میرے پاس اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں سٹپ کے جسم میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن انسانی ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ مجھے باہر فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے کونے میں جا کر چھپ گیا۔ دروازہ کھلا اور وہی ڈوگرہ بھارتی میجر دونوں فوجیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ جب مجھے نہ پایا تو ششدر سا ہو کر رہ گیا۔

”وہ کہاں گیا؟“

دونوں فوجی بھی حیران ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوٹھڑی میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بھارتی میجر نے پیچ کر کہا۔

”وہ فرار ہو گیا ہے اسے پکڑو۔“

دونوں فوجی دوڑ کر کوٹھڑی سے نکل گئے۔ لیکن میں بھارتی میجر کو باہر نکلنے کا موقع

نہیں رہتا چاہتا تھا اور میں نے اسے بالکل موقع نہ دیا۔ جیسے ہی وہ مجھے دہلی زبان میں گالیاں دیتا دروازے کی طرف بڑھتا میں پیچھے سے اچھل کر اس کی گردن پر آگیا اور اس کی شہ رگ پر ڈس دیا۔ اس کی شہ رگ کو میں نے پہلے ہی سے اپنا ٹارگٹ بنالیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میرا زہر کسی کی شہ رگ میں داخل ہو جائے اور پھر وہ زندہ حالت میں کھڑا رہے۔ بھارتی مجر جس نے درندہ بن کر مجھے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا دھڑام سے گر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ اٹھنے کے لیے کراہے۔ میں کھلے دروازے میں سے رینگ کر باہر نکل گیا۔ باہر شور مچ گیا تھا۔ فوجی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دو فوجی جیپیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے گیت کی طرف جا رہی تھیں۔ میں اس فوجی چھوٹی یا کمپ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔ بھارتی مجر نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک سوا گیارہ بجے واپس آئے گا اور وہ اتنے بجے ہی واپس آیا ہو گا۔ مگر اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے کسی بھارتی فوجی یا بھارتی پولیس یا انٹیلی جینس کی پروا نہیں تھی۔ بس خدا سے ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے ابھی سٹپ کے روپ میں ہی رکھے۔ میں فٹ پاتھ کی دوسری طرف درختوں کے نیچے سے ہو کر رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ جلدھر چھوٹی کے سوشل ٹارچر سیل سے نکلے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایک بار جیلہ اپنی پیاری بیوی سے ملنے پاکستان ضرور جاؤں گا۔ آخر میں اس کا خلود تھا اور اس کے مجھ پر بھی کچھ حقوق تھے جن کو میں نے ایک طویل مدت سے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی اس وقت مجھے اپنی بیوی جیلہ کی محبت اور خبر گیری کی ضرورت تھی تاکہ میں کچھ وقت اس کے پاس گزار کر تازہ دم اور پوری طرح سے صحت مند ہو کر واپس کشمیر کے محاذ پر پہنچ جاؤں۔ انسانی شکل میں ہوتا تو مجھے کئی طرح کے خوف لاحق ہوتے۔ قدم قدم پر پکڑے جانے کا ڈر ہوتا۔ خاص طور پر جبکہ میں جلدھر چھوٹی کی فوجی جیل سے فرار ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ نہ جانے وہیں کتنے بھارتی فوجی افسروں کا کورٹ مارشل ہونے والا تھا۔ فٹری اور پولیس کی انٹیلی جینس اور فٹری پولیس نے سارے

علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہو گا۔ مگر میں سانپ کے روپ میں تھا۔ اس روپ میں سوائے اس کے اور کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کہیں میں کسی گاڑی کے نیچے آ کر نہ پکلا جاؤں یا مجھے دیکھ کر لوگ لافٹیاں اور پتھر مار کر ہلاک نہ کر دیں۔ اس کا میرے پاس ایک ہی علاج تھا کہ میں امرتسر کے بارڈر تک صرف رات کو سفر کروں۔ دن کی روشنی میں کسی کھیت میں چھپ کر بیٹھا رہوں۔

جلدھر امرتسر کے ایریا میں میں دو تین بار آچکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جلدھر شر امرتسر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور امرتسر سے آگے واگہ بارڈر زیادہ دور نہیں ہے۔ جلدھر سے امرتسر تک کے چالیس میل ایک سٹپ کے لیے رینگ کر طے کرنا بہت مشکل کام تھا۔ میں نے اس کا ایک حل ذہن میں سوچ لیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا رخ امرتسر کی طرف ہے یا دہلی کی طرف ہے۔ رات کے وقت شمال جنوب کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ دن کا وقت ہوتا تو سورج کو دیکھ کر میں مشرق اور مغرب کی سمتوں کا تعین کر سکتا تھا۔ جلدھر چھوٹی کے ٹارچر سیل سے نکلنے کے بعد جس طرف میرا منہ اٹھا میں اسی طرف چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر زیادہ گاڑیاں وغیرہ نہیں گزر رہی تھیں۔ آس پاس کوٹھیوں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ویسے میں سٹپ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ میں رینگتے رینگتے کانی دور نکل آیا۔ میں تیزی سے رینگ رہا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انڈیا کی سرحد کے اندر ہی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں۔ یہ بات میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ میں اپنے سانپ ہونے کی حیثیت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے جتنی جلدی ہو سکے انڈیا کا بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ سڑک ایک بار رونق علاقے میں داخل ہو گئی۔

یہاں سڑک کشنہ تھی۔ درمیان میں گرین بیلٹ تھی جس کے اوپر مرکزی لائنس کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ لائنیں روشن تھیں۔ میں کنارے کنارے چھپ کر رینگ رہا تھا۔ ایک جگہ سینما ہاؤس کی شاندار عمارت کے باہر کسی انڈین فلم کے بڑے بڑے

رنگین بورڈ لگے تھے۔ اندر رات کا آخری شو چل رہا تھا۔ اس وقت مجھے امرتسر جانے والی کوئی بس یا لاری بھی نہیں مل سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا اس وقت دلی یا کلکتے سے کوئی ٹرین آرہی ہو جو امرتسر جاتی ہو۔ میں اس کی چھت پر بیٹھ کر امرتسر پہنچ سکتا تھا۔ کیونکہ ریل گاڑیاں رات کو بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ اب مجھے ریلوے سٹیشن کی تلاش تھی۔ کسی سے میں یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔ مجھے خود ہی اندازے سے معلوم کرنا تھا اور ریلوے سٹیشن کی سب سے بڑی نشانی سگنل کی لال سبز جی ہی ہو سکتی تھی۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا رخ دلی کی طرف نہیں ہے اور میں امرتسر کی طرف ہی جا رہا ہوں۔

میں کشادہ سڑک پر سے گزر کر ایک گنجان سڑک پر آ گیا میں آتے ہی مجھے ریلوے انجن کی سٹی کی آواز سنائی دی۔ میرے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میں اس آواز کی سمت ہو گیا۔ ریلوے انجن کی آواز دو تین بار آئی تھی۔ اس نے مجھے سٹیشن کا راستہ دکھا دیا۔ سڑک چھوڑ کر میں کھیتوں میں گھس گیا۔ ان کھیتوں میں آتے ہی مجھے کچھ فاصلے پر سگنل کی کئی ہری اور لال لال بتیاں دکھائی دیں۔ میں ان کی طرف جتنی تیز دیکھ سکتا تھا ریٹنگ لگا۔ آخر میں ریلوے یارڈ کی بنزیوں میں سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم کی جہاں ڈھلان شروع ہوتی تھی وہاں آ کر ایک طرف چھپ گیا۔ دو تین آدمی قلی کے سر پر سلان رکھواتے آ رہے تھے۔ جب وہ چلے گئے اور پلیٹ فارم خالی ہو گیا تو میں پلیٹ فارم کی ڈھلان چڑھ گیا۔ میں ایک بورڈ لگا تھا جس پر انگریزی اور ہندی میں جانبدھر کینٹ لکھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم پر آگے جا کر کچھ مسافر اپنے اپنے سلان کے پاس بیٹھے تھے۔ قلی بھی چل پھر رہے تھے۔ دو چار پولیس کے سکھ سپاہی بھی نظر آئے مگر مجھے ان سے متعلق رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ امرتسر جانے والی گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم پر آرہی ہے۔

یہ مسئلہ ایک قلی نے حل کر دیا۔ میں پلیٹ فارم میں ایک طرف چھپ کر بیٹھا تھا کہ کسی نے قلی سے امرتسر جانے والی ٹرین کے بارے میں پوچھا۔ سکھ قلی نے اسے

بتایا کہ جتنا ایکسپریس تھوڑی دیر میں آنے والی ہے وہ امرتسر جائے گی۔ جس مسافر نے قلی سے ٹرین کے بارے میں پوچھا تھا میں نے اس پر نظریں جمادیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ اس پلیٹ فارم پر جائے گا جہاں امرتسر جانے والی جتنا ایکسپریس آرہی ہے۔ مسافر وہیں پلیٹ فارم پر اپنے سلان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ امرتسر جانے والی ٹرین اسی پلیٹ فارم پر آرہی تھی۔

ٹرین کوئی ایک گھنٹے کے بعد آئی۔ میں ٹرین کی دوسری طرف ریلوے لائن میں اتر گیا۔ جب ٹرین پوری طرح سے رک گئی تو اس کے مینیوں پر ریٹنگ ہوا آخری ڈبے کی چھت پر جا کر لیٹ گیا۔ میں ڈبے کی چھت سے بالکل چٹ گیا تھا تاکہ پلیٹ فارم کی روشنی میں مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ ٹرین جانبدھر چھاؤنی میں تھوڑی دیر ہی ٹھہری اور چل پڑی۔ اس کے بعد جانبدھر شہر کے سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے رکی اور امرتسر کی طرف فرائے بھرنے لگی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو گا جب ٹرین جانبدھر شہر سے روانہ ہوئی۔ راستے میں وہ کسی جگہ بھی نہ رکی اور کوئی کھنٹے سوا گھنٹے کے سفر کے بعد امرتسر پہنچ گئی۔

یہ ٹرین اس کے آگے نہیں جاتی تھی۔

میں مسافروں کی آنکھ پجا کر ٹرین سے اتر گیا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ واگہ بارڈر کی طرف ریٹنگ شروع کر دیا۔ رات کا وقت تھا چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے علم تھا کہ یہ ریلوے لائن واگہ تک جاتی ہے جو پاکستان میں ہے۔ میں کچھ دور جا کر ریلوے ٹریک سے اتر کر کھیتوں میں آ گیا۔ میں کلنی دور تک ریٹنگ چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ بارڈر کی طرف جانے والی سڑک پر چلا جاؤں۔ وہاں کسی نہ کسی ٹرک یا گاڑی پر موقع دیکھ کر چڑھ جاؤں گا اور بارڈر پر پہنچ جاؤں گا۔ واگہ جانیوالی سڑک کی روشنیوں میری بائیں جانب نظر آرہی تھیں۔ میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر سے وقفے وقفے کے بعد ٹرک گزر رہے تھے۔ ان میں فوجی ٹرک زیادہ تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے میں نے ایک جیپ کو رکتے دیکھا۔ وہاں

ایک کھوکھا تھا۔ جیب کا رخ داہمہ بارڈر کی طرف تھا۔ میں تیزی سے جیب کے پاس آ گیا۔ جیب کا ڈرائیور کھوکھے پر سے سگریٹ خرید رہا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہو کر جیب کی چھت پر چڑھ کر اس سے چٹ گیا۔ ڈرائیور نے سگریٹ کا پیکٹ لے کر جیب میں ڈالا اور جیب میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیب سٹارٹ کی اور وہ بارڈر کی طرف چل پڑی۔ جیب سڑک پر دیر تک چلتی رہی۔ راستے میں بائیں جانب ایک بہت بڑا سکھوں کا گوردوارہ بھی آیا۔ کچھ کارخانوں کی روشنیوں بھی نظر آئیں۔ ایک جگہ سڑک کی دونوں جانب دکانیں تھیں جو بند تھیں۔ شاید یہ اناری کا قصبہ تھا۔ اس کے بعد بارڈر کی انڈین کسٹم چیک پوسٹ آگئی۔ جیب یہاں ایک طرف رک گئی۔ میں نے جیب کی چھت پر سے جائزہ لیا۔ کچھ فاصلے پر بارڈر کا گیٹ تھا جہاں انڈیا کا جھنڈا لگا تھا اور گاڑی کھڑے تھے۔

کسٹم آفس میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک سکھ باہر نکل کر سامنے کسی کو آواز دے کر بلا رہا تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر تیز روشنیوں میں مجھے پاکستان کا پرچم لراتا نظر آیا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ یہ میرے پیارے وطن پاکستان کا پرچم تھا جس کے سائے میں ہم لوگ امن اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جہاں پہنچنے کے بعد مجھے کسی سی آئی ڈی، کسی ملٹری انٹیلی جینس کا ڈر خوف نہیں تھا۔ میں جیب کی چھت سے اتر آیا اور کسٹم آفس کی پھیلی دیوار کی طرف سے نکل کر پاکستان کی سمت چل پڑا۔ وہاں کانٹے دار تاروں والی دیوار بنی ہوئی تھی۔ میں اس کے نیچے سے گزر کر پاکستان کی سر زمین پر پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی مجھے جیل کے جسم کی خوشبو محسوس ہوئی۔ یہ میرے وطن، میری عزت، میری آبرو کی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر پاکستان کی مٹی کو چوم لیا اور دیر تک پاکستان کی مٹی میں اپنا سر ڈالے رکھا۔ اس کے بعد لاہور جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر کھیتوں میں سے لاہور کی طرف چل پڑا۔

میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے پیارے وطن میں انسانی روپ میں داخل ہونے کی بجائے ایک سانپ کی شکل میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ بات مجھے کسی حالت

میں بھی گوارا نہیں تھی۔ میں اس منحوس قصبے اور قصبے کو توہمت اور دیوی دیوتوں کے جھوٹے بتوں کے دہس بھارت کی سر زمین پر ہی چھوڑ آنا چاہتا تھا لیکن یہ بات میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میں جیل کے گھر سانپ کی شکل میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں اس عذاب سے نجات حاصل کر کے رہوں گا۔ اپنے وطن کی ہوا اور مٹی نے میرے اندر ایک نئی طاقت، ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں کفر کی بڑی سے بڑی طاقت کو پاش پاش کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے خدا اور رسول پاک کو یاد کیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا اور میرا رخ اپنے آپ ایک طرف ہو گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ رخ شر کی طرف کروں لیکن کوئی طاقت مجھے سڑک سے ہٹا کر ایک طرف لیے جا رہی تھی۔

کچھ دور ریگتے رہنے کے بعد مجھے ایک مسجد دکھائی دی جس کے گنبد اور مینار سبز روشنی کے نور میں جگمگا رہے تھے۔ میں بے اختیار ہو کر مسجد کی طرف بڑھلا۔ مسجد خلل تھی۔ ابھی صبح کی اذان میں کچھ دیر تھی۔ میں مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر اس جگہ آیا جہاں نمازی اپنی جوتیاں اتار کر رکھتے تھے۔ آگے مسجد کا اونچا مین شروع ہوتا تھا۔ میں جوتیوں والی جگہ پر ہی بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر مسجد کی محراب کی طرف جھکا دیا۔ میرے دل میں کلمہ پاک جاری ہو گیا۔ میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا اور میرا انسانی احساس مجھے محسوس کرا رہا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنا سر عازبوں کی جوتیوں والی جگہ پر لگا دیا اور خدا سے گڑ گڑا کر دعا مانگی کہ اے اللہ پاک! میرے گناہ معاف فرما دے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلا۔ اس کے بعد مجھ پر غنودگی کی حالت طاری ہو گئی۔ خدا جانے میں جاگ رہا تھا کہ سو گیا تھا جس عالم میں تھا اس عالم کی مجھے خبر کوئی نہیں تھی۔ اچانک مجھے ایک جھٹکے نے جگا دیا۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو میں سانپ نہیں تھا بلکہ کرم داد تھا۔ اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ گیا تھا۔

یقین کریں اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہو گئی کہ میں مسجد کے صحن میں سر

رکھ کر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگا۔ میں دیر تک روتا رہا۔ آنسو رکنے کا ہم نہیں لیتے تھے۔ جب ذرا آنسو تھے تو میں جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہوا۔ وضو کیا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل شکرانے کے ادا کیے۔ ہر بار جب میرا سر سجدے میں جاتا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور میں ہلک ہلک کر رونے لگتا۔ اللہ تعالیٰ سے بار بار اپنے گناہوں کی معافی مانگتا۔ رونے سے میرے نفل صحیح طرح سے ادا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ وضو کیا اور اپنے آپ پر پورا ضبط کر کے ایک بار پھر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور اگلے پاؤں مسجد سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پاکستان کے نورانی آسمان پر ستاروں کے سفید اور نیلے پھول ہیرے جواہرات کی طرح جگمگا رہے تھے۔ پچھلے پہر کی خوشگوار ہوا چل رہی تھی جس میں میرے وطن پاک کی مٹی اور اس کے کھیتوں، پھلوں اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور واہمہ سے لاہور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر آگیا۔ میں نے جیکٹ کی جیبوں کو نڈلا۔ میری جیب میں کچھ نوٹ پڑے تھے۔ میں نے باہر نکل کر کھجے کی روشنی میں دیکھا۔ وہ پچاس پچاس کے پاکستانی کرنسی کے دو نوٹ تھے۔ یا خدا! یہ نوٹ کہاں سے آ گئے؟

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مجھے اتنے ہی پیسوں کی ضرورت تھی۔ اتنے پیسوں میں میں جیل کے پاس جہلم پہنچ سکتا تھا اور اس کے لیے اور اس کے گھر والوں کے لیے تھوڑی سی مصالحت بھی لے جا سکتا تھا۔ واہمہ کے ایک بس سٹاپ پر میں نے ایک بس کھڑی دیکھی۔ بس میں روشنی نہیں تھی۔ اس کا ڈرائیور چھت پر سے سگریٹ پیتا اتر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ بس لاہور جائے گی؟ اس نے نیند بھری آواز میں جواب دیا۔

”ایک گھنٹے بعد جائے گی۔“

میں ڈرائیور کی اجازت سے بس کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے ہی میں اوجھنے لگا اور پھر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو باہر میرے پیارے وطن کے کھیتوں میں طلوع ہوتے ہوئے

سورج کی سنہری روشنی کا نور پھیل رہا تھا اور کند کڑ مجھ سے نکلتے کے پیسے طلب کر رہا تھا۔ میں نے نکٹ لے لیا۔ لاہور شہر کے مکانوں، بازاروں، کھیتوں اور مسجدوں اور لوگوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر اپنے گھر، اپنے بھائی بہنوں کے پاس آ گیا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہر ایک کو سلام کر کے اس کے گلے لگ کر لوں۔ بس نے مجھے سٹیشن کے پاس اتار دیا۔ لاہور سٹیشن سے میں ایک گاڑی میں سوار ہو کر جہلم پہنچ گیا۔ ایک دکان سے کچھ پھل خریدے اور اپنی بیوی جیل کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میرا دل خوشی سے جیسے اچھل رہا تھا۔ جیل کے گھر والے مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران رہ گئے۔ پھر مجھ سے پٹ گئے۔ جیل دوسرے کمرے سے دوڑ کر آئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

یہ خوشی کے آنسو تھے۔

